کہے فقیر ... سلسلہ

فقیر رنگ

دل کی گہرائیوں سے نکلی روحانی گفتگو

سرفراز اے شاہ

FREE DVD INSIDE

☆ ...... Total Submission میں داخل ہوتے ہی انسان بندگی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے اور جیسے ہی وہ بندگی اختیار کرتا ہے، رب کو پالیتا ہے۔

☆ ...... تقابلِ ادیان کے وقت تنقیدی رویہ اپنانے کے بجائے ہم بہترین ذاتی مثال کے ذریعے یہ ثابت کر دکھائیں کہ اسلام ہی سب مذاہب میں بہترین ہے۔

☆ ...... سب سے پہلی ڈھال ایمان، دوسری اخلاص، تیسری فرائض، چوتھی سنت اور پانچویں مستحب اعمال کی ہے۔

☆ ...... جس شخص نے آپ ﷺ کے طرزِ حیات کی نقل کرلی، خواہ جزوی طور پر ہی کی، وہ رب کے قریب ہوگیا اور فلاح پاگیا۔

☆ ...... دعا مشکل حالات میں انسان کو پُر امید رکھتی ہے اور اسی دعا کے سہارے وہ اچھے وقت کا انتظار کرلیتا ہے۔

☆ ...... ہر وہ چیز جس کو انسان ذہنی یا جسمانی محنت کے بعد جائز طریقے سے حاصل کرے، رزقِ حلال ہے۔

☆ ...... اپنی خامیاں دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب ہم کسی اچھے شخص سے ملیں تو یہ سوچیں کہ اس میں کون سی ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے لوگ اُسے سراہتے اور اُس کی عزت کرتے ہیں۔

☆ ...... رب تعالیٰ کے نزدیک دنیاوی مال و زر کی کوئی وقعت نہیں۔ چونکہ وہ دنیا کو حقارت سے دیکھتا ہے اس لیے وہ اپنے پیغمبروں کو دنیا عطا نہیں فرماتا۔

☆ ...... ولی اللہ شکل و صورت کا کیسا ہی گیا گزرا انسان کیوں نہ ہو اس سے مل کر آپ کو ایک عجب، نامعلوم سی کشش محسوس ہوگی۔

سرفراز اے شاہ

www.jbdpress.com

ناشر: فواز نیاز

اشاعت پنجم

قیمت:- /599 روپے

For suggestions and complaints please contact
info@jbdpress.com

جہانگیر بکس
257۔ ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-37077660

پرنٹرز: زاہد بشیر پرنٹرز بند روڈ، لاہور

ڈسٹری بیوشن

لاہور: اردو بازار، فون: 042-37220879
لاہور: جہانگیر سنز، جوہر ٹاؤن، فون: 3-042-35290892
لاہور: جہانگیر سنز، گلبرگ، فون: 042-35771000
راولپنڈی: کتاب گھر، اقبال روڈ، نزد کمیٹی چوک، فون: 051-5539609
فیصل آباد: کوتوالی روڈ نزد امین پور بازار، فون: 041-2627568
ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ، فون: 061-4781781
کراچی: اردو بازار، فون: 021-32765086
حیدرآباد: مکان نمبر 194/8 نزد علی مینشن، لجپت روڈ، فون: 022-2780128

انتساب

والدہ محترمہ (مرحومہ) کے نام

نہایت محبت، ادب اور تشکر کے ساتھ

پیش لفظ

میری دوسری کاوش حاضر ہے۔ پہلی کتاب کی طرح یہ کتاب بھی مختلف نشستوں میں ہونے والی گفتگو پر مشتمل ہے۔ آپ کو "کہے فقیر" پڑھ کر اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں فن تحریر و تقریر سے قطعی نابلد ہوں تاہم "جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" کے مصداق میرے دل کی آواز "فقیر رنگ" کی شکل میں پیش خدمت ہے۔ مجھے نہ تو یہ گمان ہے اور نہ ہی دعوئی کہ اس کتاب میں کہی گئی باتیں آپ کی صحبت پر کوئی اچھا اثر مرتب کر پائیں گی۔ تاہم اندھیرے میں ایک شمع جلانے کی کوشش ضرور کی ہے اس اُمید پر کہ شاید اس کے دیکھا دیکھی مختلف جانب سے شمعیں جل اُٹھیں اور مسلم معاشرہ میں اُجالا کا سبب بن جائیں۔

وَمَا تَوفِیْقِی اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم

سرفراز اے شاہ

212 جہانزیب بلاک

علامہ اقبال ٹاؤن......لاہور

محترم سرفراز اے شاہ صاحب سے میری ملاقات چند برس کی بات ہے۔ ''کہے فقیر'' سے ''فقیر رنگ'' تک کے کتابی سفر میں میری التجا اور اصرار کا رنگ بھی شامل ہے۔ شاہ صاحب کی شخصیت ملاقات کرنے والے کو اپنے سحر میں لے لیتی ہے۔ اُن کی صحبت میں انسان خود کو رُوحانی طور پر پُر سکون محسوس کرتا ہے مگر جب شاہ صاحب کسی کو اپنے دوستی کے دائرے میں شامل کر لیتے ہیں تو یہ کیفیت نہیں رہتی۔ میرا ذاتی تجربہ یہی ہے۔ شاہ صاحب کی پہلی تصنیف ''کہے فقیر'' نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر دیئے ہیں۔ صرف دو ماہ میں پانچ ایڈیشنز کی اشاعت اور فروخت کتابی دُنیا کا نیا ریکارڈ ہے جس کے لیے شاہ صاحب اور پبلشر دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میں شاہ صاحب کے کشف و کرامات کی بجائے اُن کی انسان دوستی اور خدا شناسی سے متاثر ہوا۔ شاہ صاحب چونکہ رب کائنات پر یقین کامل رکھتے ہیں لہٰذا اُن کی رُوحانی تعلیم کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ انسان اپنے رب پر مکمل اعتماد کرنے لگیں اور براہ راست اُسی سے مدد طلب کریں۔ مفکر اسلام علامہ محمد اقبال نے ''کشمیری گزٹ'' کے ایڈیٹر محمد دین فوق کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:

''پیر یا مرشد کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان صحیح اور کامل راستہ نہیں دیکھ سکتا۔ رُوحانی فائدہ تو ان بزرگوں سے صرف اُنہی لوگوں کو ہوگا جو اہل دل ہیں۔ جن کے دل میں درد ہے۔ جن کے قلب میں گرمی اور جن کی رُوح میں تڑپ ہے لیکن کم سے کم اخلاقی فائدہ تو ہر مرید حاصل کر سکتا ہے۔ پیر کی صحبت سے (بشرطیکہ پیر دکان داری نہ کرتا ہو) ہر مرید اپنا اخلاق سنوار سکتا ہے اور جس کا اخلاق درست ہے، جس کے افعال ٹھیک ہیں اور جس کے اعمال ''اعمال حسنہ'' کہے جاتے ہیں اُس سے بڑھ کر اور کون بہترین انسان ہو سکتا ہے۔''

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں (اقبال)

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے (اقبال)

محترم سرفراز اے شاہ صاحب نے مایوسی اور بے حسی کے اس دور میں راکھ کے ڈھیر کو انسان اور مسلمان بنانے کے لیے قلمی جہاد کا عزم کیا ہے۔ وہ بروقت ہے اور قابل ستائش ہے۔ خدا کرے شاہ صاحب کی عشق خدا سے منور رُوحانی شمعوں سے پاکستان میں ہر سو اُجالا ہو جائے۔ ''فقیر رنگ'' کے موضوعات مختلف مگر آہنگ اور لہجہ ''کہے فقیر'' کا ہے۔ اس کتاب میں رُوحانی مسائل کے بارے میں دو سو سے زائد سوالات کے جوابات شامل ہیں۔ انشاء اللہ شاہ صاحب کی دوسری تصنیف بھی مقبولیت کا ریکارڈ قائم کرے گی۔ میں شاہ صاحب کا ممنون و مشکور ہوں کہ اُنھوں نے مجھ جیسے عاجز اور گناہ گار انسان کو کتاب کا دیباچہ رقم کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔

قیوم نظامی

لاہور

12 اکتوبر 2011ء

اظہار تشکر

میں اُن تمام کالم نگار مہربانوں کا تہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے میری پہلی کتاب ''کہے فقیر'' پر اپنی ماہرانہ آراء کا اظہار کیا جو میرے لیے رہنمائی کا باعث بنیں۔ اللہ تعالیٰ اُن تمام حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

سرفراز اے شاہ

فہرست

نشست نمبر 1

رب پر مان

نشست نمبر 2

فقیرانہ طریقہ تبلیغ

نشست نمبر 3

رحم ہی کیوں

نشست نمبر 4

حروف مقطعات کے اسرار اور قلندرانہ طرز حیات

نشست نمبر 5

جس کا رب

نشست نمبر 6

مجاہدہ کی اہمیت

نشست نمبر 7

عبادت میں ذوق و شوق کے ثمرات

نشست نمبر 8

اخلاص، جنون، ادب

نشست نمبر 9

دعا کس طرح مانگی جائے!

نشست نمبر 10

پیر مرید اور قلب کا رشتہ

نشست نمبر 11

علم سے عقل تک

نشست نمبر 12

قربِ الٰہی

نشست نمبر 13

تقدیر اور تدبیر

نشست نمبر 14

بعد از خدا بزرگ توئی

نشست نمبر 15

منزلیں علم باطنی کی

نشست نمبر 16

نور، محبت، توجہ

نشست نمبر 17

رب سے وابستگی

نشست نمبر 18

علم کے موتی

نشست نمبر 19

قناعت، توکل، تقویٰ اور روزہ.... روحانیت کی نظر میں

نشست نمبر 20

لاء آف نیچر اور ڈیزائن آف نیچر

نشست نمبر 21

پاکیزگیٔ خیال، حصولِ کشف کی شرطِ اول

نشست نمبر 22

شعور و لاشعور کے انسانی رویوں پر اثرات

نشست نمبر 23

جسمِ انسانی پر رُوحانی بیماریوں کے اثرات

نشست نمبر 24

مرشد سے اکتسابِ فیض کا طریقہ اور اولیاء اللہ کی پہچان

نشست نمبر 25

عامل اور فقیر

نشست نمبر 26

احکاماتِ شرعیہ اور فقر کے تقاضے

نشست نمبر 27

اہلِ فقر کی چند خاص عبادات

نشست نمبر 28

آدابِ فقر

نشست نمبر 29

علم

نشست نمبر 30

ولایت کے حصول کا آسان طریقہ

نشست نمبر 31

دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے اور قرض کی ادائیگی کی دعائیں

نشست نمبر 32

علمِ لدنی

نشست نمبر 33

راہِ فقر

نشست نمبر 34

دُعا کی قبولیت میں لاشعور کا کردار

نشست نمبر 35

الہامی مذاہب میں دُعا اور دُعا میں مان کی اہمیت

نشست نمبر 36

دعا کی قبولیت میں توکل کی اہمیت

نشست نمبر 37

عرب ممالک میں تبدیلی کا رجحان / بسم اللہ کے "ب" کی وضاحت

نشست نمبر 38

حق کی حضوری

نشست نمبر 39

یکسوئی اور روزہ

نشست نمبر 40

روحانیت اور دل کی آواز

رب پر مان

سوال: رب پر مان سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہ 1970ء کی دہائی کے آخری ایام کا قصہ ہے۔ ایک عمر رسیدہ صاحب جنھوں نے ساری زندگی تنگ دستی اور کم وسائل کے ساتھ گزاری تھی اُن کے جوان بیٹے کو مڈل ایسٹ میں پُرکشش تنخواہ پر ملازمت مل گئی اور وہ ماہانہ اپنے والد صاحب کو پانچ ہزار روپے بھجوانے لگا۔ اُن عمر رسیدہ صاحب نے کشائش کے باوجود اپنے اخراجات کو محدود رکھا اور اپنے بیٹے کی طرف سے موصول ہونے والی رقم سے خدمت خلق کرنے لگے۔ ایک بار لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ بزرگ خاصے پریشان نظر آتے ہیں لیکن کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرتے۔ روز مسجد میں نماز سے فارغ ہو کر وہ لوگوں کے جانے کا انتظار کرتے اور مسجد کے ہال (Hall) میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتے۔ ایک روز لوگوں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہال کے دروازے کی درز سے اندر جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بزرگ قبلہ رُو محراب میں کھڑے ہو کر دیوار پر زور سے ہاتھ مار کر آواز بلند کہہ رہے ہیں۔

"اوئے ربا! تو دیکھ دا ئیں...... تینوں پتا نئیں کہ میں اوس بچی دے ویاہ دا وعدہ کیتا ہویا
اے۔ اوہدا ویاہ تے سر تے آ گیا...... پیسے بھیج...... میں اوہنوں دینے آں۔"

بعد میں پتا چلا کہ اُنھوں نے اپنی بیوہ پڑوسی خاتون کی بیٹی کی شادی کے اخراجات اُٹھانے کی ذمہ داری لی تھی لیکن اِدھر اُنھوں نے ذمہ داری لی اُدھر بیٹے نے پیسے بھیجنا بند کر دیئے۔ اب وہ بزرگ حالات کی ستم ظریفی کی ہوا تو کسی کو لگنے نہ دیتے تھے لیکن روز نماز کے بعد اللہ سے اپنی مشکل بیان کرتے تھے۔

رب سے مانگنے کا یہ انوکھا طریقہ دیکھ کر لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ تیس ہزار روپے اُنھیں دیں گے لیکن یہ نوبت آنے سے پہلے ہی بیٹے کی طرف سے اُنھیں اکٹھی رقم موصول ہو گئی اور یوں اُس بیوہ خاتون کی بیٹی کی شادی سرانجام پائی۔

یہ قصہ سنانے کا مطلب یہ تھا کہ دعا کرنا بہت آسان کام ہے۔ کرنا صرف یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ ہم اپنے رشتہ کو یوں اُستوار کر لیں کہ ہمارے اندر یہ جذبہ، یقین اور ایمان پیدا ہو جائے کہ صرف اور صرف وہی میرا رب ہے۔ وہی میری ضروریات کو پورا کرنے والا ہے۔ وہی مجھے سننے والا ہے۔ وہی مجھے Look after کرنے والا ہے۔ جب یہ یقین بہت پختہ ہو جائے گا تو پھر انسان دادرسی کے لیے دائیں بائیں نہیں دیکھتا بلکہ

57 منزلہ عمارت سے نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے بھی رب ہی سے کہتا ہے "رب! تو میرا خیال رکھنا۔" پھر انسان صرف رب کے پیچھے جاتا ہے۔ جب رب پر اس قدر بھروسا پیدا ہو جاتا ہے تو دل میں رب پر ایک "مان" پیدا ہو جاتا ہے کہ میرا رب تو سب سے بڑا ہے۔ میرا رب تو بے پناہ امیر ہے۔ اُس سے بہتر تو پالنے والا کوئی نہیں۔ جب ایسا رب ہے میرا تو پھر پریشانی کا ہے کی۔ میرا رب اتنا فیاض اور سخی ہے کہ میں اپنے کام تو در کنار دوسروں کے کاموں کے لیے بھی اُسے کہہ سکتا ہوں "یا اللہ! یہ تیرا بندہ ہے۔ تو اس کا کام کر دے۔" اور اللہ سے یہ کہنے کے بعد میرے اندر پختہ یقین ہے کہ یقیناً وہ میری بات سن لے گا۔ پھر انسان مسجد کی محراب پر نہیں تو کم از کم دِل کی مسجد کی محراب پر ہاتھ مار کر ضرور کہہ سکتا ہے "رب! کیا کر رہا ہے۔ مروانا ہے مجھے؟ تو اس بندے کا کام کر دے۔" یہ گستاخی نہیں مان ہے۔ لیکن اگر دِل میں وہ ایمان اور یقین نہ ہوا تو یہ گستاخی ہو جائے گی۔ اگر دِل میں یہ ایمان ہے کہ وہ میرا رب اور میں اُس کا بندہ ہوں تو یہ مان ہے اور رب مان کو بہت پسند کرتا ہے۔ یہ مان بالکل وہی ہے جس کے ساتھ ایک بیٹا اپنے باپ کے پاس جاتا ہے۔ اُس کے دِل میں باپ کا احترام بھی ہے، خوف بھی اور ساتھ یہ فخر بھی کہ میرا باپ میری ہر خواہش اور ضرورت پوری کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ سے جا کر کہتا ہے۔ "ڈیڈ! مجھے پیسے چاہییں۔ میں نے بائیسکل خریدنی ہے۔" اب باپ چاہے خود لنڈے سے سوٹ خرید کر گزارا کرتا ہو لیکن بیٹے کی ضد اور اصرار میں چونکہ ایک مان پوشیدہ ہے تو باپ کم وسائل کے باوجود اُس مان کی لاج رکھتے ہوئے بیٹے کو بائیسکل خرید کر دیتا ہے...... یہی مان لے کر بندہ اپنے رب کے پاس جائے اور دعا کرے "پروردگار! تیرا یہ بندہ میرے پاس اُمید لے کر آیا ہے۔ تو مہربانی فرما اور اس بندے کا کام کر دے تاکہ اس کی اُمید نا اُمیدی میں نہ بدلے اور اس کا دِل نہ ٹوٹے۔"

جب ہم ایسے مان کے ساتھ اپنے یا دوسروں کے لیے دعا کرتے ہیں تو رب تعالیٰ مہربانی فرما دیتا ہے۔

سوال: Mr. know-all کو چت کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: مارکیٹنگ (Marketing) کی ایک تکنیک یہ بھی ہے کہ جب آپ اپنی پراڈکٹ کی تشہیر کے لیے کسی ایسے افسر کے پاس جائیں جس میں انا کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ وہ افسر سمجھتا ہے کہ میں ہر Subject کو سب سے بہتر جانتا ہوں۔ وہ Mr. know-all بنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ آپ کو ہر بات پر ڈانٹ پلا دیتا ہے۔ ایسے آدمی کو چت کرنے کے لیے Marketing میں ایک Method ہوتا ہے کہ آپ اُس کے سامنے ایسی بھاری بھرکم Terminology بولنا شروع کر دیں جس کا دُنیا میں کہیں وجود ہی نہ ہو۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ افسر دِل میں سوچے گا کہ یہ Term تو مجھے بھی نہیں آتی لہٰذا وہ مرعوب ہو کر اپنی کم علمی چھپانے کے لیے آپ سے Agree کر جائے گا۔ یوں آپ اُسے اپنی پراڈکٹ فروخت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

سوال: کیا نور تہ در تہ ہے؟ نورِ نبوت کو کیسے Touch کیا جا سکتا ہے؟

جواب: جی ہاں نور تہ در تہ ہے۔ ایک ہے نورِ نبوت۔ اس نور کو نورِ توحید احاطہ کیے ہوئے ہے۔ نورِ توحید کو احاطہ کیا ہے نورِ توحید حقیقت نے۔ نورِ توحید حقیقت کو احاطہ کیا ہے نور الہدیٰ نے۔ نور الہدیٰ کو احاطہ کیا ہے نور

المرواریدنے اور نورالمروارید کو گھیرا ہوا ہے نورِ القاتے اور یہ اللہ کا نور ہے۔ یوں نورتہ درتہ ہے۔

نورِ نبوت مخصوص ہے صرف انبیاء کرام اور رسولوں کے لیے۔ نورِ نبوت کو نورِ اوّل یا نورِ اولیٰ بھی کہتے ہیں۔

نورِ اولیٰ معروف Term ہے جب کہ نورِ اوّل مجہول Term ہے۔

نورِ ولایت مخصوص ہے اولیائے کرام کے لیے۔ اور نور المتقین مخصوص ہے صرف اور صرف آپ ﷺ کے لیے۔

وحی، اِلقا، الہام، رؤیا، کشف یہ سب نورِ نبوت (نورِ اولیٰ/نورِ اوّل) سے متعلق ہیں اور اِسی نور سے چلتے ہیں۔ جس شخص کی رسائی اس نور تک نہیں اُسے کشف حاصل نہیں ہو پائے گا۔ کشف القبور اور کشف نور القلب کا تعلق بھی اِسی نور سے ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو جو کچھ دکھائے گا اِسی نور سے دکھائے گا۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا تھا کہ بحرِ نورِ القا سے 118 نہریں نکلتی ہیں جو ساری کی ساری علم کی نہریں ہیں۔ ان میں سے چار نہروں کا تعلق عالم الغیب الشہود سے ہے۔ یہ چاروں براہِ راست رب تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب کہ بقیہ 114 نہروں کا تعلق دیگر علوم سے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ 14 حروفِ مقطعات ہیں اور 29 سورتوں کا آغاز ان حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جو اسما سکھائے گئے تھے وہ انہی حروفِ مقطعات میں پوشیدہ ہیں۔

جب ہم Descending Order (ترتیب نزولی) میں نور کی تہوں کی بات کریں گے تو یہ ترتیب اس طرح ہو جائے گی کہ نورِ القا سے نکلا نور المروارید اور اُس سے نکلا نور الہدیٰ۔ نور الہدیٰ سے نکلا نورِ توحید حقیقت۔ نورِ توحید حقیقت سے نکلا نورِ توحید اور نورِ توحید سے نکلا نورِ نبوت۔

رُوحانیت میں نور کو دائروں کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔ درمیان میں نورِ نبوت ہے جس کو نورِ توحید گھیرے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ سب سے بالائی دائرہ نورِ القا کا ہے۔ یہ نورِ القا ہی ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے بحرِ نورِ القا کے اندر جس کا ایک کنارہ مقامِ محمود کو Touch کرتا ہے اور دوسرا کنارہ خط استوا کے پار دکھائی دیتا ہے۔
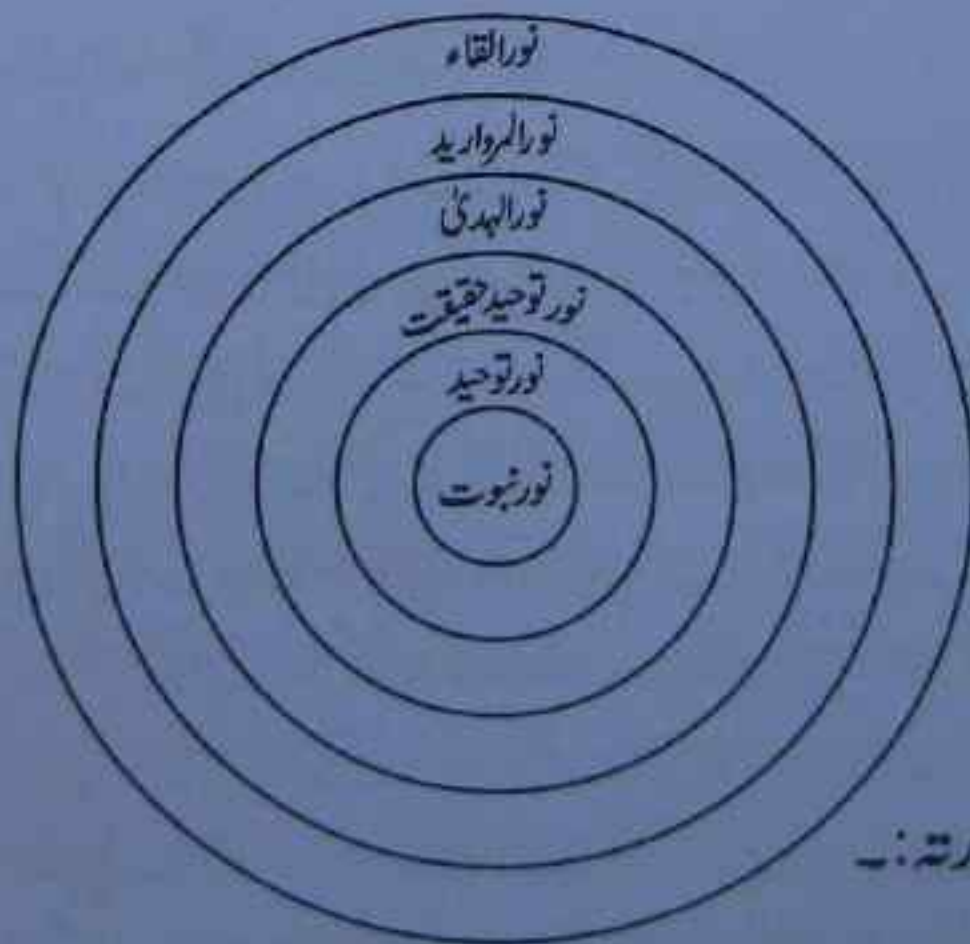
نورتہ درتہ:۔

اصل بات یہ ہے کہ نورِ نبوت (نورِ اوّل/نورِ اُولیٰ) کو Touch کیسے کیا جائے؟ یہ بہت آسان کام ہے۔ حروفِ مقطعات میں ایک حرف ''ع'' ہے جو ''عبد'' کو Depict کرتا ہے۔ کوئی شخص عبد ہو نہیں سکتا جب تک وہ عاجز نہ ہو۔ جب انسان حقیقی معنوں میں زبان ہی سے نہیں بلکہ دل سے بھی عاجزی اختیار کرلے تو سمجھ جایئے کہ وہ بندگی کے قریب ہو گیا۔ جب انسان بندگی اختیار کرے گا تو وہ Absolute surrender میں چلا گیا اور جہاں انسان Absolute surrender میں گیا وہاں وہ Total submission میں داخل ہو گیا اور Total submission اصل میں نام ہے بندگی کا۔ جہاں انسان اپنی سوچ، اپنی خواہشات اور اپنی ضروریات پر لکیر پھیر دیتا ہے اُس کی سوچ، خواہشات اور ضروریات اللہ کی مرضی کے تابع ہو جاتی ہیں کہ جو کچھ رب تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا اُس کو اپنے لیے بہتر اور کافی جان کر قبول کر لیا۔

Total submission میں داخل ہوتے ہی انسان بندگی کے مقام پر چلا جاتا ہے اور جیسے ہی وہ بندگی اختیار کرتا ہے تو رب کو پالیتا ہے اور جب انسان رب کو پالے گا تو وہ نورِ اوّل (نورِ نبوت) کو Touch کرلے گا۔ وہاں رب تعالیٰ بندہ پر اپنی رحمت کے صدقے احوال کھولے گا لیکن صرف اُسی قدر جس قدر وہ چاہے گا۔ تب انسان زمان و مکان (Time and Space) سے Beyond (بالاتر) ہو جائے گا۔ اسی کو کشف کہتے ہیں۔

لیکن یہاں ایک مقام آجاتا ہے کہ انسان رب سے کہتا ہے کہ مجھے کشف و کرامات درکار نہیں۔ مجھے تو تُو اپنا آپ عطا کر۔ مجھے تیرا قرب اور دوستی درکار ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کشف و کرامات کو اضافی چیز سمجھنے لگتا ہے اور ان سے دُور بھاگنے لگتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کشف و کرامات انسان کو Distract کر جاتی ہیں۔ رب کی قربت کی راہ سے ہٹا دیتی ہیں۔ انسان انہی میں کھو جاتا ہے۔ اس لیے انسان کشف و کرامات کی بجائے رب سے رب کو مانگتا ہے۔ اُس کے قرب اور دوستی کا تقاضا کرتا ہے۔

سوال: اہلِ کتاب کے راندۂ درگاہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: جب تک ہم اپنے ذہنوں سے یہ بات نہیں نکالیں گے کہ اسلام کے علاوہ دیگر ادیان یا مذاہب کے پیروکار بھی اللہ کے بندے اور انسان ہیں تب تک ہم بھول بھلیوں میں گم رہیں گے۔ ہمارے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ صرف ہم ہی اللہ کے بندے ہیں اور رب صرف ہمارا ہی ہے حالانکہ قرآن پاک میں واضح طور پر ذکر ہے کہ ہاں اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ صاحبِ علم ہوتے ہیں۔ دراصل ہم بھول جاتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ سے قبل آنے والے تمام انبیاء اور قرآن پاک سے قبل نازل ہونے والی تمام الہامی کتب پر ایمان لانے کا اعلان کر چکے ہیں۔ فرق محض اتنا سا ہے کہ رب تعالیٰ کا پیغام ہمیشہ اُس دور کے لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق صحیفوں اور الہامی کتب کی صورت میں نازل ہوتا رہا اور مختلف پیغمبر اللہ کے اُس پیغام کو Remind کراتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ انسانی ذہنی ارتقا پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اسلام کی صورت اپنا پیغام مکمل کر کے Declare کر دیا کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔

(سورۂ مائدہ:3) لہٰذا اللہ کا پیغام جس دور کے لوگوں کے لیے تھا اُنھوں نے اگر اللہ کے Latest پیغام اور Latest پیغمبر کو Follow کیا تو اُن کو اتنا علم مل گیا جس سطح کا اُس دور کا پیغام تھا۔ علم مسلمانوں کے پاس بھی وہی ہے۔ یہود و نصاریٰ کے پاس بھی وہی ہے۔ لیکن علم کی سطح یا ڈگری کا فرق ہے۔ مسلمانوں کے پاس Greater degree علم ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک کتاب کے 1920ء کے ایڈیشن میں وہ علم نہیں ہوگا جو اُسی کتاب کے 1980ء کے ایڈیشن میں ہوگا۔ عقل مند انسان وہی ہے جو کتاب کے Latest edition کو Follow کرے گا۔

اہل کتاب کے راندۂ درگاہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اللہ کے آخری پیغام اور آخری نبی ﷺ کو تسلیم نہیں کیا۔

سوال: کیا ہندومت بھی الہامی مذہب ہے؟ الہامی مذاہب کی نشانی کیا ہے؟ تقابلِ ادیان کے مطالعہ کے وقت کن چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

جواب: میرے خیال کے مطابق ہندو دھرم الہامی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس وقت ہندو مذہب کا شمار دُنیا کے قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے۔ یہ تقریباً 7000-5000 سال پرانا ہے۔ اُس دور میں ابھی انسانی ذہنی ارتقا کا آغاز نہیں ہوا تھا کیونکہ ابھی وہ پتھر کے زمانہ میں سانس لے رہا تھا۔ اُس وقت کا پیغام اُس دور کے لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق تھا۔ تعلیم اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے انسان قدرتی آفات اور جنگلی جانوروں کے رحم و کرم پر تھا۔ اُس دور کے ہندوؤں کو مذہب تو مل گیا لیکن وہ خود سے بالاتر اور طاقت ور نظر آنے والی ہر چیز اور مخلوق سے مرعوب ہوتے چلے گئے۔ سانپ کے ڈسنے سے خوفزدہ ہو کر وہ اُسے ناگ دیوتا مان بیٹھے۔ گائے نے دودھ کی صورت اُنھیں فائدہ پہنچایا تو وہ اُسے ماں بنا کر پوجنے لگے۔ پھر یہ ہوا کہ اُنھوں نے جہالت اور کم علمی کی وجہ سے اپنے ہاں کی طاقت ور مذہبی شخصیات کو بھی دیوتا کا رُتبہ دے دیا۔ اُن کے ذہین لوگوں نے رب کی صفات کو بتوں کے روپ میں ڈھالا اور لکشمی دیوی اور کالی ماتا کی پوجا کرنے لگے۔ یہ سب رُسوم اتنی پختہ ہو گئیں کہ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو دھرم محض رُسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔

الہامی مذاہب کی ایک نشانی بہت زبردست ہے۔ وہ یہ کہ تمام الہامی مذاہب میں Dos اور Do nots کی فہرست تقریباً مشترک ہے۔ اسلام میں جن چیزوں کا حکم ہے دیگر الہامی مذاہب میں بھی وہ احکامات موجود ہیں اور جن چیزوں سے اسلام نے منع کیا ہے وہ دیگر مذاہب میں بھی منع ہیں۔

ہندو مذہب میں بھی خدمتِ خلق کا تصور موجود ہے۔ ہندو اپنی کمائی پبلک ویلفیئر پر خرچ کرتے ہیں۔ فطرتاً کنجوس ہونے کے باوجود بھوکے کو کھانا کھلانے میں بہت فیاض ہیں۔ بڑوں کی اس قدر تعظیم کرتے ہیں کہ بعض اوقات شرک تک چلے جاتے ہیں۔

جہاں تک تقابلِ ادیان کے مطالعہ کا تعلق ہے تو ایک سچا مسلمان ہمیشہ دوسروں کی اچھائیوں پر نظر رکھتا اور خامیوں کو صرفِ نظر کرتا ہے۔ لہٰذا تقابلِ ادیان کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم مختلف مذاہب کی مثبت چیزوں کو تلاش

کرنے کی بجائے یہ دیکھیں کہ ان مذاہب یا ادیان اور دین اسلام میں کیا کیا چیزیں یا احکامات مشترک ہیں۔ یہ رویہ اپنا کر ہم دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو اپنے قریب لاسکتے ہیں۔ اس سے بھائی چارہ کو فروغ ملے گا اور اسلام تو ہے ہی بھائی چارہ کا مذہب۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو منع کیا ہے کہ کسی کے جھوٹے خدا کو بُرا نہ کہو تا کہ وہ تمھارے سچے خدا کو بُرا نہ کہے۔ اللہ نے ہم پر لازم کر دیا کہ ہم اپنے ملک میں رہنے والے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی حفاظت اور احترام کریں۔ اُن کے عقائد کا مذاق نہ اُڑائیں اور اپنے ملک میں رہنے والے غیر مسلموں کو اُن کے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی اور سہولت فراہم کریں۔

تقابلِ ادیان کے وقت تنقیدی رویہ اپنانے کی بجائے ہم بہترین ذاتی مثال کے ذریعے ثابت کر دکھائیں کہ اسلام سب مذاہب میں بہترین ہے۔

سوال: ذاتی مثال کے ذریعہ کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اسلام ہی بہترین مذہب ہے؟

جواب: ہر انسان کو رب تعالیٰ نے ذہن، سمجھ اور عقل عطا فرمائی ہے۔ اگر میں آپ کے پاس آ کر یہ کہوں کہ آپ کے اور میرے درمیان فلاں فلاں چیزیں مشترک ہیں اور اس کے فوراً بعد میں یہ کہہ دوں کہ آپ فلاں کام کیوں کرتے ہیں تو آپ کھٹک جائیں گے کہ یہ شخص مجھ پر تنقید کرنے کے لیے Common چیزیں گنوا رہا تھا۔

لیکن اگر یہ رویہ اپنانے کی بجائے میں ایسا کرلوں کہ آپ اپنے گھر کا کوڑا سمیٹ کر میرے دروازے کے سامنے پھینک دیں تو میں بجائے آپ سے جھگڑا کرنے کے روزانہ Sweeper کو زائد رقم دے کر کوڑا اُٹھواتا رہوں۔ آپ اپنا گھر دھو کر روزانہ پانی میرے دروازے کے سامنے کھڑا کرتے رہیں اور میں روز Slip ہونے کے باوجود آپ سے گلہ نہ کروں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ کی ذرا سی مشکل پر سب سے پہلے آپ کے کام آنے والا آدمی میں ہی ہوں گا۔ میرے اس عمل سے آپ کتنا عرصہ مجھ سے برگشتہ رہیں گے؟ زیادہ سے زیادہ دو چار سال بعد آپ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس شخص کا مذہب کیسا باکمال ہے۔ دوسروں کی زیادتی کے باوجود اچھے سلوک کی تلقین کرتا ہے۔ یوں آپ خود بخود اسلام کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ اب یہاں لفظ تو میں نے ایک بھی ادا نہیں کیا لیکن عمل سے ثابت کر دیا کہ ایک مسلمان کا کردار کیا ہے۔ چودہ سو سال قبل مسلمانوں نے یہی انداز اپنایا تھا اور وہ کامیاب ہو گئے تھے۔

جب بغداد پہلی بار تباہ ہوا تو اُس وقت Comparative study of religions بہت زوروں پر تھی۔ دجلہ کے کنارے کئی کئی روز مناظرے ہوا کرتے۔ عجیب بات ہے کہ دوسری بار جب بغداد تباہ ہوا تب بھی مناظرے عام تھے۔ بغداد جب بھی تباہ ہوا انہی مناظروں کے ہاتھوں ہوا۔ کیونکہ اُس وقت Centre of Education اور Centre of Knowledge بھی بغداد ہی تھا۔ بغداد کی لائبریریاں دُنیا کی بہترین لائبریریاں مانی جاتی تھیں۔ اُنھیں لوٹا اور جلایا گیا۔ دجلہ میں ہلاکو خان نے ڈھیروں کتابیں بہا دیں۔ اسی طرح بغداد جلا تو بہت سی کتابیں بھی جل گئیں۔

قصہ مختصر تقابلِ ادیان کے مطالعہ اور بحث سے کہیں بڑھ کر مسلمان کا ذاتی کردار غیر مسلموں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا سبب بنتا ہے۔

سوال: کیا انسان جسمانی طور پر بھی Time and Space سے Beyond ہو سکتا ہے؟

جواب: Mostly it is spiritual (ایسا اکثر رُوحانی طور پر ہوتا ہے) کیونکہ انسان فطرت کو شکست نہیں دے سکتا۔ Law of nature نہیں ٹوٹے گا۔ یہ تمام وارداتیں رُوحانی ہوتی ہیں۔

اس حوالے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں ملکہ بلقیس کے تخت لانے کا واقعہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ایک اور واقعہ بھی آپ کو یاد ہوگا قلعہ خیبر کا دروازہ جسے کھولنے کے لیے درجنوں آدمی درکار تھے اُسے حضرت علیؓ نے تن تنہا زمین پر بیٹھ کر بمعہ چوکھٹ کے اُکھاڑ ڈالا۔ لیکن یہ سب Exceptional Cases (مستثنیٰ معاملات) ہیں۔ ان کے پیچھے مقصد اللہ کی ربوبیت اور اُس کی حقانیت کو اُجاگر کرنا ہوتا ہے۔ میرا یہ کہنا کہ Mostly it is spiritual۔ اس میں mostly سے اشارہ ان Exceptions کی طرف ہی تھا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کے اسما ظاہر و باطن کو فلسفہ ہمہ اوست' اور 'ہمہ ماوست' کی روشنی میں واضح کر دیجیے۔

جواب: مسئلہ ہمہ اوست کے حامی کہتے ہیں کہ ہر شے میں رب موجود ہے۔ ابن عربی اس مسئلہ کو متعارف کرا گئے۔ اس پر مسلمانوں میں بہت فسادات ہوئے اور جانیں ضائع ہوئیں۔ مسئلہ ہمہ ماوست کے ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز میں اللہ سرایت نہیں کیا ہوا بلکہ ہر چیز من جانب اللہ ہے۔ اللہ نے ہر چیز تخلیق کی ہے۔ ظاہر و باطن کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اور مسئلہ ہے۔

فقیرانہ طریقہ تبلیغ

سوال: کیا لاعلاج امراض بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں؟

جواب: کچھ امراض کا علاج جب ممکن نہیں ہوتا اور ایسے میں پروردگار کسی کو شفا دینا چاہتا ہے تو بسا اوقات ایسا بندوبست کر دیتا ہے کہ وہ مریض دوائی تو کسی اور مرض کے علاج کے لیے کھاتا ہے لیکن اُس دوائی کے Side-effect سے وہ لاعلاج مرض ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ایک خاتون جو کچھ سن نہ سکتی تھیں، انھیں کینسر ہو گیا۔ کینسر کے علاج کے لیے ڈاکٹر نے دوائی دی تو کینسر تو مکمل ٹھیک نہ ہوا لیکن اُن خاتون کی قوتِ سماعت بحال ہو گئی۔

سوال: عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایک پیدائشی مسلمان کی نسبت وہ شخص زیادہ اچھا مسلمان ہوتا ہے جو کسی اور مذہب کو چھوڑ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: مولانا روم کی مثنوی جو دُنیا بھر میں مشہور ہے اور اب اس کا دُنیا کی تمام زبانوں میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس میں ایک جگہ مولانا روم بانسری کو مخاطب کر کے پوچھتے ہیں کہ تمھارے اندر اتنا سوز و گداز کیوں ہے؟ پھر اس کا جواب مولانا روم خود ہی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بانسری کے سوز و گداز کی وجہ اُس کا اصل سے جُدا ہو جانا اور کٹ جانا ہے۔ اِس کے بعد مولانا روم نے انسان کو مخاطب کر کے سوال کیا ہے کہ تم بھی تو اپنے اصل سے جُدا ہو چکے ہو پھر تمھارے اندر یہ گداز کیوں نہیں ہے؟

درحقیقت ہوتا یہ ہے کہ ایک انسان مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُس کے کان میں اذان دے دی گئی۔ اُس کا مسلمانوں والا نام رکھ دیا گیا اور اپنے والدین کو دیکھ اور سُن کر اُس نے یہ عقیدہ پال لیا کہ میں مسلمان ہوں۔ قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔ وہ کبھی سوچتا ہی نہیں کہ دین اصل میں ہے کیا؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ پیدائشی مسلمان ہر چیز کو For granted لیتا ہے جب کہ وہ شخص جو عمر کے کسی حصے میں کسی دوسرے مذہب سے اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ درحقیقت دینِ اسلام کو Study کرنے کے بعد اپناتا ہے۔ وہ اپنے سابقہ مذہب کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ Convinced (قائل) ہوتا ہے کہ یہی دراصل سچا مذہب ہے اور مجھے اس پر عمل کرنا ہے۔ سابقہ

مذہب ترک کرنے کے بعد جب وہ دینِ اسلام کو اختیار کرتا ہے تو پھر اس کے تمام ارکان اور اوامر ونہی کی سچے دل سے پیروی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرنے والا شخص عموماً زیادہ Practical اور باعمل مسلمان ہوتا ہے بہ نسبت اُس انسان کے جو ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کے بعد مسلمان کہلایا۔

سوال: اکثر مستحب اعمال کی انجام دہی کے حوالے سے ہم غیر محتاط ہوتے ہیں۔ کیا یہ رویہ درست ہے؟

جواب: ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ مستحب اعمال کے بارے میں تو میں آزاد ہوں۔ کرلوں تو ثواب ہے، نہ کروں تو گناہ نہیں۔ درحقیقت ایسا نہیں۔ مستحب اعمال شیطان کے حملہ کے خلاف ہمارے پاس ڈھال ہیں۔ اسلام وہ قلعہ ہے جس کی پانچ فصیلیں ہیں۔ سب سے بیرونی فصیل مستحب اعمال کی ہے۔ اس کے اندر والی فصیل سنت کی ہے۔ اس سے اور اندر چلے جائیں تو فرائض کی فصیل ہے۔ اس کے اندر اخلاص کی فصیل ہے اور آخری فصیل ایمان کی ہے۔

یوں کہہ لیجیے کہ سب سے پہلی ڈھال ایمان کی، دوسری اخلاص، تیسری فرائض، چوتھی سنت اور پانچویں ڈھال مستحب اعمال کی ہے۔ جب ہم مباح یا مستحب اعمال کو ترک کرنے لگتے ہیں تو شیطان پہلی فصیل کو ضرب لگاتا ہے اور تب شیطان کے لیے آسان ہو جاتا ہے کہ وہ انسان کو سنت پر عمل پیرا ہونے سے بھی روک دے۔ یوں رفتہ رفتہ انسان سنت کی ادائیگی میں بے پروائی برتنے لگتا ہے۔ اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب شیطان فرائض کی فصیل پر نقب لگاتا ہے اور نتیجتاً انسان فرائض کی ادائیگی میں غفلت برتنے لگتا ہے۔ جب شیطان ہمیں فرض عبادات و معاملات کی ادائیگی سے روکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر وہ ہمارے اخلاص کی فصیل پر ضرب لگاتا ہے اور اس فصیل کو فتح کرنے کے بعد وہ ہمارے ایمان کو تباہ کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ایمان، اخلاص اور فرائض وسنت کی پیروی کی عادت برقرار رہے تو ضروری ہے کہ ہم مستحب اعمال کو بھرپور اہمیت دیں اور اُن کو اپنی زندگی میں داخل کرلیں کیونکہ یہ مستحب اعمال شیطان کے خلاف پہلا Defence (دفاع) ہیں۔ اہلِ فقر مستحب اعمال کے بارے میں بہت محتاط رہتے ہیں۔ یہ رویہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے۔

سوال: ایک فقیر یا صوفی کا طریقہ تبلیغ کیا ہے؟

جواب: فقیر دراصل یہ فرض تو پورا کرتا ہے کہ دوسروں کو نیکی کی دعوت دی جائے لیکن وہ یہ دعوت الفاظ سے نہیں بلکہ اپنے عمل اور Personal example (ذاتی مثال) سے لوگوں کو دیتا ہے اور انھیں نیکی کی طرف بلاتا ہے۔ اگر وہ زبان سے کسی کو نیکی کی دعوت دیتا ہے تو صرف ایسے اُمور کے لیے جن کے بارے میں احکامات بہت Clear (واضح) ہیں۔ جیسے نماز قائم کرنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا، چوری نہ کرنا، وغیرہ۔ لیکن جو چیز کیا واضح اور یقینی نہیں ہیں اُن کے بارے میں وہ زبانی دعوت کو مناسب خیال نہیں کرتا۔ کیونکہ اُن سے متعلق انسان کو اس وقت تک اظہارِ خیال نہیں کرنا چاہیے جب تک اُس کے پاس اُن مسائل کے بارے میں مناسب علم نہ

ہو۔ اسی طرح جن مسائل کا تعلق فقہ سے ہو اُن کو بھی فقہا پر چھوڑ دینا چاہیے۔

فقیر تنقید سے دُور بھاگتا اور نصیحت کرنے سے اجتناب کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نصیحت کرنے والے سے لوگ کترانے لگتے ہیں۔ ایک مبلغ فقیر چاہتا ہے کہ لوگ اُس کے پاس آئیں۔ اُس کے کردار و عمل کا مشاہدہ کریں۔ اُس سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کو اُسی رنگ میں رنگ لیں۔ یوں فقیر زبانی دعوت کی بجائے ذاتی مثال کو ذریعہ تبلیغ بناتا ہے۔

دوسری بات جو فقیر ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھتا ہے کہ دوسروں کے نقائص کی نشاندہی کرنے سے پہلے وہ اپنے نقائص اور خامیوں کو دُور کرتا ہے۔ وہ ساری عمر اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنی خامیوں پر کیسے قابو پایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیر کو کبھی کسی کی ذات میں کوئی خامی یا عیب نظر نہیں آتا۔ جب فقیر انسانی اختیار کی حد تک اپنی خامیوں اور نقائص کو دُور کر لیتا ہے تو پھر وہ لوگوں کو نیکی کی راہ کی طرف بلاتا ہے۔

میرے خیال میں فقیر کا یہ طریقہ زیادہ بہتر ہے کہ انسان ہمیشہ اپنی ہی غلطیوں، کوتاہیوں اور خامیوں کی تلاش اور اصلاح میں لگا رہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ خلقِ خدا کو اُس میں کشش محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ اُس کی طرف کھنچنے لگتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی خامیوں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ لہٰذا جو لوگ رُوحانیت کی راہ پر چلنے کے خواہش مند ہیں اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی خامیوں پر نظر رکھیں۔ یوں دوسروں پر اُنگلی اُٹھانے کا موقع اور وقت ہی نہیں ملے گا۔

رحم ہی کیوں

سوال: سورۃ "النحل" کی آیت نمبر 37 کا ترجمہ ہے

"جس کو اللہ گمراہ کردے اُسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور ایسے لوگوں کا کوئی مددگار نہیں۔"

اس کی وضاحت فرما دیجئے۔

جواب: قرآن پاک میں دو طرح کی آیات ہیں۔

1۔ متشابہات

2۔ بیّنات

اگر ہم قرآن پاک کی ایک آیت کا Independently ترجمہ و تشریح کریں تو معاملہ Confuse ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن پاک ایک تسلسل ہے۔ ایک آیت کو سمجھنے کے لیے اُسے دوسری آیت سے ملا کر دیکھیں گے تو مفہوم واضح ہو جائے گا۔

جہاں تک مذکورہ آیت کا تعلق ہے اس کا تناظر میں عرض کر دیتا ہوں۔ قرآن پاک میں رب تعالیٰ نے انسانوں کو دو طرح سے ترغیب دی ہے کہ وہ راہ ہدایت اور صراط مستقیم اختیار کرلیں۔ کسی مقام پر اُنھیں ثواب و اجر اور انعامات کی شکل میں ترغیب دی ہے جیسے باجماعت نماز ادا کرنے کا بہت ثواب ہے۔ شب قدر میں عبادت کرنے کا بہت اجر ہے۔ خدمتِ خلق کرنے والوں کے لیے بہت انعامات ہیں۔ حالانکہ مالک تو ہر شے کا اللہ ہے۔ انسان تو بے حد عاجز ہے۔ لیکن جب انسان رب کے دیئے ہوئے مال میں سے رب ہی کو قرض دیتا ہے۔ اس مال کو رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو وہ اُسے بہترین انداز میں کئی گنا بڑھا کر لوٹا دیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو وہ راہ اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے جو اُسے دُنیا و آخرت میں سرخرو کردے۔

جہاں اللہ نے بندوں کو انعامات سے ترغیبات دی ہیں وہاں اُن لوگوں کو جو دُنیاوی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں آخرت کے عذاب سے ڈرایا ہے تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔ اس آیت کا پہلا حصہ انہی لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

قرآن پاک کی تکمیل کے ساتھ ہی دین مکمل ہو گیا اور آپ ﷺ کے تشریف لانے کے بعد نبوت کا

سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ Law of nature کے مطابق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چیزوں پر گرد پڑتی رہتی ہے اور ان میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ اس کا بندوبست اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے آخر میں ایک مجدد اور ہر ہزار سال بعد ایک مجدد کامل کو بھیجتا ہے جس طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو دین اکبری کے فتنے کے خاتمہ کے لیے بھیجا گیا۔ جنہوں نے اس فتنہ کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا اور اسلام میں جو چیزیں داخل کرنے کی کوشش کی گئی تھی، ان تمام چیزوں اور رسوم کو ختم کر کے اسلام کو اس کی اصلی صورت میں دوبارہ رائج کیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے آئینہ اسلام پر پڑنے والے گرد و غبار کو جھاڑنے پونچھنے کا انتظام کیا۔

جب نبوت کا سلسلہ جاری تھا تو یہ انبیاء کی ڈیوٹی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور دین مکمل ہو گیا تو اب یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی اصلی شکل میں اشاعت کریں۔ اسلام کو پھیلانے کے لیے تصوف کا نظام بھی موجود ہے۔ ایک عالم اور صوفی میں بس اتنا سا فرق ہے کہ عالم بتاتا ہے کیا چیز کیا ہے؟ عالم چیزوں کو Define کرتا ہے جب کہ فقیر ان باتوں پر عمل سکھاتا ہے۔ تقریر و تبلیغ عالم کا فرض ہے۔ فقیر اسلام کو پوری طرح اپنی ذات پر طاری کرتا ہے۔ لوگ اس کے ثمرات دیکھتے ہیں اور ان سے ترغیب پا کر اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک سیلزمین (Salesman) سرِ راہ کھڑا دُنیا کی بہترین ملٹی وٹامنز فروخت کرنے کے لیے ان الفاظ میں مارکیٹنگ کرتا ہے کہ یہ دُنیا کی بہترین وٹامنز ہیں۔ میں روزانہ خود بھی یہ کھاتا ہوں آپ بھی خرید لیجیے۔ اب اُس سیلزمین کی اپنی جسمانی حالت ایسی ہے کہ اُس کے جسم پر گوشت کا نام و نشان نہیں، نقاہت سے اُس کی ٹانگیں اور ہاتھ کانپ رہے ہیں اور آواز میں لرزش ہے۔ اُس سیلزمین کی ظاہری جسمانی حالت کو دیکھ کر اُس کی بہترین مارکیٹنگ پر کوئی یقین نہیں کرے گا اور وٹامنز نہیں خریدے گا۔

اب دوسری طرف ایک شخص جو تندرست و توانا نظر آتا ہے اُس کے Muscles مضبوط ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ میں کوئی وٹامنز یا خاص خوراک نہیں کھاتا۔ محض سوکھی روٹی کھا کر گزارہ کرتا ہوں۔ لوگ اس سوکھی روٹی کے بہترین اثرات دیکھ کر خود بھی سوکھی روٹی کھانے لگیں گے۔

فقیر جب اسلام کی ترغیب و دعوت دیتا ہے تو وہ عملی طریقہ استعمال کرتا ہے۔ اپنے اعمال و کردار سے اسلام کی تبلیغ کرتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر لوگ اُس کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ جو لوگ ہدایت پا جاتے ہیں وہ رب تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ٹھہرتے ہیں۔ لیکن ترغیب و تبلیغ کے باوجود بھی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نہ تو انعامات کے لالچ اور نہ ہی عذاب کے خوف سے رب کو مانیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُن کے دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں اور اُن کے دل سیاہ کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ہدایت کی طرف نہیں آئیں گے خواہ اُنھیں کتنی ہی نصیحت کی جائے۔ آیت کا بقیہ حصہ اُنہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کفار کی اکثریت اللہ تعالیٰ کو مانتی ہی نہ تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے کفر میں اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ وہی لوگ

تھے جو دلوں پر مہر لگ جانے کے باعث نہ تو عذابِ الٰہی سے خوف کھاتے تھے اور نہ ہی جنت جیسی نعمت پر یقین رکھتے تھے۔ بلکہ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنے غلط مذہب پر قائم تھے اور اس پر فخر کا اظہار کرتے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ گمراہوں اور غیر ہدایت یافتہ لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ اللہ سے کبھی صبر نہ مانگیں بلکہ اُس کا رحم مانگیں تو رحم ہی کیوں؟

جواب: میں تو اسی بات کا قائل ہوں کہ اللہ سے رحم اور اُس کی رحمتیں طلب کرنے کے سوا کچھ نہ مانگا جائے۔ کیونکہ جب ہم اللہ سے رحم مانگتے ہیں تو اس ایک لفظ میں بہت سی چیزیں چھپی ہوتی ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "یا ارحم الراحمین! تو اپنے نبی اکرم ﷺ کے صدقہ ہم پر رحم فرما دے۔" تو درحقیقت ہم اللہ سے صرف ایک چیز نہیں مانگ رہے ہوتے بلکہ ہم رحم مانگ کر اللہ کے حضور Confession (اقرارِ جرم) کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم گناہ گار اور خطا کار ہیں۔ پھر ہم اللہ کے حضور رحم کی درخواست کے ذریعے دراصل اپنی بے بسی، بے کسی اور عاجزی کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں کہ "اے اللہ! تو بہت زبردست اور طاقت ور ہے اور ہم تیری قوت کے سامنے بہت بے کس، بے بس اور عاجز ہیں۔" یاد رکھیے رحم کی اپیل وہی کرتا ہے جو کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ جو بے کسی اور بے بسی کی آخری سطح پر ہوتا ہے۔ رحم مانگ کر ہم اللہ کے سامنے ایک تیسری چیز کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ہم سے جو گناہ اور خطائیں ہو گئیں اُن کے لیے ہمارے پاس کوئی Justification (جواز) نہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ گناہ اور خطائیں ہمیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ جب ہم رب تعالیٰ سے اُس کا رحم مانگتے ہیں تو درحقیقت ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں بنتا کہ تجھ سے کسی قسم کی کوئی رعایت مانگیں کیونکہ ہم خطا کار ہیں۔ تو اپنے زبردست، قوی اور ارحم الراحمین ہونے کے صدقے ہم پر رحم فرما۔ چونکہ اپنے بندوں پر رحم فرمانا رب تعالیٰ کی سنت ہے اس لیے وہ ہمیں معاف فرما دیتا ہے۔ یوں اللہ سے ایک صرف رحم مانگ کر دراصل ہم نے چار قسم کے جذبات کا اظہار کر دیا۔

جب اللہ نے ہم پر رحم فرما دیا۔ ہمیں معاف فرما دیا تو خود رب تعالیٰ کے فرمان کے مطابق معاف کر دیئے جانے کے بعد ہم نوزائیدہ بچہ کی طرح معصوم ہو گئے۔ پھر اس معصومیت کی حالت میں ہم اللہ کے حضور عرض گزار ہوتے ہیں "یا اللہ پاک! تو ہم پر اپنی رحمتیں نازل فرما۔" تب ہم ان رحمتوں کو وصول کرنے کی پوزیشن میں آ جاتے ہیں۔ اور جس پر اللہ رحمتیں نازل فرما دے پھر مانگنے کو مزید کچھ نہیں رہتا کیونکہ اُس کی رحمت تو ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس لیے اللہ سے ہمیشہ اُس کا رحم مانگنا چاہیے اور اگر ہم ایک قدم اور آگے چلے جائیں تو پھر رحم کے ساتھ اُس کی رحمتیں بھی طلب کریں تاکہ ہم صرف معاف نہ کیے جائیں بلکہ انعامات کے مستحق بھی ٹھہریں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ اسمِ اعظم کو Disclose (عیاں) نہیں کیا جا سکتا۔

جواب: رُوحانیت میں تین Levels ہیں۔ دُنیاوی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ اکنامکس کا مضمون ابتدائی جماعتوں میں Fundamentals of Economics پر مشتمل ہوتا ہے۔ جوں جوں تعلیمی سطح میں اضافہ

ہوتا ہے مضمون کا معیار بتدریج بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ماسٹرز میں مائیکرو، میکرو اور میگا اکنامکس کی بات ہونے لگتی ہے۔ اگر بالکل ابتدائی سطح پر ہی طالب علموں کو مائیکرو، میکرو اور میگا اکنامکس کی تھیوریز سمجھانے کی کوشش کی جائے تو ساری بات اُن کے سر کے اوپر سے گزر جائے گی اور وہ ساری عمر بھٹکتے رہیں گے۔

اسی طرح رُوحانیت میں کچھ ابتدائی چیزیں ہیں جنہیں Introduction to Spiritualism کہا جاتا ہے۔ جس میں بتایا جاتا ہے کہ رُوحانیت ہوتی کیا ہے؟ اسے حاصل کیسے کیا جاتا ہے؟ کیسے لوگوں کو ملتی ہے؟ اس کے حصول کے لیے اپنے آپ کو تیار کیسے کیا جاتا ہے..... یہ سب رُوحانیت کا ایک تعارف ہے۔ یہ باتیں تقریباً سبھی کو معلوم ہیں اور اس میں کسی کو Confusion کا احساس نہیں ہوتا۔ رُوحانیت میں اگلا level (سطح) وہ ہے جس میں کارخانہ قدرت کی ابتدائی باتیں کی جاتی ہیں۔ اس میں ذکر اذکار، چلے مجاہدے اور کشف و کرامات کے بارے میں بات کی جاتی ہے اور یہ سب چیزیں سکھائی جاتی ہیں۔ اس دوران انسان مختلف چیزوں کا مشاہدہ اور مقامات کی سیر کرتا ہے۔ اگر جب اُس کے پاس ایک Certain degree of knowledge نہیں ہوگا تو وہ بھٹک جائے گا اور بجائے فقیر بننے کے کچھ اور بن جائے گا۔ اس لیے کوشش کی جاتی ہے کہ ان چیزوں کو عام آدمی کے سامنے Discuss ہی نہ کیا جائے تاکہ اُس کے عقائد میں کوئی خلل یا Frustration پیدا نہ ہو۔

رُوحانیت میں تیسرا لیول Advance Level کہلاتا ہے۔ جس میں کچھ باتیں صرف مستند اولیائے کرام کے سامنے کی جاتی ہیں جن کے بارے میں مرشد کو پتا ہوتا ہے کہ یہ اُس مقام پر آچکا ہے جہاں اُس کے کندھے پر مہر لگا کر اُسے باقاعدہ ولی اللہ کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

اس کے بعد وہ مقام شروع ہوتا ہے کہ جس میں انسان جوں جوں آگے بڑھتا ہے وہ تجربہ سے سیکھتا ہے اور یوں اُس کی معلومات اور علم میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر اسم اعظم اُس کے علم میں آجائے گا۔ اسم اعظم نہ تو کوئی مرشد کسی مرید کو بتاتا ہے کیونکہ اس کی اجازت نہیں اور نہ ہی کسی کتاب میں اُسے ملتا ہے کیونکہ یہ ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ ایک ولی اللہ جب ذکر اذکار اور مجاہدوں کی بنیاد پر رُوحانیت کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہوتا ہے تو اسم اعظم خود بخود اُس کے علم میں آجاتا ہے۔

سوال: میرے خیال میں سورۂ فاتحہ میں اسم اعظم موجود ہے۔ یہ اسم اعظم "رب العالمین" یا "الرحمٰن" میں پوشیدہ ہے۔

جواب: گزارش ہے کہ اسم اعظم سورۂ فاتحہ میں ہے نہ ان دونوں الفاظ میں۔ آپ کی Confusion دُور کرنے کے لیے یہ بتا دیتا ہوں کہ اسم اعظم کبھی اکیلا لکھا ہوا نظر نہیں آئے گا یہ ہمیشہ دیگر لفظوں میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اور بعد میں الفاظ موجود ہوں گے۔ جو لوگ اسم اعظم کا علم رکھتے ہیں وہ بھی اسے لپٹی ہوئی حالت ہی میں جانتے ہیں۔ بہر حال رب تعالیٰ کے تمام اسما بہت مبارک ہیں۔ ان کی اپنی تاثیر ہیں۔ ان کو پڑھنے والے کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس لیے آپ بھی یہ اسما ضرور پڑھ لیجیے۔ بہت برکات نازل ہوں گی۔

سوال: بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جنتی دروازے کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جنتی دروازے کے بارے میں جو روایت مشہور ہے اس کے Background کے بارے میں میرا گمان یہ ہے کہ بابا صاحب نے جو یہ فرمایا کہ اس دروازے سے گزرنے والا جنتی ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ درحقیقت اُس وقت یہ کمرہ جہاں بابا صاحب آرام فرما ہیں، اُن کا حجرہ ہوا کرتا تھا۔ یہی آپ کی رہائش گاہ اور عبادت گاہ تھا۔ اس حجرہ میں داخل ہونے کی اجازت بابا صاحب کے قریبی دوستوں کو ہی تھی۔ باقی لوگ تو مسافر خانہ یا مہمان خانہ میں قیام کرتے اور لنگر خانہ سے انھیں کھانا کھلایا جاتا۔ حجرہ میں داخلہ صرف اُن کے قریبی ساتھیوں کے لیے ممکن تھا جو پریکٹیکل مسلمان تھے اور جنھوں نے اسلام کو خود پر مکمل طور پر طاری کیا ہوا تھا۔ جو شخص پورے کا پورا اسلام میں داخل ہو جاتا ہے وہ مومن ہے اور مومن جنتی ہوتا ہے۔ بابا فرید صاحب کے قریبی دوست چونکہ مستند مسلم تھے اسی وجہ سے یہ روایت مشہور ہے کہ اس دروازے سے گزرنے والا جنتی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ بھی بابا فرید صاحب کے مقربین میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو اسلامی تعلیمات پر مکمل طور پر کاربند ہوں۔ اوامر و نہی کی صحیح طریقہ سے پیروی کریں تب آپ اتنے نیک ہو جائیں گے کہ رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقہ آپ کو جنت عطا کر دے گا۔ یوں بابا صاحب کے مقربین میں شامل ہونے کے بعد بہشتی دروازے والی یہ روایت آپ کے حق میں درست ثابت ہوگی۔

سوال: والدین کے ساتھ حسن سلوک سے کیا مراد ہے؟

جواب: قرآن پاک میں واضح طور پر فرما دیا گیا کہ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر تیرے سامنے اُن میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن سے اُف تک نہ کہنا اور انھیں نہ جھڑکنا اور اُن سے تعظیم کی بات کہنا۔ (سورۂ بنی اسرائیل: 23)

والدین کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ نہ صرف اُن کی عزت کی جائے اور اُن کی تمام ضروریات کا خیال رکھا جائے بلکہ اُن کی دلجوئی بھی کی جائے۔ اگر ہم ہر لحاظ سے اُن کی ضروریات اور جذبات و احساسات کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ اُن کی دلجوئی بھی کرتے ہیں تو یہ حسن سلوک ہے۔ اُن کی دلجوئی کے معاملہ میں ہم اکثر کوتاہی کر جاتے ہیں جس میں احتیاط برتنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ دُنیا و آخرت میں اس کا اجر عطا فرمائے گا۔

سوال: علاؤ الدین صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کچھ عرض کر دیجیے۔

جواب: آپ والد کی طرف سے پیرانِ پیر حضرت غوث الاعظم دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں۔ والدہ کی طرف سے آپ بابا فرید صاحب کے خاندان سے ہیں۔ آپ کی والدہ بابا صاحب کی سگی بہن تھیں۔ آپ کے والد کا انتقال آپ کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ لہٰذا آپ کی والدہ نے آپ کو لڑکپن میں تربیت کے لیے اپنے بھائی بابا فرید صاحب کے حوالے کر دیا۔ بابا فرید صاحب وہ کمال ہستی ہیں جن کی پرواز سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔ اُنھوں نے علاؤ الدین صابر صاحب کی تربیت کے بعد انھیں اپنی خلافت عطا کی اور

اپنی صاحبزادی کی شادی بھی آپ کے ساتھ کی۔ لیکن وہ جلد انتقال کر گئیں۔ اس بارے میں مختلف روایات ہیں جن کی تفصیلات میں نہ جانا ہی بہتر ہے۔ سرکار صابر صاحب کو ولایت عطا کر دی گئی تھی۔ لیکن آپ واپس تشریف لے آئے کیونکہ آپ کا پروانہ ولایت پھاڑ دیا گیا تھا۔ تب دوبارہ بابا صاحب نے آپ کو بھیجا۔ اُس وقت آپ نے کلیئر شریف میں ڈیرے ڈالے جہاں اب آپ کا مزار ہے۔ آپ کے جلال کے باعث زیادہ لوگ آپ کے پاس نہیں جاتے تھے۔ صرف ایک ہی صاحب آپ تک پہنچ پائے وہ حضرت شمس ترک پانی پتی ہیں۔ (ترکی سے تعلق ہونے کے باعث اُن کے نام میں ترک آتا ہے اور پانی پت میں دفن ہونے کے باعث وہ پانی پتی کہلائے۔) وہ بابا فرید صاحب کی شہرت سن کر جب حصولِ فیض کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بابا صاحب نے فرمایا "تمھارا حصہ علاؤالدین صابر صاحب کے پاس ہے اُن کے پاس چلے جاؤ۔" حضرت شمس ترک پانی پتی نے عرض کیا "صابر صاحب تو کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے۔" تب بابا صاحب نے فرمایا "آپ جب اُن کے قریب پہنچیں تو دل میں کہیے گا کہ مجھے بابا فرید صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" یوں حضرت شمس ترک پانی پتی صاحب حضرت علاؤالدین صابر صاحب کے قریب ہونے میں کامیاب ہو گئے اور اُن کے اکلوتے مرید اور خلیفہ کہلائے۔

سوال: کیا موجودہ معاشرہ اقبال کے "مردِ مومن" والے معاشرے میں بدل سکتا ہے؟

جواب: اسلام میں مایوسی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو ہر وقت پُرامید رہنے کو کہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ مجھ سے اچھا گمان رکھو۔ میں اچھا ہی کروں گا[1]۔ اس لیے ہمیں مایوسی سے بچنا چاہیے۔ یوں ہم گناہ سے بچ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ سے اچھی اُمید رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُمید رکھنے والوں سے نہ صرف خوش ہوتا ہے بلکہ ہماری اُن اُمیدوں کو بر بھی لاتا ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے یہ اچھا گمان بھی رکھنا چاہیے کہ یہ معاشرہ اقبال کے مردِ مومن کا معاشرہ بن جائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے گمان سے بہت قریب ہے۔ وہ انشاء اللہ ایسا ہی کرے گا۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ اقبال نے جس دور میں مردِ مومن کا ذکر کیا تھا اُس دور کا معاشرہ موجودہ معاشرہ سے بہتر تھا۔ اب تو مردِ مومن کی جگہ ضربِ مومن کی ضرورت ہے۔ جس قدر آج کل کا معاشرہ ذکر اذکار، وظائف اور تسبیحات کا شوقین ہے اگر اوراد و وظائف کا یہ شوق رب سے محبت اور محض عبادت کے طور پر ہوتا نہ کہ دُنیاوی ضروریات و حاجات کی تکمیل کے لیے تو حالات شاید کچھ اور ہوتے۔ رب تعالیٰ کے ساتھ تو ہمارا رشتہ ایسا ہے کہ بہت سے لوگ یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھنے کے باوجود ہم مشکل میں ہیں۔ یوں گویا ہم اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نماز اس لیے پڑھتے ہیں تاکہ ہم پر کوئی مشکل نہ آئے۔ یاد رکھیے! نیک بندوں پر جو مشکلیں اور مصیبتیں آتی ہیں وہ گناہ گاروں سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ آپ انبیاء کی سیرت کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجیے۔ اُن کی زندگی دُنیاوی لحاظ سے بہت مشکل دکھائی دیتی ہے۔ دُنیاوی مال و زر اور آسائشوں کے حوالے سے ہمیشہ وہ تہی دامن تھے۔

مردِ مومن سے تو اب اس معاشرے میں شاید کوئی تبدیلی نہ آپائے لیکن ضربِ مومن سے تبدیلی کے امکانات موجود ہیں۔ لیکن آپ ہر حال میں اللہ سے بہتری کی اُمید رکھیے۔ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ بہتر ہی کرے گا۔

سوال: آپ نے بابا فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سدرۃ المنتہیٰ تک پرواز کی بات کی ہے۔ حضرت لعل شہباز قلندر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "شہباز کرے پرواز تے جانے راز دلاں دے۔" یہ کون سی پرواز ہے؟

جواب: جہاں تک بابا صاحب کی سدرۃ المنتہیٰ تک پرواز کا تعلق ہے تو وہ میرا کہنا نہیں بلکہ جناب خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی نے حضرت قطب الدین بختیار کاکی صاحب سے فرمایا تھا کہ تمھارے اس مرید کی پرواز سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔

ایک بہت بڑے سرجن کی Professional skills پر Comment (تبصرہ) کرنے کے لیے کسی شخص کا کم از کم ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونا تو ضروری ہے۔ جو شخص کبھی کمپوڈر تک نہیں رہا وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ فلاں شخص بہت اچھا سرجن ہے کیونکہ اُسے ادراک ہی نہیں کہ سرجری ہوتی کیا ہے۔ جناب میں تو کبھی کمپوڈر تک نہیں رہا تو کیسے کہہ سکتا ہوں کہ بابا صاحب کی پرواز سدرۃ المنتہیٰ تک تھی۔ یہ تو خواجہ غریب نواز صاحب نے فرمایا تھا اور میرا یہ ایمان ہے کہ خواجہ صاحب نے اگر یہ فرمایا ہے تو غلط نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک لعل شہباز صاحب کے بارے میں مذکورہ شعر کا تعلق ہے تو یہ دراصل شاعر کے تخیل کی پرواز ہے۔ ورنہ دلوں کے حال تو صرف رب تعالیٰ جانتا ہے۔ کیونکہ وہ عالم الغیب والشھادۃ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ستار بھی ہے۔ اب کوئی پوچھے کہ وہ ستار کیسے ہے۔ تو میں اسے یوں Explain کروں گا کہ رب ستار اس لیے ہے کیونکہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں دُنیا کی کوئی مشین یا کوئی شخص اُسے پڑھ نہیں سکتا۔ ہمارے ذہن میں جس قدر غلط خیال آتے ہیں وہ اگر دُنیا پر عیاں ہو جائیں تو وہ ہم سے دُور بھاگنے لگے۔ لیکن رب نے ہمارے غلط خیالات اور غلط سوچ کو لوگوں سے چھپا کر ہمارا بھرم قائم کر رکھا ہے۔ اسی طرح کوئی یہ نہیں جان سکتا کہ ہم گھر سے کیا کھا کر آئے ہیں۔ یوں اللہ ہماری غربت کو دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ میرے دل میں کیا ہے؟ میرے مستقبل کے بارے میں کیا Plans ہیں؟ اس سب کو بھی رب نے دوسروں سے چھپا رکھا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ ستار ہے کیونکہ اُس نے میری سوچ، میرے ارادوں، میرے دل کے حال، میرے کھانے غرض ہر چیز کو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کر کے میرا بھرم قائم رکھا ہے۔ جس چیز کو اللہ چھپانا چاہ رہا ہے اُس کو کون جان سکتا ہے۔ ہاں رب اگر کسی چیز کو اپنے کسی ولی پر عیاں کرنا چاہے تو کسی حد تک اُس پر اپنے کسی بندے کے معاملات کو ظاہر کر دیتا ہے۔ لیکن یہ سب اللہ کی مرضی کے ساتھ مشروط ہے۔ اللہ ستار ہے۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا اور ایسی کوئی بات اپنے ولی پر بھی عیاں نہیں کرے گا جس سے اُس کے بندے کی توہین ہوتی ہو یا اُس کا راز فاش ہوتا ہو یا اُس کی عزت پر حرف آتا ہو۔

(میں جناب لعل شہباز قلندر صاحب سے معذرت کے ساتھ یہ عرض کر رہا ہوں)

اس میں شک نہیں کہ لعل شہباز قلندر بہت اچھے بزرگ ہیں لیکن ہمیں اپنا عقیدہ درست رکھنے کے لیے یہ ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انسان کی حدود کہاں تک ہیں۔ ہمیں جان لینا چاہیے کہ ایک ولی اللہ بہر حال انسان ہوتا ہے۔

اولیاء اللہ اس لیے مستجاب الدعوات کہلاتے ہیں کیونکہ اُن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ لیکن میں یہاں واضح کردوں کہ اُن کی دعائیں بھی سو فیصد قبول نہیں ہوتیں۔ اُن کی زندگی میں بھی ایسا وقت آتا رہتا ہے جب ہر کام اُن کی دعا کے برعکس ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ اولیاء اللہ صاحب دعا تو ایک طرف صاحب امر بھی ہوتے ہیں۔ اللہ نے اُنھیں ایسا تصرف عطا کر رکھا ہوتا ہے کہ وہ زبان سے جو کچھ کہتے ہیں اللہ اُسے قبول فرماتا ہے۔ لیکن انہی صاحب امر و تصرف اولیا کی زندگی میں وہ Phases بھی آتا ہے کہ جو انھوں نے کہا اُس کے اُلٹ ہوا۔ تب وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ کل تک تو رب اتنا مہربان تھا کہ زبان سے نکلی ہر بات پوری کرتا تھا۔ اب کیا ہوا؟ لیکن پھر رفتہ رفتہ سمجھ آنے لگتی ہے کہ ایسا ہونا ہی صاحب امر ولی اللہ کے حق میں بہتر ہے۔ کیونکہ اگر ہمیشہ وہی ہونے لگے جو وہ زبان سے کہتا ہے تو اُس میں تکبر آ جائے گا وہ خود کو خدا سمجھنے لگے گا۔ یوں رب تعالیٰ اُسے جھٹکا دیتا ہے کہ دیکھو رب میں ہی ہوں...... تم میرے عاجز بندے ہو۔ میں جب چاہوں تمھاری خواہش کے برعکس کر سکتا ہوں۔ اسی طرح ولی اللہ کی زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہی لوگ جو کل تک اُسے جھک جھک کر سلام کرتے تھے اُس پر تھوکنے لگتے ہیں۔ ایسا صرف اس لیے ہوتا ہے تا کہ ولی اللہ کو تکبر سے محفوظ کر دیا جائے۔ یوں رب اپنے دوست کو تکبر کے اس راستے سے بچاتا ہے جو اُس کے علم اور تمام مقامات کو کھا سکتا ہے۔

ولی اللہ کے بارے میں کبھی اس خوش فہمی میں مت رہیے کہ وہ آپ کے دلوں کا حال جان لے گا۔ اُسے آپ کے دل کا حال صرف اُسی قدر معلوم ہوگا جس قدر اللہ چاہے گا۔ اس سے آگے اُس کی مجال نہیں۔ اُس کی دعا صرف وہیں تک قبول ہوگی جہاں تک رب چاہے گا۔ اس سے آگے اُس کی مجال نہیں کہ وہ آنکھ اُٹھا جائے۔ صاحب امر کی کہی بات اُسی وقت پوری ہوگی جب رب ایسا چاہے گا کیونکہ ولی اللہ، اللہ ہی کی رحمت سے صاحب امر، مستجاب الدعوات اور صاحب تصرف ہے اور رب جب چاہے اس سے وہ تصرف واپس لے سکتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ولی اللہ ایک عام انسان سے بھی زیادہ مجبور ہوتا ہے۔ اُس کی ذرا سی کوتاہی کو اللہ کے ہاں فوراً گرفت میں آ جاتی ہے۔ جناب لعل شہباز قلندر کو اس شعر میں غیب دان کہا گیا ہے حالانکہ غیب دان تو صرف اور صرف رب کی ذات ہے اور رب کے بعد سب سے بڑے آپ ﷺ ہیں۔

؎ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یوں مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں

سوال: ہمارے معاملات کیسے بہتر ہو سکتے ہیں؟

جواب: جس روز اسلام کے بارے میں ہمارے Concepts (تصورات) واضح ہو گئے، معاملات بہتر ہو جائیں گے۔ اسلام میں عبادات اور معاملات دو مختلف Compartments نہیں ہیں۔ اسلام تو ایک Single unit ہے۔ جس میں عبادات ہمیں عملی زندگی میں ایک بہتر انسان کے طور پر اپنے آپ کو ثابت کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں۔ ایسا بہتر انسان جس میں تحمل، درگزر، بُردباری اور ایثار و قربانی کا جذبہ بے پناہ ہوتا ہے۔ جب انسان اس سانچے میں ڈھل جاتا ہے تو اسلام دو Compartments میں تقسیم ہونے کی بجائے Single unit کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس کی ایک مثال یوں سمجھ لیجیے۔ نماز جو اسلام کا بنیادی رُکن ہے اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اصل نماز وہی ہے جو تمھیں بُرائیوں سے روکتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبادات کا اصل مقصد کیا ہے۔ بدقسمتی سے ہم عبادات کو دُنیا کے حصول کا ذریعہ بنا بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن اُتارا تھا تاکہ ہم جان جائیں کہ اللہ کا پسندیدہ راستہ کون سا ہے اور ہم دُنیاوی خواہشات کو دل سے نکال دیں تاکہ ہمارے دل اللہ کے حضور جھک جائیں۔ لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ وہ قرآن جو دُنیا کو ہمارے دل سے نکالنے کے لیے نازل کیا گیا تھا اُسی قرآن کو ہم نے دُنیا کے حصول کا ذریعہ بنا لیا۔ اللہ دُنیا کو حقیر ترین چیز گردانتا ہے۔ اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دُنیا کو ایک مری ہوئی گلی سڑی بکری کے بال سے بھی کم تر قرار دیتے ہیں اور ہم اسی دُنیا کے حصول کے لیے قرآن کو استعمال کرتے ہیں حالانکہ قرآن کی تعلیمات تو سراسر دُنیا کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

سوال: حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی عظمت کے بارے میں کچھ عرض کر دیجیے۔

جواب: بی بی صاحبہؓ کی عظمت کا اندازہ اُن کی اس ایک کرامت سے لگا لیجیے کہ ہر وہ غزوہ جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ بی بی صاحبہؓ کو اپنے ساتھ لے گئے اُس میں دشمن Total destruction (مکمل تباہی) میں گیا ہے۔ اس کی ایک بہترین مثال غزوۂ خندق ہے جس میں بی بی صاحبہؓ حضرت علیؓ کے خیمہ میں موجود رہیں اور اس غزوہ میں دشمنوں کا جو حال ہوا اُس سے آپ سب واقف ہیں۔ بی بی صاحبہؓ کی صرف غزوہ میں موجودگی کا یہ نتیجہ تھا تو اسی سے اندازہ لگا لیجیے کہ اُن کا مقام کتنا بلند ہے۔ میں تو اُن کے مقام کے پیشِ نظر اُن کا نام لینے کے لیے اپنی زبان کو ناپاک پاتا ہوں۔ آپ سے بھی گزارش ہے کہ بی بی صاحبہؓ کا نام لینے اور لکھنے سے گریز کیا کیجیے۔ زیادہ سے زیادہ بی بی صاحبہؓ کہہ لیا کیجیے۔ کم از کم میں تو اُن کا نام لینے کی بے ادبی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

حروفِ مقطعات کے اسرار اور قلندرانہ طرزِ حیات

حروف مقطعات کی تعداد 14 ہے اور ان سے شروع ہونے والی سورتوں کی تعداد 29 ہے۔ 29 کو اگر جمع کیا جائے تو اس کا ٹوٹل 11 آتا ہے اور 11 کو رُوحانیت میں Further single digit (مزید واحد ہندسہ) میں نہیں لے کر جاتے۔ یہ ایک جمع ایک (1+1) ہی کہلائے گا۔ یہ جو گیارہ کا ہندسہ ہے ایک اللہ تعالیٰ کا اور ایک آپ ﷺ کا۔ 1+1 کا مطلب ہے ایک بنانے والا...... اللہ تعالیٰ...... اور ایک بننے والا...... آپ ﷺ۔

اللہ تعالیٰ بھی اپنی ہستی میں یکتا ہے۔ مالکِ کُل اور خالقِ کُل ہے۔ اُسی نے سب تخلیق کیا اور وہ اپنی سب مخلوق کو پالتا ہے۔ ہم سب کا والی وارث ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ بھی اپنی ذات میں یکتا ہیں۔ آپ ﷺ رحمۃ اللعالمین اور امام الانبیا ہیں اور اللہ کے بعد سب سے بڑی ہستی ہیں۔ اسی لیے ایک جمع ایک ہی رہتا ہے۔ ایک جمع ایک دو نہیں ہوتے کیونکہ جمع کرنے سے دوئی پیدا ہوتی ہے یکجائی نہیں رہتی۔ رب تعالیٰ کو دوئی پسند نہیں وہ یکجائی کو پسند کرتا ہے۔

آپ ﷺ کو 29 القابات احکامات کی صورت شبِ معراج عطا کیے گئے تھے۔ یہ 29 القابات ایک طرح سے Law Book کا Code یا Key ہیں۔ جب تک ہم ان 29 احکامات پر عمل پیرا نہیں ہوتے ہم اُس Constitution (قانون) کو سمجھ نہیں سکیں گے جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے اور جب تک ہم قرآن پاک میں بیان کردہ قانون کو نہیں سمجھیں گے ہم قربِ الٰہی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یوں ان 29 احکامات کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

حروف مقطعات کو ہم مخفی کہتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہیں ہی مخفی۔ لیکن اُن کے تحت آنے والی چیزوں کو ضرور بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ مخفی نہیں ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم سمجھنے لگیں گے کہ حروف مقطعات درحقیقت ہم سے Demand (مطالبہ) کیا کرتے ہیں۔ اگر اُس پر ہم نے عمل کر لیا تو پھر رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہم ان حروف مقطعات کے اسرار سمجھنے لگتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا تھا کہ "اللہ" سے مراد کیا ہے۔

ا = اللہ

ل = لا یعنی نفی

م = آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم ذات

"ا" "اللہ" کے لیے Stand کرتا ہے۔ اللہ جو پروردگار اور رب ہے سب کا...... جو ہدایت عطا کرتا ہے۔

تمام عالم اور کل کائنات اس کی تخلیق کردہ ہے۔

"ل" "لا" کے لیے Stand کرتا ہے اور "لا" عربی میں نفی کو کہتے ہیں۔

1۔ حروف مقطعات سے شروع ہونے حروف ابجد دُنیا میں ایک ارب اور غالباً 18 کروڑ ہیں۔

2۔ حروف مقطعات میں دو حروف نقطے والے ہیں۔ اُن سے جو حروف مرکب کی صورت میں بنتے ہیں اُن کی تعداد 87 ارب 81 کروڑ سے زیادہ ہے۔

اگر ہم نمبر 1 سے نمبر 2 کی رقم منہا کریں تو جواب نفی میں آ جائے گا۔ اگر چھوٹی رقم میں سے بڑی رقم کی نفی کریں تو جواب نفی میں آتا ہے اور مارجن (Margin) بہت لمبا ہو جائے گا۔ کوئی پونے ستاسی (87) ارب حروف کا فرق بنتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نفی کا ذکر زیادہ Powerful (طاقت ور) ہے۔ ویسے بھی اسلام کی بنیاد نفی پر ہے۔ اسلام کی ابتدا ہی نفی سے ہوتی ہے۔ مسلمان ہونے کے لیے پہلا کلمہ پڑھنا ضروری ہے اور اس کلمہ کی ابتدا "لا" سے ہے۔ جب کوئی بھی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے گزشتہ تمام عقائد کی نفی کرتا ہے۔ لا الہ الا اللہ۔

اس کے بعد اثبات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں اپنے احکامات کی پیروی پر Emphasise کیا ہے وہاں ان احکامات کی ابتدا عموماً نفی سے کی ہے۔ مثلاً نہیں ہے کوئی نیکوکار..........

گویا نفی ذکر میں بہت Powerful ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہم قلب پر اثبات اور نفی کی ضرب لگاتے ہیں۔ جب ہم نفی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہمارے نفس کی Negation (نفی) ہوتی ہے۔ انسان نفس اور شیطان کے شر سے محفوظ ہو جاتا ہے اور ہماری رُوح لطیف ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں ہماری رُوح لطیف ہوتی ہے توں توں رُوح کی پرواز بلند ہونے لگتی ہے۔ جتنی رُوح کی پرواز بلند ہوتی ہے اُسی قدر مشاہدات زیادہ اور علم وسیع ہونے لگتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ نے بڑی خوب صورت بات کہی تھی کہ

"........ تعالیٰ سے مانوس ہو جاتا ہے۔"

اسی بات کو نئے پیرائے میں جناب حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے فرمایا۔

''فقیر پر لازم ہے کہ وہ خلقِ خدا سے دُور رہے۔ وہ کم سے کم لوگوں سے میل جول رکھے۔''

یوں تمام فقیر خلق سے گھبراتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ نہیں کہ اُنھیں مخلوق سے پیار نہیں ہوتا۔ خلقِ خدا سے پیار کیے بغیر کوئی شخص ولایت کے درجہ تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ خلقِ خدا سے پیار اور اُن کا ہمدرد ہونا ولایت کے Prerequisites میں سے ہے۔ لیکن ولایت کے حصول کے بعد اس میں آگے جانے کے لیے ضروری ہے کہ فقیر غور و فکر پر زور دے۔ فقیر ہر وقت غور و فکر میں ڈوبا رہنا چاہتا ہے۔

اگر وہ خلقِ خدا سے زیادہ میل جول رکھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اُسے غور و فکر کے لیے فرصت نہیں ملے گی بلکہ لوگوں سے زیادہ میل جول کے نتیجہ میں جو اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ مسائل اُس کے ذہن پر حاوی ہونے لگتے ہیں اور اُس کے استغراق میں کمی ہونے لگتی ہے۔ جوں ہی استغراق میں کمی آئے گی غور و فکر کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور وہ نئے نکتے نہیں نکال سکے گا۔ ان کو سلجھانے کے نتیجے میں حاصل ہونے والے علم سے محروم رہ جائے گا۔ یوں فقیر خلقِ خدا سے دُور بھاگتا ہے۔ اُسے خلقِ خدا سے پیار ہے۔ اُس کے دِل میں لوگوں کے لیے ہمدردی بھی ہے۔ لوگوں کے لیے وہ قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ لیکن وہ تنہائی کا خوگر ہے کیونکہ وہ علم کے راستے پر بڑھنا چاہتا ہے اور غور و فکر کرنا چاہتا ہے تا کہ اسرارِ قدرت اُس پر منکشف ہونے لگیں۔

''م''۔ الٓمٓ میں تیسرا حرف ''م'' ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ ذات کو ظاہر کرتا ہے۔ رب تک پہنچنے اور اسلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی ہو جائیں۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجیں اور انسان کسی بھی شخص کا زیادہ ذکر اُس وقت کرتا ہے جب اُسے اُس سے پیار ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ ذکر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ پیار ہو تا کہ ہمارا دِل خود بخود چاہے کہ ایسی ہستی جس سے ہم پیار کرتے ہیں اُس کا ذکر بار بار کریں۔ جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح معنوں میں پیار کریں گے تو ہمیں جستجو ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا پیغام کیا تھا۔ کیونکہ جب ہم کسی ہستی سے پیار کرتے ہیں تو اُس کے پیغام کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ جب ہم اسلام کو کرید کرید کر اُس کی گہرائیوں تک پہنچیں گے اور جب ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ پیار ہوگا تب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل اور سنت کی پیروی کرنا چاہیں گے۔ کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس سے پیار کرتا ہے اُس کی نقل کرتا ہے۔ جس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ حیات کی نقل کر لی خواہ جزوی طور پر ہی کی وہ رب کے قریب ہو گیا اور فلاح پا گیا۔ رب تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے پناہ ذکر ضروری ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت کی ضرورت ہے۔

''ر''۔ یہ حرف مقطعات بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا سچا پیغام لے کر

آئے۔ آپ ﷺ کا یہ ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ آپ ﷺ نے ہم تک لفظ بہ لفظ وہ پیغام بالکل اسی طرح پہنچایا جس طرح آپ ﷺ تک آیا تھا۔ اس احسان شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ پر ہر وقت درود بھیجتے رہیں۔

''ک''۔ یہ حرف کل کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کل کائنات کے لیے کامل کل نبی بھی ہیں اور کلیتاً رحمۃ اللعالمین بھی ہیں۔

''و'' حصہ ہے لفظ ''ہم'' کا۔ لفظ ''ہم'' آپ ﷺ کے قریبی ساتھیوں اور صحابہؓ کے لیے استعمال ہوا ہے رُوحانیت اور حروف مقطعات میں۔ وہ صحابہ کرام جنھوں نے اپنا وقت آپ ﷺ کے ساتھ گزارا...... بہت بلند پایہ ہستیاں ہیں۔ ان صحابہ کرامؓ کے ارشادات اور نقش قدم پر چلنا ہمارے لیے باعث نجات ہوگا۔

''ی''۔ یہ ''یوم حساب'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایسا دن جب ہمارے نامۂ اعمال ہمارے ہاتھ میں دے دیے جائیں گے اور ہم پشیمان ہوں گے کہ آج ہمیں اللہ اور آپ ﷺ کے سامنے شرمندگی کا سامنا ہے۔ اُس روز ہماری چرب زبانی اور ذہانت ہمارے کام نہیں آئے گی کیونکہ ہمارے اعضا ہمارے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم دُنیا میں کیا کرتے رہے۔ اس سے بچت کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ ﷺ کی پیروی کر لی جائے۔ ہر وہ آدمی جو آپ ﷺ کی پیروی کرتا ہے وہ یوم حساب اللہ کے سامنے شرمندہ نہیں ہوگا۔

ہم آج کل ایک غلطی کرتے ہیں کہ دین اور دُنیا کو دو علیحدہ Compartments میں رکھ کر Deal کرتے ہیں۔ گویا ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ اسلام ایسا دین ہے جہاں ہم اپنی گھریلو سوشل لائف اور Rituals کو علیحدہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور Inter-faced ہیں۔

لہٰذا یہ سمجھنا کہ میں Rituals تو پورے کر رہا ہوں۔ دین کا عبادت والا حصہ Follow کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ دُنیا کو بھی دُنیاوی طریقوں سے Deal کر رہا ہوں۔ اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں کیونکہ یہاں دُنیاوی زندگی بھی دین کے تابع ہے۔ میں لاکھ عبادات کرتا رہوں۔ اگر میں کم تولتا ہوں، جھوٹ بول کر اشیا بیچتا ہوں تو مجھے میری عبادات کے باعث معاف نہیں کیا جائے گا۔ مجھ پر گرفت ہوگی۔ اس کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ نماز جو بنیادی ارکان اسلام میں سب سے اہم رُکن ہے اور قیامت کے روز سب سے پہلے اسی کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے گی۔ اس کے بارے میں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ''نماز بُرائیوں سے روکتی ہے۔'' (سورۃ العنکبوت: 45) اگر کوئی شخص واقعی نماز قائم کیے ہوئے ہے تو وہ بُرائیوں کی طرف نہیں جائے گا۔

اسلام میں دین اور دُنیا علیحدہ نہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کی Continuity ہیں۔ لہٰذا یوم حساب میں جب نامۂ اعمال ہمارے ہاتھ میں آئے گا اور تب ہونے والی پشیمانی بے حساب ہوگی۔ اس کا مداوا ہم نہ کر پائیں گے اور وہ وقت واپس نہیں لا سکیں گے کہ ہم دُنیا میں جا کر اپنے اعمال کو ٹھیک کر لیں۔

یہ جو میں اکثر کہتا ہوں کہ ہمارے لیے دُنیا کی زندگی آخرت کی زندگی سے زیادہ اہم ہے کیونکہ ہماری آخرت کی زندگی کا دارومدار ہے ہماری دُنیاوی زندگی پر..... ہم نے یہ زندگی کیسی گزاری؟ یہی چیز ہماری آخرت کی زندگی کا فیصلہ کرے گی۔ اگر ہم نے گناہوں میں ڈوب کر یہ زندگی گزار دی تو ہماری اُخروی زندگی کوئی زیادہ قابلِ رشک نہیں ہوگی۔ اس لیے یہ دُنیاوی زندگی زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ ہماری آخرت کی زندگی کو بنیاد فراہم کرتی ہے۔

''ع''۔ یہ حرف انسان کے ''عبد'' ہونے اور ''عاجزی'' کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان اللہ کا بندہ ہے اور بندگی و عاجزی اختیار کر کے وہ فرشتوں سے آگے نکل جاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ ''عجز'' میں ہی عظمت ہے۔ جو شخص لوگوں کے لیے Footmat بن گیا رب تعالیٰ نے اُسے لوگوں کے سر کا Hat بنا دیا ہے۔

ہم..... کم از کم میں آج تک نہیں سمجھ پایا کہ حقیقی عزت کیا ہے؟ حقیقی عزت کا اندازہ ہمیں اس بات سے ہو جائے گا کہ ہمارے علاقہ کا پولیس آفیسر اگر سخت اور جابر ہے تو علاقے کے لوگ اُس سے پناہ مانگنے لگیں گے اور ڈرنے لگیں گے۔ وہ اُسے تعظیم دیں گے۔ سلام کریں گے۔ لیکن جیسے ہی وہ آگے جائے گا لوگ اُسے مختلف ناگوار ناموں سے پکاریں گے۔ حالانکہ اُس کی موجودگی میں ہر شخص اُسے سلام کرتا ہے۔ اس کے برعکس لاہور میں ایک صاحب آرام فرما ہیں جن کے وصال کو 960 سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی ملک کے وزیرِ اعظم اور صدر بھی وہاں اتنی تعظیم سے آتے ہیں کہ احتراماً مزار کی طرف پشت نہیں کرتے۔ ان بزرگوں کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو ساری زندگی لوگوں کے جوتے سیدھے کرتے رہے۔ تو وہی بات ہے کہ لوگوں کے لیے Footmat بننے والوں کو رب لوگوں کے سر کا Hat بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بڑے سے بڑے بادشاہ کے ہاں دس ہزار آدمیوں کو روزانہ کھانا کھلانا مشکل ہے لیکن ان بزرگ کے ہاں روزانہ دس ہزار لوگ کھانا کھاتے ہیں۔ تو یہ عاجزی کا ثمر ہے۔ ان بزرگانِ دین نے عاجزی اختیار کی اور یہ عزت پائی۔

اگر کوئی شخص آئے اور مجھے یہاں آپ کے سامنے گالیاں دیتا رہے۔ میں اُن بُرے الفاظ کے جواب میں خاموش رہوں اور مسکرا کر سخت الفاظ سنتا رہوں۔ جب وہ شخص جانے لگے تو میں مسکرا کر کہوں آپ تشریف رکھیے، چائے پیجیے۔ لیکن وہ شخص گالیاں دیتا ہوا چلا جائے۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ کسے بُرا کہیں گے مجھے یا اُس شخص کو جو گالیاں دیتا چلا گیا۔ ہم یہ کیا کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہمیں اچھے الفاظ نہیں کہتا تو ہم پلٹ کر اُس سے بھی زیادہ سخت الفاظ اُسے کہہ دیتے ہیں کہ اُس نے ہماری بے عزتی کی۔ حالانکہ بے عزتی اُس کی نہیں ہوتی جو تحمل سے سخت الفاظ سنتا اور مسکراتا رہے۔ بُرا تو وہ شخص بنا جس نے آپ کو گالیاں دیں۔ تو یہ عزت کا Concept ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تحمل اور بُردباری سنت ہے۔ آپ ﷺ کا تمام کردار انتہائی اعلیٰ ہے۔ ایسی بلندی پر ہے جس تک کوئی دوسرا انسان نہیں پہنچ سکتا اور ان اعلیٰ صفات میں بہت نمایاں تحمل اور بُردباری ہے۔

جب ہم تحمل اور بُردباری اختیار کرتے ہیں تو گویا ہم آپ ﷺ کی سنت پر عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ یاد

رکھیے کہ فقر میں غصہ حرام ہے۔ تحمل و بُردباری لازم ہے۔ اگر کوئی فقیر غصہ کی حالت میں نظر آئے تو یقین کر لیجیے
کہ وہ غصہ ظاہری ہے۔ کسی مصلحت کے تحت ہے کیونکہ فقیر غصہ صرف Pose کر رہا ہوتا ہے۔ دل سے بھی
غصہ نہیں کرتا۔

''ص''۔ یہ حرف مقطعات ''صلوٰۃ'' کے لیے استعمال ہوا ہے اور اللہ کی صفت ''صمدیت'' کے لیے بھی
استعمال ہوا ہے۔ اللہ بے نیاز ہے تمام انسانوں سے، تمام حاجات سے۔ اُس کو کسی چیز کی حاجت نہیں۔ وہ تو
حاجات پوری کرتا ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا۔ اس لیے اپنی صفات کا ہلکا ہلکا عکس انسان میں رکھ
دیا...... سوائے ''رحمانیت'' اور ''ربوبیت'' کے۔ یہ دو چیزیں کسی انسان میں کبھی نہیں ہو سکتیں۔ باقی صفات کا
کچھ ہلکا سا عکس انسان میں کہیں نہ کہیں ملتا ضرور ہے۔ جو انسان اپنی دُنیاوی حاجات کی فکر بند کر دے اور لوگوں
کی محتاجی اختیار نہ کرے وہ اللہ کی صفت صمدیت کی پیروی کر رہا ہوتا ہے۔

یہ ''ص'' صلوٰۃ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جو آدمی نماز قائم کرتا ہے وہ اپنے رب کا ہو کر رہ جاتا
ہے۔ اُس کے دل سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے ''یا اللہ! مجھے اپنے علاوہ کسی کا محتاج نہ کرنا۔ مجھے صرف اپنی ذات کا
محتاج کر لے۔ اپنے بندوں کی محتاجی سے دُور رکھ۔'' یوں وہ اللہ کی صمدیت کا اقرار بھی کرتا ہے اور اس کو
برقرار بھی رکھتا ہے۔

''ط''۔ یہ حرف لفظ ''طاہر'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جس شخص نے اللہ کے قائم کردہ Parameters
کے مطابق زندگی گزاری، اللہ کے بتائے ہوئے Dos اور Do nots پر عمل کیا تو اُس کو پاکیزگی عطا کر دی گئی
اور جس کو پاکیزگی عطا ہو گئی اُس کے اعمال پاکیزہ و صالح ہو گئے۔ جس شخص کے اعمال پاکیزہ و صالح ہیں اُس
کا نامۂ اعمال صاف ستھرا ہو گا اور یومِ حساب اُسے شرمندگی نہیں ہو گی۔

''س'' حروف مقطعات میں یہ حرف بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ساجدین کے لیے استعمال ہوتا
ہے۔ اللہ سے ایک دعا کرتے رہا کیجیے کیوں کہ یہ دعا کرنا سنت ہے ''یا اللہ! ہمیں ساجدین، صابرین اور
شاکرین میں سے کر دے اور ہمیں قیامت کے روز صابرین، ساجدین، شاکرین اور مساکین میں سے
اُٹھانا۔''

آپ ﷺ رب تعالیٰ سے ہمیشہ یہی دعا کرتے رہے کہ یا باری تعالیٰ! مجھے روزِ قیامت مساکین میں
سے اُٹھانا[2]۔ کیونکہ اس کا تعلق صبر سے ہے۔ شاید اس لیے اس حرف کو روحانیت میں بلند مقام حاصل ہے۔

''ق''۔ یہ حرف قیامت، قہر اور قلب کو ظاہر کرتا ہے۔ جو شخص روزِ قیامت کے حساب سے ڈرتا رہا۔ رب
تعالیٰ کے قہر سے ڈرتا رہا اور اُس نے علم حاصل کیا (قلب دراصل علم کی علامت ہے) وہ فلاح پا گیا اس دُنیا
میں بھی اور آخرت میں بھی۔ فلاح کا آسان ترین راستہ یہ ہے کہ انسان قیامت پر یقین رکھے اور اُس روز
ہونے والے حساب سے ڈرتا رہے۔ اللہ بے شک بے پناہ رحیم و کریم ہے اور اُس کی یہ صفت بہت Strong

ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی جس صفت کو سب سے زیادہ Exercise کرتا ہے وہ رحیم و کریم ہونے کی صفت ہے۔ لیکن ہمیں جہاں اُس کے رحیم و کریم ہونے کا یقین ہے اور ہم ہمیشہ اُس سے رحم و کرم کی توقع رکھتے ہیں وہاں ہم یہ نہ بھولیں کہ وہ قہار بھی ہے اور اُس کے قہر کی صفت سے ہم پناہ بھی مانگتے رہیں۔ جس نے اس صفت کو یاد رکھا اور علم حاصل کرنے کی تگ و دو میں بھی لگا رہا کہ یہ آپ ﷺ کا حکم ہے، وہ دُنیا و آخرت میں فلاح پا گیا۔

''ن''۔ اس سے مراد ''نہی'' ہے۔ اللہ نے جو کام کرنے کا حکم دیا ہے ہم اُس پر عمل کرتے رہیں اور جس سے منع کیا ہے اُس سے بچے رہیں۔

''ح''۔ یہ حرف اللہ کی جاری کردہ حدود کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ حدود بمعنی سزا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور حدود Parameters کے معنوں میں بھی ہے۔ اللہ سے انعام پانے اور اُس کے قہر سے بچنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ اُس کے قائم کردہ Parameters اور حدود کے اندر رہا جائے۔

حروف مقطعات کو بس اسی قدر بیان کر سکتا ہوں۔ ان کے اسرار نہیں کھول سکتا۔ ان کے اسرار کی Depth بہت ہے۔ کون سا انسان اسرار کی کون سی Depth تک جا سکتا ہے یہ Depend کرتا ہے کہ کوئی شخص رُوحانیت کے کس مقام پر ہے۔ جوں جوں رُوحانی مقام بڑھتے جاتے ہیں انسان ان اسرار کی Depth کو سمجھتا چلا جاتا ہے۔

اللہ سے اچھا گمان رکھیے کیونکہ وہ ویسا ہی ہے جیسا بندہ اُس کے بارے میں گمان کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ سے گمان یہی رکھنا چاہیے کہ وہ ہمیں علم عطا کر دے تو ہم اس کے اسرار سے خود ہی واقف ہو جائیں گے۔

حروف مقطعات کا یہ تو ایک پہلو ہے۔ دوسرے پہلو پر سرسری بات کر سکتا ہوں۔ ان حروف کو پڑھا بھی جاتا ہے۔ ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ طریقہ علیحدہ ہے۔ وقت علیحدہ ہے اور ان سے مرتب ہونے والے اثرات بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ پھر ان کی پرواز بھی اپنا جُدا جُدا مقام رکھتی ہے۔ مثلاً اگر کسی صاحب کو اُن کے مرشد صاحب نے اجازت دے دی کہ وہ ایک لفظ پڑھیں ''الم''۔ اب وہ صاحب کب وہ لفظ پڑھیں گے؟ کتنا عرصہ پڑھیں گے؟ کتنی تعداد میں پڑھیں گے؟ اور وقت گزرنے پر تعداد Reduce ہو کر کتنی رہ جائے گی یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جب آپ موٹر سائیکل یا گاڑی چلاتے ہیں تو شروع میں آپ Standstill کی حالت میں ایک جگہ کھڑے ہوتے ہیں۔ گاڑی کو Move کرائیں تو فرسٹ گیئر Apply کرتے ہیں۔ تب سپیڈ کم ہوتی ہے لیکن انجن زیادہ Revolution پر کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے پٹرول کی Consumption بہت High ہوتی ہے اور Heat بھی زیادہ پیدا ہو رہی ہوتی ہے۔ جونہی گاڑی ذرا سا Move کرتی ہے آپ فرسٹ سے سیکنڈ گیئر پر آ جاتے ہیں۔ سپیڈ بڑھتی ہے اور انجن کی رفتار نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ موٹر سائیکل یا کار سپیڈ پکڑتی ہے تو آپ تھرڈ گیئر میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔ وہاں سپیڈ مزید بڑھ جاتی اور انجن کی رفتار مزید کم ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ Top گیئر میں چلے جاتے ہیں جہاں انجن کم رفتار پر چل رہا ہوتا ہے اور سپیڈ (Speed) بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں Fuel کی Consumption بہت کم ہوتی ہے تو Speed کو Maintain کرنے

کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح پڑھائی کا دور جب تک مکمل نہیں ہوا ہوتا تو تعداد بہت ہوتی ہے۔ اس تعداد کی Calculation کے کئی Factors ہیں اور فارمولا Man to Man تبدیل ہو جائے گا۔ جب دور مکمل ہوتا ہے اور تعداد پوری ہو جاتی ہے تو ذکر کی تعداد ایک دم سے (Drastically) کم کر دی جاتی ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ انسان کے اُوپر اُٹھنے کی رفتار کم ہو جاتی ہے کیونکہ تب انسان کو صرف اپنے Level کو Maintain رکھنا ہوتا ہے۔ پھر اس کے دوسرے اعمال اس کو ترقی دیتے چلے جاتے ہیں۔

"الم" کی تعداد اور وقت بھی آپ کے مرشد آپ کو بتائیں اور اگر وہ آپ کو Suit کرتا ہو تو آپ کریں ورنہ جہاں اُس کے انعامات بہت سے ہیں وہاں مار بھی بہت پڑتی ہے۔

رُوحانیت یا ولایت کے دس درجے ہیں۔ "الم" کا ذکر کرنے والا شخص تیسرے درجے کا ولی بنتا ہے۔

"ص" کا ذکر آٹھویں درجے کا ولی بناتا ہے۔

سب سے زیادہ تیزی حرف "س" میں ہے۔ یہ ساجدین، صابرین اور شاکرین سے متعلق ہے اور اس کا تعلق براہِ راست صبر سے ہے۔ جو اولیائے کرام اس کا ورد کر کے ولایت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں وہ بہت اُونچا مقام پاتے ہیں۔ آپ اُنھیں بہت صابر پائیں گے اور اُن کے اندر قلندرانہ صفات کی جھلکیاں آپ دیکھیں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قلندرانہ صفات ہیں کیا؟

قلندر دراصل ایک اُسلوب کا نام ہے۔ ایسا اُسلوبِ زندگی جو کوئی ولی اللہ اختیار کرتا ہے جب وہ اس زندگی میں Perfect ہوتا ہے تو قلندر کہلاتا ہے۔ قلندرِ اعظم حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ جس نے حضرت علیؓ کی زندگی کی پیروی کی اور اُن کا اُسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں تھوڑا سا بھی کامیاب ہو گیا...... وہ قلندرانہ زندگی ہے اور جو شخص بہت زیادہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اُسلوبِ زندگی کو اپنا گیا وہ قلندر کہلایا۔

رُوحانیت میں ڈھائی قلندر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت علیؓ کی زندگی کو سو فیصد تو نہ اپنا سکے لیکن کافی حد تک اُس زندگی کو اُنھوں نے اختیار کر لیا کہ نہ کسی شے کے حصول کی خوشی نہ کسی چیز کے چھن جانے کا غم رہا۔ اپنی تمام خواہشات، ارادوں اور آرزوؤں کو اللہ کی خواہشات، ارادوں اور آرزوؤں کے ماتحت کر دیا۔ جو رب کی طرف سے عطا ہو گیا اُس پر شادیانے بجائے۔ اگر رب کی طرف سے میدانِ کربلا عطا ہو گیا تو سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس کو ہنستے کھیلتے ہوئے قبول کر لیا۔ اگر رب کی طرف سے یہ حکم مل گیا کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کو تیار کر کے میدانِ جنگ میں بھیج دیں اور خیمے کے باہر بیٹھ کر اپنی اولاد کو شہید ہوتا دیکھیں اور جب وہ شہید ہو جائیں تو اُنھیں ہنسی خوشی اپنے ہاتھوں سے وہاں سے اُٹھا لائیں تو اُنھوں نے یہ سب کر دکھایا...... یہ قلندرانہ صفات ہیں۔ رُوحانیت میں تین ہستیاں قلندر کہلائیں۔

1۔ حضرت شرف الدین بوعلی قلندر

2۔ حضرت لعل شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ

3۔ حضرت بی بی رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا

اس لیے "س" کا ورد کرنے والے لوگ ولایت میں بہت اُونچا مقام پاتے ہیں اور اُن میں قلندرانہ جھلکیاں ملتی ہیں۔

"ق" کے ذاکر بہت جلالی ہوتے ہیں۔ اس ذکر سے دُور رہیے۔ اس کا ذکر کرنے والے عموماً مجذوبیت کی طرف چلے جاتے ہیں۔ یہ بالکل اُسی طرح ہے کہ جس طرح جو لوگ "یا صمد" یا "اللہ الصمد" کا ذکر کرتے ہیں۔ (یا صمد اور اللہ الصمد دونوں کا مقام اور وزن ایک ہے۔) اس کے اثرات بہت تیزی سے اُن پر مرتب ہوتے ہیں۔

لیکن یاد رکھیے کہ جو لوگ اُس کا ذکر صحیح تعداد اور صحیح وقت میں کرتے ہیں وہ بے نیازی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کپڑوں سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اللہ انھیں بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی مرشد "الصمد" کا ذکر اس تعداد میں یا وقت میں نہیں دے گا جس کے اثرات اس ذکر یا ورد کے نتیجے میں اُسے ولایت تک لے جائیں۔

جس کا رب

سوال: ہم لوگ بیعت کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟ بیعت کے بغیر بھی تو مرشد کی نظر میں آسکتے ہیں۔ کیا بیعت کے ذریعے اپنے آپ کو اور مرشد کو ذمہ داری میں ڈالنا ضروری ہے؟

جواب: اصل میں جس طرح ہم عام زندگی میں ظاہر پر زیادہ زور دیتے ہیں اور کاسمیٹک چیزوں پر ہماری نظر زیادہ رہتی ہے اُسی طرح بیعت کے بارے میں ہمارے کچھ تصورات (Concepts) بن گئے ہیں کہ اگر بیعت ہونے کے لیے مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جائے اور کچھ رسمی کلمات بھی ادا کیے جائیں تب ہی بیعت ہوگی۔

دیکھنا یہ چاہیے کہ بیعت سے ہم حاصل کیا کرتے ہیں؟

بیعت کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ جس آدمی کے ہاتھ پر بیعت کی گئی ہے وہ اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ میں اپنے ہاتھ پر بیعت کرنے والے شخص کی تربیت اسلام اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق کروں گا۔ میں اپنے ہاتھ پر بیعت کرنے والے انسان کی تربیت اس انداز میں کروں گا کہ وہ اپنی زندگی شریعت کے مطابق ڈھال لے اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔

اسی طرح جو آدمی بیعت کر رہا ہے وہ اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ میں آج سے اپنے تمام پرانے غلط طور طریقے چھوڑ دوں گا اور اپنی زندگی اللہ کے احکامات کے مطابق ڈھال لوں گا۔ اس ضمن میں بیعت کرانے والے شخص کے احکامات کی میں تعمیل کروں گا۔ بیعت کا اصل مقصد یہی ہے۔

اگر یہ اقرار انسان نے زبان سے کیا ہے اور اُس کا دل اُس کا ساتھ نہیں دے رہا اور اقرار کے باوجود بیعت کرانے والے صاحب بیعت کرنے والے کی تربیت نہیں کر پا رہے اور نہ ہی بیعت کرنے والا اپنی زندگی تبدیل کر پا رہا ہے تو میرے خیال میں ایسی بیعت بے معنی ہوگی اور اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص زبان سے تو یہ الفاظ ادا نہ کرے لیکن دل میں ارادہ کرلے کہ میں آج سے اپنی سابقہ زندگی اور گزشتہ طور طریقوں کو ترک کر کے آئندہ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کروں گا اور مرشد کے احکامات کی آنکھیں بند کر کے تعمیل کروں گا تو بیعت کے بغیر بھی اس کی زندگی میں مثبت تبدیلی رونما ہونے لگے گی۔

اسی طرح بیعت لینے والے صاحب زبان سے تو نہیں کہتے لیکن دل میں تہیہ کرتے ہیں کہ میں اس صاحب کی زندگی کو اللہ کے فرمان کے مطابق ڈھال دوں گا۔

میرے خیال میں زبان سے کیے ہوئے اقرار کی نسبت دل میں کیا جانے والا ارادہ اور فیصلہ زیادہ پختہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ دیئے بغیر اور زبان سے اقرار کیے بغیر اگر ایسا کر لیا جائے تو میرے خیال میں بیعت کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

نماز کی نیت ہے...... اگر ایک شخص اس نیت سے اپنی جگہ سے اُٹھا ہے کہ میں ظہر کی نماز ادا کر لوں۔ وضو بھی اسی نیت سے کر رہا ہے تو اُس کا یہ سوچنا اور اس پر عمل کرنا ہی دراصل نیت ہو جائے گی۔ اب اگر وہ جانماز پر کھڑے ہو کر معروف طریقے سے نیت کے الفاظ ادا نہیں بھی کرتا تب بھی اُس کی نماز ہو جائے گی۔

اسی طرح بیعت کا معاملہ ہے۔ ظاہری الفاظ پر نہ جایئے اور اس بات پر بھی نہ جایئے کہ کسی شخص نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیعت کیا ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ دیکھئے کہ اگر آپ کسی شخص کے ہاں اس نیت اور ارادے کے تحت جا رہے ہیں کہ میں اُس شخص سے وہ سب سیکھوں گا جس پر عمل کر کے اللہ کے احکامات کے مطابق زندگی گزار سکوں اور وہ صاحب آپ کو تربیت دینے میں بخیلی بھی نہیں کر رہے تو آپ آزاد رہتے ہوئے بھی بیعت کے مزے لوٹ سکتے ہیں۔

باقی رہ گیا ''نام'' اور ''سلسلوں'' کا سوال۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ ان سلسلوں کا تو وجود تھا ہی نہیں...... صرف تصوف تھا۔ رُوحانیت ایک ہی قسم کی ہے۔ سلسلے دراصل عقیدت کے باعث وجود میں آ گئے۔ کسی صاحب کو ماننے والے اُن سے محبت کے باعث اُن کے نام کو اپنے نام کے ساتھ جوڑنے لگے یوں نقشبندیہ، سہروردیہ، قادریہ اور چشتیہ سلسلے وجود میں آ گئے۔

اس کے بعد ان سلسلوں کی مزید شاخیں نکلیں جیسے چشتیہ نظامیہ، چشتیہ صابریہ وغیرہ۔ یہ بھی سب عقیدت کے نتائج تھے۔ اب آپ بھی عقیدت کے باعث کسی شخص کا نام اپنے نام کے ساتھ لگانا چاہتے ہیں تو ضرور لگا لیجئے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ظاہرداری ہو جائے گی۔ تعلق دل سے ہوتا ہے۔ نام یا زبان سے قائم نہیں کیا جاتا۔

بالکل اسی طرح کہ جب ہم فرض عبادت کرتے ہیں تو اپنے نام کے ساتھ اُس فرض عبادت کا نام لگا لیتے ہیں۔ حج کیا تو لفظ ''حاجی'' نام کے ساتھ لگا لیا۔ یہ فرض کی ادائیگی کا ڈھنڈورا نہیں تو اور کیا ہے؟ حالانکہ فرض ادا کرتے ہوئے انسان کسی پر احسان نہیں کر رہا ہوتا بلکہ اپنی ذمہ داری پوری کر رہا ہوتا ہے۔

اگر کسی شخص کے ساتھ آپ کو عقیدت ہے پھر آپ اُس کا نام اپنے نام کے ساتھ جوڑیں یا نہ جوڑیں...... یہ اہم نہیں ہے۔ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ ہمارے دل میں اُس کی محبت اور عقیدت کی گہرائی کتنی ہے۔ بغیر اظہار کے بھی ہم اُس سے عقیدت اور محبت قائم کر سکتے ہیں اور ہم اُن کے احکامات پر عمل کر سکتے ہیں۔

سوال: عالم اسلام پر جب بھی آفت آئی کوئی عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، کوئی جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ یا کوئی داتا ہجویری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے آئے۔ آج کے مسلمانوں سے کیا خطا ہوگئی کہ موجودہ دور میں اُمت مسلمہ ذلیل ورُسوا ہورہی ہے لیکن نیل کے ساحل سے لے کرتا بخاک کاشغر کوئی مجاہد، کوئی بزرگ پردۂ ظاہر پر نظر نہیں آتا۔

جواب: اسلام کو زندہ، تازہ اور اپنی اصلی صورت میں قائم رکھنے کے لیے ایک بندوبست یہ رہا ہے کہ ہر صدی کے آخر میں ایک مجدد آتا ہے۔ سو سال کے عرصے میں اسلام پر Culture (ثقافت) اور Society (معاشرہ) کی وجہ سے جو گرد پڑ چکی ہوتی ہے اور اس کا رنگ گہنا چکا ہوتا ہے مجدد اس گرد کو جھاڑ کر اسلام کو دوبارہ اصل صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ یوں اُس کی تجدید ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے گاڑی پر گرد کی تہ جم جائے تو ڈرائیور اُس کو صاف کر دیتا ہے۔ گاڑی وہی رہتی ہے لیکن اُس کی چمک بحال ہو جاتی ہے۔

مجدد کا کام بھی ایسا ہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی Compulsions (مجبوریوں) اور رُسوم کے ساتھ کچھ چیزیں جب اسلام میں شامل ہونے لگتی ہیں تو مجدد آ کر انھیں صاف کر دیتا ہے۔ ہر ہزار سال بعد ایک مجدد کامل پیدا ہوتا ہے۔

اسلام کو آئے ہوئے جب 1000 سال ہوئے تھے تو شہنشاہ اکبر نے ایک نیا دین متعارف کروایا۔ حکومتی جبر کے باعث اُس کے خلاف زیادہ آوازیں نہ اُٹھ سکیں۔ تب اُس دور میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دُنیا میں آئے اور انھوں نے دینِ اکبری کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا اور یوں دینِ اسلام ایک بار پھر اصلی حالت میں رائج ہوگیا۔

اسی طرح ہر صدی کے بعد دوسرے لوگ آتے رہے، وقفہ زیادہ نہیں آیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ جتنے اہل اللہ اور اہلِ علم ہیں وہ اپنے آپ کو چھپاتے ہیں۔ اپنے علم کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ وہ کام آج بھی ہو رہا ہے۔ جن کے ذمہ یہ ڈیوٹی ہے وہ آج بھی اس کو کر رہے ہیں۔ یہ جو مسلمان آپ کو ذلیل ورُسوا ہوتے دکھائی دیتے ہیں اس کا تعلق قانونِ فطرت سے ہے۔ اس کا تعلق رُوحانیت سے نہیں ہے۔

قانونِ فطرت یہ ہے کہ جو کچھ بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ اس ضمن میں ایک بات یاد رکھیے۔ ایک حدیث موجود ہے کہ ''خلافِ فطرت دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔''

صاحبِ رُوحانیت کبھی خلافِ فطرت کام نہیں کرے گا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ مسلمان جھوٹ بولتے اور فریب کرتے رہیں، دھوکا دہی کی روش پر گامزن رہیں اور انھیں عزت بھی نصیب ہو جائے۔ یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہوگا۔

مسلمان جو کچھ کر رہا ہے اس کا نتیجہ اُسے مل رہا ہے۔ لیکن جو Will of Nature ہے۔ جو معاملات پس پردہ چل رہے اُن کا انجام یہ نہیں ہے بلکہ اُن کا انجام بہت اچھا ہے اور اس کے اثرات بھی انشاء اللہ عنقریب سامنے آجائیں گے۔ اگر ہم دُنیا میں باعزت ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اللہ کے حکم کردہ کاموں پر عمل کرنا ہوگا اور منع کردہ چیزوں سے اجتناب کرنا ہوگا۔ اس سے ظاہری دُنیا میں بھی انشاء اللہ حالات اچھے ہو

جائیں گے۔

سوال: انسانی عقل، دل اور دماغ میں سے نفس کا تعلق کس چیز سے ہے؟

جواب: یہ سب چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نفس کنٹرول کرتا ہے عقل، دماغ یا دل کو۔

نفس کیا ہے؟ اس کو آسان لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ انسانی خواہشات کا تعلق نفس سے ہے۔ یا "نفس اور انسانی خواہشات کا آپس میں تعلق ہے۔"

وہ خواہشات جن کا تعلق اللہ کی منع کردہ چیزوں سے ہے نفسانی خواہشات کہلاتی ہیں۔ جب کہ اللہ کے راستے پر لے جانے والی خواہشات "نیک خواہشات" کہلاتی ہیں۔

آسان لفظوں میں اس کو سمجھنے کے لیے یوں کہہ لیجیے کہ خواہشات ہی نفس ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اگر اللہ سے قریب ہونا چاہتے ہیں تو اپنے نفس کی خواہشات سے لڑیے اور ان کو ختم کر دیجیے۔ یہ نفسانی اور شیطانی خواہشات ہیں۔

باقی عقل، دل اور دماغ کا کام اپنی اپنی جگہ پر ہے اور مختلف ہے۔ سینہ کے ایک طرف ہمارا دل ہے اور دوسری طرف ہمارا نفس ہے۔ دل کے بالکل درمیان میں گہرائی میں ہماری رُوح بستی ہے جب کہ نفس کی گہرائی میں شیطان بستا ہے۔

یہ دونوں علیحدہ علیحدہ واقع ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ انسان کرتا یہ ہے کہ نفس کو لڑ لڑ کے ختم کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہاں سے کوئی خواہش نہیں اُبھرتی۔

دل کو عبادت کے ذریعے پالش کیا جاتا ہے اور چمکایا جاتا ہے حتیٰ کہ یہ آئینہ کی طرح شفاف بن جاتا ہے۔ نہ کوئی گرد، نہ بال...... بالکل صاف ستھرا آئینہ۔

عبادات سے دل کو صاف و شفاف کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ عبادات ایک ڈسٹر (Duster) کی مانند ہیں جس کو پکڑ کر ہم اپنے دل کو صاف کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ عبادت کے ذریعہ ہم اپنے دل کو ہر طرح کے کینہ، بغض اور حسد سے صاف کر لیتے ہیں۔ ان چیزوں کے نکل جانے کے بعد دل میں سب کے لیے محبت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

خلقِ خدا سے یہی محبت ہمیں اللہ سے محبت کی طرف لے جاتی ہے۔ ہم اللہ کی مخلوق سے پیار کرتے کرتے رب سے پیار کرنے لگتے ہیں۔ رب سے پیار کرنے کے نتیجے میں ہمیں رب مل جاتا ہے۔ لیکن اگر کینہ، حسد، بغض، دشمنی، غصہ اور نفرت دل میں ہوں تو مخلوق سے محبت نہیں ہوگی۔ اگر مخلوق سے محبت نہیں ہوگی تو اللہ سے بھی محبت نہ ہو پائے گی اور رب بھی نہیں ملے گا۔

اس لیے نفس سے لڑیے۔ جہاد کیجیے اور دل کو صاف کرتے رہیے کہ اس سے کینہ، حسد، غصہ اور دشمنی سب نکل جائے اور یہ پاک صاف ہو جائے تاکہ اس میں محبت رہ سکے۔ خلقِ خدا سے جی توڑ کر محبت کیجیے کیونکہ

یہ رب سے محبت کی طرف لے جائے گی۔

سوال: کیا عالمِ برزخ میں رُوح گہری نیند سوتی ہے اور اس انتظار میں رہتی ہے کہ رب کے حضور حساب کتاب کے لیے کب پیش ہونا ہے؟

کیا زندہ افراد خواب میں اپنے مرحوم والدین سے ملاقات کر سکتے ہیں؟

جواب: عالمِ برزخ دراصل ایک ٹرانزٹ کیمپ (Transit Camp) اور پڑاؤ ہے۔ جب یہ رُوح اپنے جسم سے آزاد ہو گئی جسم کے ختم ہو جانے سے تو وہ عالمِ برزخ میں پڑاؤ ڈال دیتی ہے اور وہاں Hibernation میں نہیں جاتی بلکہ ایکٹو (Active) رہتی ہے۔ یہیں سے تمام رُوحیں روزِ محشر اکٹھی ہوں گی اور حساب کتاب ہو جائے گا۔ چونکہ دُنیا میں انسان ایک محدود مدت کے لیے آیا ہے اور یومِ حساب کو ایک مقررہ وقت پر ہونا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ تمام انسانوں کی زندگی اُسی وقت ختم ہو جب یومِ حساب برپا ہو۔ اس طرح تو زمین کی آبادی بے پناہ ہو جائے گی اور وسائل کم پڑ جائیں گے اس سے توازن بگڑ جائے گا۔

ہر انسان وقتِ مقررہ پر اس دُنیا میں آتا ہے اور اعمال کرنے کے بعد وقتِ مقررہ پر رُخصت ہو جاتا ہے۔ لیکن رُوح کو چونکہ حساب دینا ہے کیونکہ وہ امر اور لافانی ہے۔ اس لیے وہ قائم رہتی ہے۔ اس کے ٹھہراؤ کے لیے اللہ نے عالمِ برزخ بنایا ہے اور وہ ٹرانزٹ کیمپ کا کام کر رہا ہے۔ تمام رُوحیں وہاں اکٹھی ہو رہی ہیں۔ وہاں سے وہ یومِ حساب اپنا حساب دیں گی اور اس کے بعد اپنے اعمال، اللہ کی رحمت اور اُس کے غفور و رحیم ہونے کے صدقے حساب کتاب کے بعد جو ٹھکانا اُن کا مقرر ہو گا وہاں چلی جائیں گی۔

اب آپ کا دوسرا سوال کہ کیا مرحوم والدین سے خواب میں ملاقات ممکن ہے؟

اس میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں۔ کوئی بس نہیں۔ جب اللہ چاہے گا خواب میں ملاقات ہو جائے گی انسان کے چاہنے سے یہ ممکن نہیں۔

اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بجائے مرحوم والدین سے خواب میں ملاقات کی خواہش کے، مناسب ہے کہ ہم روزانہ تلاوت کلام کے بعد مرحوم والدین کی رُوحوں کو اس کا ثواب بخش دیا کریں۔ کیونکہ انتقال کے بعد انسان کا عمل سے سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے وہ اپنے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ و ثواب شامل کرنے پر قادر نہیں رہتا۔

والدین کے ساتھ اظہارِ تشکر، اُن سب احسانات کے بدلے میں جو اُنھوں نے ہم پر کیے ہم ایک ہی طریقے سے کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہم اُن کی مغفرت کی دُعا کرتے رہیں۔ اگر اللہ نے ہمیں توفیق دی ہے تو ہم اُن کے نام سے کوئی صدقۂ جاریہ قائم کر دیں تاکہ اُس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچتا رہے اور ہمارے مرحوم والدین کو ثواب ملتا رہے۔

خواب میں ملاقات کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہو گا سوائے تسلی کے۔ والدین جو ساری زندگی ہمارے لیے قربانیاں دیتے رہے ہیں ہم اُن کے لیے کسی صدقۂ جاریہ کا انتظام کر دیں اور دعا کریں "اے اللہ اس کا

ثواب میرے مرحوم والدین کی رُوح کو بخش دے۔''

سوال: لوحِ محفوظ کیا ہے؟

جواب: لوحِ محفوظ کی رنگت ایک سفید موتی کی سی ہے جیسے نیچرل پرل (Natural Pearl) ہوتا ہے۔ اس کی اُوپری سطح تختے کی شکل کی ہے۔ اس کا طول و عرض اتنا ہے کہ وہ دُنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اس کے سب سے اُوپر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" درج ہے اور اس کے ساتھ ہی پروردگار کا اسمِ ذات ''اللہ'' لکھا ہے۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ پروردگار کو کوئی بھی کام کرنے کے لیے کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا۔ وہ تو صرف حکم دیتا ہے کہ ''ہو جا'' اور وہ ہو جاتا ہے۔

جب رب نے یہ دُنیا تخلیق فرمائی تو قلم کو حکم دیا کہ لوحِ محفوظ پر جہاں میرا نام لکھا ہے اُس کے برابر آپ ﷺ کا اسمِ ذات "محمد ﷺ" تحریر کر دو۔

قلم کانپ اُٹھا کہ اللہ کے نام کے ساتھ کوئی اور نام کیسے لکھا جا سکتا ہے اور اس خوف کے باعث وہ قلم شق ہو گیا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا ''کیا ہوا؟ تُو نے لکھا نہیں نام؟''

قلم نے دست بستہ عرض کیا ''یا باری تعالیٰ! تیرے برابر کسی کا نام آ جائے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

اللہ نے فرمایا ''میرے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا اسمِ ذات لکھ دیا جائے کیونکہ یہ میری احسن ترین تخلیق ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کے مقام اور احترام کا کل کائنات کو اندازہ ہو جائے اور کائنات کو یہ بھی پتا چل جائے کہ آپ ﷺ میرے محبوب ہیں۔''

یوں آپ ﷺ کا نام لوحِ محفوظ پر موجود ہے۔ اس کے بعد روزِ ازل سے ابد تک ہونے والے احکامات و واقعات درج ہیں۔

یہ جو آپ کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ کچھ اولیائے کرام لوحِ محفوظ کو پڑھ لیتے ہیں اور اس پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں تو یہ حالتِ کشف میں ہوتا ہے۔

حالتِ کشف درحقیقت اصطلاحی طور پر کسی شخص کے Time and Space (زمان و مکاں) سے Beyond (بالاتر) ہو جانے کا نام ہے۔ لفظی معنی کے اعتبار سے کشف سے مراد ''کسی چیز کا کھل جانا'' یا ''وا ہو جانا'' ہے۔ جب کہ اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اس قابل ہو جائے کہ رُکاوٹوں کے پار، زمانے کی حدود کے اس پار خواہ مستقبل ہو یا ماضی، اُس میں دیکھ سکے۔

ایک فقرہ کہا جاتا ہے کہ یہ صاحب Time and Space (زمان و مکاں) سے Beyond ہو گئے ہیں۔ اولیائے کرام کی ایک کثیر تعداد صاحبانِ کشف ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ اُن سے خوش ہو کر انھیں انعام کے

طور پر یہ صلاحیت عطا کرتا ہے کہ وہ زمانہ غیر موجود میں جھانک سکتے ہیں لیکن صرف اُسی قدر جس قدر رب اُن کو دکھانا چاہتا ہے۔

اولیا کے پاس اپنی کوئی طاقت، قدرت یا صلاحیت نہیں۔ یہ صرف اور صرف رب تعالیٰ کی اُس ولی اللہ پر عنایت اور مہربانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ایک خاص حد تک زمان و مکاں میں جھانکنے کی اجازت دی ہے۔ وہ عنایت اور مہربانی کسی بھی وقت Withdraw (واپس) ہو سکتی ہے۔ اِس لیے کوئی بھی فقیر یا ولی کبھی اپنی اس صلاحیت پر نازاں نہیں ہوتا۔

لہٰذا ایسے فقیر جو زمان و مکاں (Time and Space) سے Beyond چلے جاتے ہیں اور ایسے مقام پر چلے جاتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی مہربانی سے لوحِ محفوظ پر نظر ڈال لیتے ہیں اور اُسے پڑھ لیتے ہیں لیکن انھیں یہ الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی کو بتا سکیں کہ تمھارے لیے لوحِ محفوظ پر کیا لکھا ہے۔

لوحِ محفوظ پر لکھی چیزیں تبدیل بھی ہو جاتی ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُس فقیر کا قصہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی سوالی سے کہہ دیا تھا کہ تمھاری تقدیر میں اولاد نہیں جب کہ اُسی سوالی نے جب کسی فقیر سے دُعا کروائی تو رب نے اُسے صاحبِ اولاد کر دیا۔

اس واقعہ سے ہرگز یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ درویش یا فقیر کی بات کو رب نے اپنے پیغمبر کی بات پر یا الفاظ پر بلند کر دیا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لوحِ محفوظ پر نظر ڈالی تھی تو دیکھا کہ اُس شخص کی تقدیر میں اولاد نہیں ہے لیکن فقیر چونکہ عشقِ الٰہی میں گم تھا۔ اُس نے لوحِ محفوظ دیکھے بغیر دعا کر دی "یا باری تعالیٰ! یہ تیرا بندہ ہے۔ تو قادرِ مطلق ہے۔ ہر شے پر قادر ہے۔ تیرے اس بندے کو اولاد کی خواہش ہے تو اس کو صاحبِ اولاد کر دے۔"

رب بہت وضع دار اور حیا والا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی باتیں عام طور پر رد نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ کائنات کے نظام میں خلل نہ ڈال دیں۔ یوں رب نے اُس فقیر کی دُعا قبول کر لی اور اُس سوالی کو اولاد دے دی۔

بعد ازاں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سبب دریافت فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فلاں شخص کے پاس جا کر کہو کہ تمھارے رب نے تمھارے جسم سے گوشت کا ایک ٹکڑا مانگا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جا کر اُس شخص سے یہ کہا تو اُس نے سارے جسم کے مختلف حصوں سے گوشت کاٹ کر دے دیا کہ نہ جانے اللہ نے جسم کے کس حصے سے گوشت کا ٹکڑا طلب فرمایا تھا۔ تو یہ عشق کا عالم تھا۔

لوحِ محفوظ کو پڑھ کر کچھ درویش کہہ دیتے ہیں کہ تمھاری تقدیر میں یہ نہیں۔ دراصل وہ تقدیر کو لوحِ محفوظ پر پڑھ رہے ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں لوحِ محفوظ پر تقدیر کو پڑھنے کی بجائے اللہ کے ودود، وہاب، غنی اور رحیم و کریم ہونے پر تکیہ کیا جائے اور دُعا کی جائے "اے اللہ! مجھے وہ سب عطا فرما دے جو میرے بہترین مفاد میں ہے۔"

اللہ دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا ہے۔ اللہ کے رحیم و کریم ہونے کے صدقے مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہماری دعاؤں کو قبول فرمائے گا اور آزمائشوں کو ٹال دے گا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ہم ان کھیلوں میں نہ پڑیں بلکہ اللہ کے ساتھ ایک سیدھا سادہ سا رشتہ استوار کر لیں اور وہ رشتہ ہے آقا اور غلام کا۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ رب کے ساتھ یہ رشتہ سب سے اچھا ہے۔ صرف اور صرف ایک بات انسان سمجھ لے اور اُس پر عمل بھی کرلے کہ وہ میرا رب ہے اور میں اُس کا بندہ۔ وہ میرا آقا ہے اور میں اُس کا غلام۔

بحیثیت غلام مجھے اپنے آقا کا ہر حکم ماننا ہے اور بحیثیت آقا وہ ذمہ دار ہے میری ضروریات کا خیال رکھنے کا۔ بحیثیت غلام مجھے یہ چاہیے کہ میں صرف اور صرف اُس کا ہو جاؤں۔ جواب میں وہ میری تمام ذمہ داری قبول کرلے گا اور مجھے اپنا لے گا۔

حالانکہ اُس کی شانِ رحمانیت تو یہ ہے کہ وہ سرکشوں کو بھی پالتا ہے۔ جو اُس کے منکر ہیں اُن کو بھی پالتا ہے۔ اپنے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے والوں کو بھی پالتا ہے۔ وہ بالکل غیر مشروط طریقے پر دعاؤں کو سننے والا ہے۔ وہ منکروں اور مشرکوں کی دعائیں بھی سنتا، قبول کرتا اور پوری کرتا ہے۔ اُن کی بھی سنتا اور قبول کرتا ہے جو نافرمان ہیں۔

وہ اتنا بڑا ہے کہ فاسق و فاجروں کی دُعائیں بھی سنتا اور قبول کرتا ہے۔ اُس کا بندے کے ساتھ رحمانیت کا رشتہ تو ہے ہی کیونکہ وہ تو رحمٰن ہے۔ یہ تو اُس کی رحمٰن ہونے کی صفت ہے۔ لیکن میں اگر یہ یاد رکھ لوں کہ وہ میرا آقا ہے اور میں اُس کا غلام ہوں تو پھر اُس کے کسی بھی فیصلے، کسی عنایت، کسی مشیت پر میری اُنگلی نہیں اُٹھ سکتی۔ کیوں کہ وہ آقا اور میں غلام ہوں۔...... وہ آقا ہے جو چاہے کرے میں اُنگلی اُٹھانے کا مجاز نہیں۔ مجھے صرف اور صرف اپنا سر اُس کے ہر فیصلے پر جھکانا ہے۔ صرف اور صرف لبیک کہنا ہے۔ اس غلامی کے بعد پھر باقی کچھ بچتا نہیں۔ کیوں کہ جب میں اُس کی غلامی کرلوں گا تو پھر میں اپنی ضروریات کے لیے بھی اپنے آقا کے پاس ہی جاؤں گا۔ جو پریشانیاں اور مشکلات پیش آتی ہیں اُن کے حل کے لیے بھی میں اپنے آقا کے پاس ہی جاؤں گا۔ اُس سے کہوں گا کہ میرے پاس تو تیرے علاوہ کوئی ہے ہی نہیں۔ میں تیرا غلام ہوں۔ تو مجھ پر اپنی رحمت کردے اور میری مشکل کو حل کردے۔ مجھ پر رحم اور کرم فرما۔

چونکہ رب بہت زیادہ وضع دار اور حیادار ہے اس لیے یہ اُس کی وضع داری کے منافی ہے کہ وہ اپنے بندے، اپنے غلام کو اکیلا اور بے سہارا چھوڑ دے۔ وہ اپنے غلاموں کو ایسے پالتا ہے جیسا کہ پالنے کا حق ہے۔ وہ اپنے غلام کو ایسے عطا کرتا ہے جیسے عطا کرنے کا حق ہے۔ بس رشتہ آقا اور غلام کا ہونا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ! ہم سب کو توفیق دے کہ ہم رب تعالیٰ کے ساتھ آقا اور غلام کا رشتہ قائم کرلیں۔ (آمین)

مجاہدہ کی اہمیت

سوال: شیطان اللہ سے معافی کیوں نہیں مانگتا جب کہ اُسے معلوم بھی ہے کہ قیامت کا دن بھی آنا ہے، سزا و جزا بھی ہے۔ کیا اُسے خوف نہیں آتا؟

جواب: سورۂ بقرہ کی اگر شروع کی آیات (30-39) ہم پڑھیں تو اس میں وہ سارا قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں شیطان کے مردود ٹھہرائے جانے کا مرحلہ وار بیان ہے۔

شیطان جب فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا تو وہ اُن میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھا۔ لیکن جب اُس نے اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کی اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا تب وہ شیطان مردود قرار دے دیا گیا۔ یہ اُس کی غلطی کی سزا نہ تھی کیوں کہ غلطی تو حضرت آدم علیہ السلام نے بھی کی تھی۔

شیطان کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا کہا گیا لیکن اُس نے نہ کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کے قریب جانے سے روکا گیا لیکن وہ چلے گئے۔

غلطی دونوں سے ہوئی لیکن یہاں ایک فرق ہے حضرت آدم علیہ السلام نے غلطی کی معافی مانگی اور یوں راندۂ درگاہ ہونے سے بچ گئے جب کہ شیطان نے حکم عدولی بھی کی اور اس کے بعد تکبر بھی کیا۔

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 34 میں اس کے لیے "وَاسْتَکْبَرَ" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ حکم عدولی پر جب ابلیس کو شیطان بنا دیا گیا تب شیطان نے دو فرمائشیں کیں:۔

1۔ تاقیامت زندگی مانگی۔

2۔ نیک بندوں کو بہکانے کی اجازت مانگی۔

دونوں فرمائشیں پوری ہو گئیں اور اُسے زندگی اور اجازت مل گئی۔

تو شیطان جو تکبر میں ڈوبا ہے وہ بجائے معافی مانگنے اور گڑگڑانے کے اللہ سے تاقیامت زندگی مانگ رہا ہے تاکہ وہ اُس کے نیک بندوں کو بہکا سکے۔ اُسے روزِ قیامت اور سزا و جزا سے کیا واسطہ۔ اُس نے تو معافی کے بجائے اپنی دو آپشنز (Options) رکھ دیں۔ اسی لیے وہ معافی نہیں مانگ رہا کیونکہ وہ قیامت تک اپنی Options پر عمل کرنے پر مامور ہو چکا ہے۔

میں اکثر دہراتا رہتا ہوں کہ ہم دوسروں کی غیر موجودگی میں اُن کو اچھے الفاظ میں یاد کریں۔ اُن کی بُرائی نہ کریں۔ کوئی ایسا لفظ نہ کہیں جن سے وہ بدنام ہو جائیں یا لوگوں کی رائے اُن کے بارے میں خراب ہو جائے۔

اس حوالے سے ایک قصہ مجھے یاد آ گیا۔ 1999ء میں اشفاق احمد ٹیلی ویژن پر اپنے پروگرام میں یہ واقعہ سنا رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری ایک پھوپھی جن کو ہم بوا کہتے تھے کبھی کسی کو بُرا نہ کہتی تھیں۔ مجھے اور میرے کزن کو بڑی کرید تھی کہ باقی افرادِ خانہ کی طرح وہ دوسروں کی بُرائی کبھی کیوں نہیں کرتیں۔ ہم تمام کزنز (Cousins) نے فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی طریقے سے بوا کو کسی کی بُرائی پر اُکسایا جائے لیکن کوشش کے باوجود ہم کامیاب نہ ہو پائے۔ آخر کار ہمارے ایک کزن نے ایک طریقہ ڈھونڈ ہی لیا۔ سکول سے واپسی پر کھانا کھانے اور آرام کرنے کے بعد ہم "بوا" کے گھر چلے گئے۔ میرے اُس کزن نے کہا۔

"بوا! یہ شیطان بہت بُرا ہے۔ لوگوں کو نیکی کرنے سے روکتا ہے۔"

بجائے اُسے بُرا کہنے کے بوا بولیں۔ "ناں بچہ! شیطان تو بہت اچھا ہے۔ دیکھو اپنی ڈیوٹی کتنی جانفشانی سے سرانجام دے رہا ہے۔"

بات یہ ہے کہ شیطان کو اپنی ڈیوٹی کرنی ہے لیکن اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنہوں نے شیطان کے ساتھ نمٹنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے تلاش کر رکھے ہیں۔ اُنھوں نے شیطان کے ساتھ دوستی کی۔ دوستی سے مراد یہ نہیں کہ وہ شیطان کی راہ پر چل نکلے۔ بلکہ ہوا یہ کہ جب اُنھوں نے شیطان کے ساتھ دوستی کی تو شیطان نے اُنھیں بہکانا بند کر دیا۔ خود بڑے شاہ صاحب نے ایک بار کہا کہ "میں نے تو شیطان سے دوستی کر لی ہے۔"

تب میں بڑا حیران ہوا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟

وہ بولے..... "ہاں! شیطان سے دوستی کر لی اور وہ مجھ سے اتنا مایوس ہو گیا ہے کہ اب مجھے بہکا نہیں پا رہا۔"

لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے انسان کو بہت سی مشقتوں، ریاضتوں اور مجاہدوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

مجاہدہ کیا ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مجاہدہ کیا ہے؟

لفظ "مجاہدہ" "جہاد" سے نکلا ہے۔ جب انسان کسی بھی طریقے سے اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے، نفس کو اپنے قابو (Control) میں لے آتا ہے تو وہ طریقہ "مجاہدہ" کہلائے گا۔ لیکن یہ چیز یاد رکھیے کہ "چلّہ" اور "مجاہدہ" میں فرق ہے۔

جس شخص نے اپنی زندگی میں مجاہدہ نہیں کیا وہ ولایت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ پاتا۔ جب کوئی شخص اللہ کی راہ پر چلتا ہے۔ اللہ کا قرب اور اُس کی دوستی چاہتا ہے تو اُسے شروع میں مجاہدے کرنا پڑتے ہیں۔ یہ سب انسان

کے نفس کے خلاف ہوتے ہیں۔

ولایت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ایک ولی اللہ فرماتے ہیں۔

''میں نے اپنے نفس کے خلاف 12 سال مجاہدہ کیا اور اس سے اگلے 5 سال اپنے دل کو آئینہ کرنے کا مجاہدہ کیا۔ اپنے دل کو کینہ، حسد، بغض، لالچ، طمع اور غصہ سے اتنا صاف کر لیا کہ وہ آئینہ ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد میں نے دل کے اُس آئینہ میں دُنیا کا نظارہ کرنا چاہا۔ جب میں نے دل کے آئینہ میں دُنیا کا نظارہ کیا تو مجھے دُنیا تو نظر نہ آئی لیکن اپنے ظاہر کا زنار نظر آیا۔ تب اگلے 5 سال ایک بار پھر میں نے اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ کیا۔ جب 5 سال بعد دل پر نظر پڑی تو ظاہر کا زنار دوبارہ نظر آیا۔ پھر دو سال کا مجاہدہ کرنے کے بعد دل کے آئینہ پر نظر ڈالی تو مجھے اپنے دل کے آئینہ میں دُنیا کی مخلوق مردہ نظر آئی۔ تب اُس مردہ مخلوق کو دیکھ کر میں نے اُس پر چار تکبیریں پڑھیں۔''

اسی طرح ایک اور بزرگ حضرت ابو علی دقاق فرماتے ہیں۔

''تین گھاٹیاں چڑھے بغیر کوئی شخص ولایت کے راستے پر نہیں چل سکتا اور نہ ہی اللہ کے راستے پر چل سکتا ہے۔ وہ تین گھاٹیاں یہ ہیں۔

1۔ بغیر فاقہ کیے انسان کھائے نہیں یعنی بھوک کی شدت کے بغیر کھانا نہ کھائے۔

2۔ جب تک انسان نیند سے مغلوب نہ ہو جائے، نیند کے جھونکے نہ آئیں۔ تب تک وہ سوئے نہیں۔

3۔ بغیر کسی شدید ضرورت کے انسان بولے نہیں۔''

اب یہ جو پہلی گھاٹی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک بھوک بُری طرح ستانے نہ لگے تب تک انسان کھانا نہ کھائے۔

یاد رکھیے کہ بھرے پیٹ کے ساتھ نیند بہت آتی ہے۔ اگر انسان جسمانی طور پر نہ بھی سوئے تب بھی اُس کا ذہن سونے لگتا ہے۔ سوئے ہوئے ذہن کے ساتھ کی گئی عبادت میں یک سوئی نہیں آئے گی اور انسان غور و فکر میں غوطہ زن نہیں ہو سکے گا۔

یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اللہ کی راہ میں اور اُس کے قرب کے حصول کے راستے میں ابتدائی مقام یہ ہے کہ انسان بہت ذوق و شوق سے اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ ذوق و شوق سے عبادت کرتے کرتے وہ خالصتاً اللہ کی محبت میں عبادت کرنے لگتا ہے۔ پھر جب اللہ سے محبت ہو جاتی ہے تو یہ محبت اُسے اللہ کے حضور دوڑا کر لے جاتی ہے۔

اللہ کی ''محبت'' میں ڈوب کر عبادت کرتے کرتے انسان رب کے ''عشق'' میں ڈوب کر عبادت کرنے لگتا ہے۔ اور اللہ کے ''عشق'' میں ڈوب کر عبادت کرتے کرتے وہ اُس مقام پر آ جاتا ہے کہ حالت نماز میں

جسم میں پیوست تیر کھینچا تا ہے اور اُسے احساس تک نہیں ہوتا کہ تیر کھینچا جا چکا ہے۔

لہٰذا اگر ذہن ہی سویا پڑا ہے تو عبادات میں خشوع خضوع، شوق اور محبت کا فقدان ہوگا۔ اس کے برعکس ذوق وشوق اور محبت کے ساتھ کی گئی عبادات کے باعث انسان کے ذہن پر کارخانہ قدرت کے اسرار کھلنے لگتے ہیں۔

اس مقام پر اگر وہ غور وفکر نہ کرے تو آگے نہیں بڑھ سکتا۔ غور وفکر اللہ کے قرب کے راستے میں مشعل کا کام کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ذہن سویا ہو تو یہ سب ممکن نہیں۔

دوسری گھاٹی یہ ہے کہ جب تک انسان نیند سے مغلوب نہ ہو جائے نیند کے جھونکے نہ آنے لگیں تب تک وہ سوئے نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مومن کا سونا بھی عبادت ہے لیکن سونے کے بعد غور وفکر کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

اکثر لوگوں کو حیرت ہو رہی ہوگی کہ میں ''غور وفکر'' پر اتنا زور کیوں دے رہا ہوں۔ حالانکہ ہم نے تو فقیروں کو ایسا کرتے نہیں دیکھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہم فقیروں سے اُس وقت ملتے ہیں جب وہ ان تمام مراحل کو طے کر چکے ہوتے ہیں۔ فقیر ہمیں جب ملتا ہے تو وہ خدمت خلق اور تواضع میں مشغول ہوتا ہے۔

یہ بھی سنت ہے کہ آپ آنے والے سے اتنی محبت، توجہ اور مہربانی سے ملو کہ وہ یہ سمجھے کہ گویا وہی آپ کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔

فقیر کو دیکھ کر ہم سوچتے ہیں کہ یہ تو خدمت خلق اور تواضع میں اس قدر مصروف ہے اسے غور وفکر کا وقت کہاں ملتا ہوگا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقیر کو جب بھی وقت ملتا ہے وہ غور وفکر کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس لوگ بیٹھے ہیں۔ گفتگو کے دوران کوئی نکتہ آ گیا تو وہ وہاں بیٹھے بیٹھے غور وفکر میں ڈوب گیا۔ اب دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ فقیر ''حالتِ استغراق'' میں چلا گیا۔ لیکن حقیقتاً فقیر نکتہ پر غور کرتے کرتے آگے بڑھتا جا رہا ہے حتیٰ کہ وہ کسی نتیجہ پر جا پہنچے گا۔

چونکہ سونے سے غور وفکر کا یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اس لیے فقیر کم سے کم نیند لیتا ہے۔ محض اتنی کہ اس کے جسم کے تھکے ماندے اعضا کو آرام مل جائے کیونکہ تھکے ہوئے اعضا کے ساتھ عبادت میں یکسوئی پیدا نہیں ہوتی۔ یوں فقیر کم نیند لیتا ہے اور اس طرح اس کی عبادت کا سلسلہ بخوبی جاری رہتا ہے۔

تیسری گھاٹی یہ ہے کہ بغیر کسی شدید ضرورت کے انسان بولے نہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ انسان بس اتنا بولے جس سے کام چل جائے۔ باقی وقت خاموش رہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ جب انسان خاموش رہا۔ لوگوں کو سنتا رہا تو اُس کے اندر دانائی بڑھ گئی۔ وہ یوں کہ

بولنے والا شخص چونکہ اپنے علم، تجربہ اور مشاہدے کی بنیاد پر بات کر رہا ہے اور آپ اگر صبر و تحمل سے اُسے سن رہے ہیں تو اُس کا علم، تجربہ اور مشاہدہ آپ تک پہنچ رہا ہے۔ اس میں سے زیادہ تر باتیں ہو سکتا ہے آپ کے لیے پرانی ہوں لیکن کچھ باتیں آپ کے لیے ضروری ہوں گی۔ یوں سننے سے دراصل ہم اُس شخص سے کچھ نہ کچھ سیکھ رہے ہوتے ہیں۔

دانائی کے حصول اور اس میں اضافہ کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان جب بولتا نہیں تو وہ سوچتا زیادہ ہے۔ زیادہ سوچنے سے وژن (Vision) زیادہ Broad (وسیع) ہوتا ہے اور وژن وسیع ہونے سے ہم دور تک دیکھ سکتے ہیں۔ یوں کم بولنے سے دانائی اور علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

کم بولنے کا تیسرا فائدہ معاشرتی ہے۔ جو شخص بھی صابر سامع (Patient listener) ہوگا وہ اپنے ملنے والوں میں بہت ہر دل عزیز (Popular) ہوگا۔ جو شخص دوسروں کو سنتا ہے اُس سے سب خوش رہتے ہیں۔

اس گھاٹی کا چوتھا فائدہ بھی معاشرتی ہے۔

انسان عموماً اپنے الفاظ اور زبان کے ہاتھوں زیادہ پھنستا ہے۔ لہٰذا کم بولنے سے گلے شکوے اور جھگڑے کم ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیر بہت کم بولتا ہے۔

جناب حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ "مجاہدہ" کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"کوئی شخص ولایت کی راہ کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا جب تک وہ مجاہدہ نہ کرے اور جس شخص نے شروع عمر میں مجاہدوں کی مشقت برداشت کرلی وہ آخری عمر میں آرام پائے گا۔"

ایک اور بڑے عالم اور ولی اللہ فرماتے ہیں۔

مجاہدے کی چھ گھاٹیاں ہیں۔

1۔ جو شخص اللہ کی راہ پر چلا ہے اُسے چاہیے کہ وہ اپنے اُوپر نعمت کے دروازے بند کرلے اور سختی کا دروازہ اپنے اُوپر کھول لے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے دل میں جو خواہش آئے اُس کو پورا کرنے کی بجائے وہ اُسے رد کردے۔

میں نے اس ضمن میں ایک بار ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ ایک ولی اللہ کی بازار سے گزرتے ہوئے نظر حلوائی کی دُکان پر پڑی۔ وہاں موجود جلیبیاں دیکھ کر جی للچایا۔ چونکہ فقیر تھے لہٰذا جیب میں جلیبیاں خریدنے کے لیے رقم موجود نہ تھی۔ زیرِ تعمیر عمارت کے مالک کے پاس جا کر مزدوری کی درخواست کی اور یوں صبح سے شام تک اینٹیں ڈھو ڈھو کر اوپر کی منزل تک پہنچاتے رہے۔ شام کو اُجرت وصول کر کے حلوائی کی دُکان پر پہنچے اور ساری رقم کے عوض جلیبیاں خرید کر گھر آگئے۔ ابھی جلیبی منہ تک پہنچی تھی کہ اندر سے آواز آئی کہ یہ تو میں نفس کی پیروی کر رہا ہوں۔ یہ تو اُس کی خواہش تھی کہ میں جلیبیاں کھاؤں۔ اب اُن ولی اللہ نے نفس کو سزا دینے کی

خاطر یہ کیا کہ ایک ایک کر کے لفافہ سے جلیبی نکالتے ہونٹوں تک لے کر جاتے اور پھر اُسے کھانے کی بجائے نالی میں ڈال دیتے۔ اور اپنے نفس سے کہتے "لے اور کھا...... لے اور کھا۔"

یوں اُنھوں نے اپنے نفس کو سزا دی کہ صبح سے شام تک کی مشقت کے بعد کمائی جانے والی رقم سے خریدی گئی جلیبیاں نہ کھا کر نفس کی خواہش پوری نہیں کی۔

یہ ہے پہلی گھاٹی جس پر عمل کر کے فقیر نعمتوں کا دروازہ اپنے اُوپر بند کر لیتا ہے۔

2۔ دوسری گھاٹی یہ ہے کہ اپنے اُوپر عزت کا دروازہ بند کر دے اور ذلت کا دروازہ کھول لے۔

اب یہ ظاہری الفاظ تو بہت Deceptive (دھوکا دینے والے) ہیں۔ کیونکہ فقیر تو بے حد خود دار ہوتا ہے۔

مطلب دراصل یہ ہے کہ جو آدمی بھی اللہ کی راہ پر چلنا چاہتا ہے وہ پہلے تو دوسروں سے کہتا ہے۔ "ذرا ایک گلاس مجھے پانی تو پلا دینا۔" پھر وہ دوسروں کو خود پانی پلانا شروع کر دیتا ہے۔

پہلے وہ لوگوں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اُس کا جوتا سیدھا کر دیں گے لیکن پھر وہ خود لوگوں کے جوتے سیدھے کرنا شروع کر دے گا۔

پہلے لوگ اُس کے سامنے پلیٹیں سجاتے تھے۔ اب وہ اُن کے سامنے پلیٹیں سجانے لگے گا۔

پہلے وہ گالی دینے والوں کو قید کروا دیتا تھا بعد میں وہ اُنھیں دُعائیں دے گا کہ یہ سنت ہے۔

اگر کوئی اُس سے کام بھی کروائے اور جوتے بھی مارے تو وہ بجائے گلہ شکوہ کرنے کے اُسے ہنس کر، جھک کر سلام کرے گا اور شکریہ ادا کر کے چلا جائے گا۔

عزت کا دروازہ بند کرنے سے یہ مراد نہیں کہ وہ ایسے کام کرے جس سے ذلت و رُسوائی ہو بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان خدمت، عاجزی اور تحمل و بُردباری کو اپنا مزاج بنا لے۔

3۔ تیسری گھاٹی یہ ہے کہ انسان اپنے اُوپر نیند کا غلبہ نہ ہونے دے۔ نیند سے دُور رہے اور زیادہ سے زیادہ وقت بیداری میں گزارے۔ اس کی وضاحت تو پہلے ہو چکی۔

4۔ چوتھی گھاٹی یہ ہے کہ انسان آرام طلبی چھوڑ دے اور سخت کوشی کی طرف چلا جائے۔

5۔ پانچویں گھاٹی یہ ہے کہ انسان اپنے اُوپر دولت کا راستہ بند کر دے اور مفلسی کو خود پر طاری کر لے۔

انسان اکثر و بیشتر خوشحالی میں رب سے دُور ہو جاتا ہے۔ مفلسی میں وہ جس درد سے رب کو پکارتا ہے خوشحالی میں اس میں وہ شدت نہیں ہوتی۔ غربت میں اُٹھتے بیٹھتے وہ اپنے رب کو آواز دیتا ہے۔ خوشحالی میں وہ ایسا نہیں کرتا۔

اللہ کی راہ پر چلنے میں مفلسی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

تصوف اور ولایت کی راہ پر چلتے وقت سب سے پہلی ضرب سالک کے مالی معاملات پر پڑتی ہے۔

اب اللہ کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ خوش ہوتا ہے ہمیں مفلسی دے کر۔ لیکن جب تک انسان اُٹھتے بیٹھتے اپنے رب کو پکارے گا نہیں تو بات نہیں بنے گی۔ اسی لیے درویش مفلسی کو خود پر طاری کرتا ہے اور دولت کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

6۔ چھٹی گھاٹی یہ ہے کہ انسان اُمید کا راستہ ختم کر دے۔ مراد یہ ہے کہ جینے کی تمنا چھوڑ دے اور موت کا انتظار کرے۔

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی فقیر جینے کی تمنا کرے۔ جیسا کہ شروع میں عبادت کی مختلف Stages کا ذکر ہوا۔ جب انسان اللہ کے عشق میں مبتلا ہوا اور اُس میں ڈوب گیا تو پھر وہ ہر لمحہ یہ سوچتا ہے کہ میری ملاقات رب سے اپنے دوست سے کب ہوگی۔ جہاں اُسے کوئی اُمید نظر آتی ہے تو وہ خوش ہونے لگتا ہے کہ میری ملاقات میرے دوست کے ساتھ ہونے کو ہے۔

یہ چھٹی گھاٹی ہے جہاں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ فقیر موت کی تمنا تو نہیں کرتا کیونکہ رب نے اس سے منع فرمایا ہے لیکن وہ جینے کی تمنا ضرور چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب وہ وقت آئے کہ میں اس دُنیا سے رُخصت ہو کر اپنے رب سے ملاقات کر سکوں۔

عبادت میں ذوق وشوق کے ثمرات

سوال: کیا غیر اللہ سے دُعا کرنا شرک ہے؟ کیا مزار پر جا کر دُعا کرنا بھی شرک ہے؟ کیا کسی سے دُعا کے لیے کہا جاسکتا ہے؟ کیا یہ شرک تو نہیں؟

جواب: غیر اللہ سے دُعا کرنا شرک ہے لیکن مزارات پر جا کر رب تعالیٰ سے دُعا کرنے کو شرک نہیں کہا گیا۔ تھوڑا سا فرق ہے۔ جب ہم مزار پر جا کر صاحب مزار سے رفع مشکل اور حاجت روائی کے لیے کہتے ہیں تو وہ شرک ہے کیونکہ تب غیر اللہ کو مدد کے لیے کہہ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نے مزار پر جا کر فاتحہ خوانی کی اور اس کے بعد دُعا کی "یا باری تعالیٰ! تو اپنے رحمٰن و کریم اور غفور الرحیم ہونے کے صدقہ اور اس صاحب مزار اپنے پسندیدہ بندہ کے صدقہ میری مشکل دُور فرما دے۔" اس انداز میں دُعا کرنا شرک نہیں ہے۔ جب بھی کسی مزار پر جائیں تو صاحب مزار کے لیے فاتحہ خوانی کریں لیکن اپنی ضروریات و مشکل صرف اور صرف رب کے حضور پیش کریں اور رب تعالیٰ ہی سے اس مشکل کے دُور ہونے کی دُعا کریں۔

فاتحہ خوانی کی صورت جو کلام پاک ہم نے پڑھا اس کی برکت سے رب تعالیٰ دُعا سنتا اور پوری بھی کرتا ہے۔

جہاں تک سوال کے اس حصہ کا تعلق ہے کہ کیا کسی سے دُعا کے لیے کہا جاسکتا ہے اور کیا یہ شرک تو نہیں۔ تو یہ شرک نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے دوسروں سے دُعا کرنے کے لیے کہا ہے۔ خود آپ ﷺ نے حضرت اویس قرنیؓ کو پیغام بھجوایا تھا کہ میری اُمت کی بخشش کے لیے دُعا کریں۔ لہٰذا دوسروں کو دُعا کے لیے کہنا قطعاً شرک نہیں۔

سوال: آپ نے گزشتہ نشست میں فرمایا تھا کہ فقیری اور علم محض اوراد و وظائف سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے کچھ دیگر لوازمات ہونا ضروری ہیں۔ حالانکہ آپ کے مرشد صاحب نے ایک لفظ آپ کو بتایا تھا کشف وکرامات کے حصول کے لیے۔ یہ دونوں باتیں اکٹھی کیسے چلتی ہیں؟

جواب: میں آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں کہ فقر، معرفت، ولایت ...... یہ صرف اوراد و وظائف اور ذکر اذکار سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے وہ بات Clear کردوں جو آپ نے Quote کی ہے۔ وہ قصہ یوں تھا کہ میں نوجوانی کی ابتدا ہی سے چالیس پچاس وظائف صبح وشام پڑھتا تھا۔ لیکن اس

کے باوجود کہیں پہنچ نہ پایا تھا۔ ان وظائف کی برکات یقیناً مجھے حاصل ہو رہی ہوں گی لیکن علم کے راستے پر
میں چل نہ پایا تھا۔

آخر کار مرشد صاحب سے میری ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے سب سے پہلے مجھے ہر قسم کے اوراد و وظائف
اور ذکر اذکار پڑھنے سے منع کر دیا اور صرف نماز اور تلاوتِ کلام پاک کی تاکید کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انھوں
نے مجھے ایک لفظ پڑھنے کو دیا۔ مجھے چونکہ حصولِ علم کی لگن تھی۔ نوجوانی میں کشف و کرامات میں بھی بہت
Attraction نظر آتی تھی۔ اس لیے اُن سے پوچھا کہ اس لفظ کے پڑھنے سے کیا میں صاحبِ کشف و
کرامات، صاحبِ دُعا ہو جاؤں گا۔ تو وہ میرے ہر سوال کے جواب میں کہتے رہے ''ہو جائے گا''۔ اس
''ہو جائے گا'' کا مطلب دراصل کچھ اور تھا جس کی مجھے اُس وقت سمجھ نہیں آئی۔ یہ تو درحقیقت اُنھوں نے
میری راہ سیدھی کر کے مجھے اُس پر کھڑا کیا تھا کہ اس پر چلتے جاؤ...... مجھے بعد میں اس کی سمجھ آئی۔

ایک بار قبلہ مرشد صاحب نے فرمایا ''میاں! میں تمھاری اب اور کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ چونکہ تمھارا حصہ
میرے پاس تھا اس لیے تمہاری شکل تو بہت عرصہ پہلے مجھے دکھا دی گئی تھی۔ لیکن تم میرے پاس Late آئے
ہو۔ تمھارا حصہ میں نے تمھیں دے دیا ہے۔ اس پر عمل کرتے رہو گے اور محنت کرو گے تو کہیں پہنچ جاؤ گے ورنہ
یہیں کھڑے رہو گے۔''

ایک بار اور فرمایا:۔

''منتوں کا کیا ہے۔ منتیں تو میلے کپڑوں کے ڈھیر سے بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ تم تو
ہمارے نام کا ورد کرتے رہو تو منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ بلکہ ہم سے پیار کرتے رہو تو بھی
منزل پا لو گے۔''

میلے کپڑوں کے ڈھیر سے منتیں پوری ہونے کا مطلب تھا کہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یہ الفاظ اُنھوں
نے استعارہ کے طور پر استعمال کیے تھے۔ جس طرح ہم معمولی کام کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ کام تو چھ ماہ کا
بچہ بھی کر لے گا۔

ہم بہت متاثر ہو کر کہتے ہیں فلاں صاحب، صاحبِ دُعا ہیں۔ صاحبِ کشف و کرامات ہیں۔ اُن کی
دُعائیں فوراً قبول ہو جاتی ہیں...... یہ سب متاثر ہونے کی چیزیں نہیں ہیں۔

ہم لوگ سونے (Gold) سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اس Gold کو Gold کس نے بنایا؟ پارس
نے۔ تو پھر کیوں نہ متاثر پارس سے ہوا جائے نہ کہ Gold سے کہ پارس سے مَس ہونے والی چیز سونا ہو گئی۔
صاحبِ دُعا، صاحبِ کشف اور صاحبِ امر ہونے کی حیثیت تو Gold کی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ سب
جس سے وجود میں آیا وہ پارس ہے۔ لہٰذا اہمیت سونے کی نہیں پارس کی ہے۔

وہ شخص کسی سے کیا متاثر ہو گا جس نے کسی کو وہاں لا بٹھایا جہاں وہ صاحبِ دُعا، صاحبِ کشف و کرامات

اور صاحب امر ہو گیا۔ میلے کپڑوں کے ڈھیر سے مُتیں پوری ہونے سے یہی مراد ہے۔

میں لمبے عرصہ تک اپنے طور پر وظائف اور ذکر اذکار کرتا رہا لیکن اس کے باوجود کہیں پہنچ نہ پایا تھا لیکن قبلہ مرشد صاحب کے بتائے ہوئے لفظ سے کہیں ضرور پہنچ گیا۔

چار بیویوں والے شوہر کی طرح ابتدا میں میں بھی جس وظیفہ سے دل بھر جاتا اُسے چھوڑ کر کوئی اور وظیفہ شروع کر لیتا۔ حتیٰ کہ انا للہ وانا الیہ راجعون والا وظیفہ بھی میں نے کئی سال تک کر ڈالا۔

یہ سن 1966ء کا ذکر ہے۔ میں نے اپنے امام مسجد سے درخواست کی کہ وہ دوران قرأت قرآن کا وہ حصہ پڑھیں جس میں انا للہ وانا الیہ راجعون والی آیت بھی آتی ہے۔ کافی دن گزرنے کے باوجود انھوں نے دوران قرأت وہ حصہ تلاوت نہ کیا۔ استفسار پر پتا چلا کہ اُن کا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ نئے امام صاحب سے بھی میں نے یہی درخواست کی۔ اُنھوں نے کہا "یاد کر کے پڑھوں گا۔" ایک روز کہنے لگے "کل پڑھوں گا اس آیت پر مشتمل حصہ۔" لیکن اُسی رات اُن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ تیسرے امام صاحب سے میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تو خود میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ امام صاحب حیران ہوئے کہ آپ سورہ کا یہ حصہ کیوں سننا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ تب میں نے کہا "چھوڑیئے میں خود ہی پڑھ لوں گا۔" میں اس طرح کے کام کرتا رہا لیکن کہیں پہنچ نہ پایا۔

یہ قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب کی توجہ تھی۔ یہ کتابوں میں مذکور توجہ نہ تھی کہ نگاہ ڈالی اور سب بدل گیا۔ بلکہ یہ توجہ ایسی تھی کہ مثال کے طور پر آپ بھول بھلیوں میں اُلجھ کر اسلام آباد نہیں جا پاتے۔ کسی صاحب سے آپ کہتے ہیں کہ مجھے موٹروے پر پہنچنا ہے۔ وہ آپ کے آگے آگے گاڑی چلاتے ہوئے آپ کو موٹروے کے سٹارٹ (Start) پر پہنچا دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس راستہ پر ہو جائیں۔ 100 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے آپ سوا تین گھنٹے میں اسلام آباد پہنچ جائیں گے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ ان ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور سوا تین گھنٹے میں اسلام آباد پہنچ جاتے ہیں یا پھر آپ راستہ میں گوجرانوالہ یا کسی دوسرے شہر میں رُک جاتے ہیں اور اگلے دن اسلام آباد پہنچتے ہیں۔ آپ کے تاخیر سے پہنچنے میں اُس راہ نما (Guide) کا کوئی قصور نہیں۔ اُس کی ہدایات پر عمل کرتے تو ہم جلدی منزل پر پہنچ سکتے تھے۔ تاخیر کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔

مرشد بھی یہی کام کرتا ہے۔ وہ آپ کو راستہ دکھا دیتا ہے اور طریقہ بتا دیتا ہے کہ اس پر کیسے چلنا ہے۔ یہی کام میرے مرشد صاحب نے کیا تھا۔

اوراد و وظائف کا البتہ فائدہ یہ ہے کہ ان سے انسان میں عبادت کے سلسلے میں پابندی وقت کی عادت پختہ ہوتی ہے۔ اس کی یکسوئی (Concentration) بڑھتی ہے۔ انہماک میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان سب میں انہماک سب سے اہم ہے۔ اس کے بعد باقاعدگی (Regularity) اور پابندی وقت (Punctuality) دونوں بہت اہم ہیں۔

انسان کی Body chemistry کا تعلق براہ راست چاند سے ہے۔ جس طرح چاند کے دو Cycles ہیں..... چوبیس گھنٹے کا اور مہینہ بھر کا۔ یہ دونوں Cycles ہی انسان کی Body chemistry پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی دماغ کتنی تیزی سے کام کرتا ہے؟ کتنا Sharp ہے؟ اس کا تعلق زیادہ تر اس بات سے ہے کہ دماغ کی طرف آپ کی Blood circulation کتنی زیادہ ہے۔ جس قدر Blood circulation زیادہ ہوتی ہے۔ دماغ کو اتنی ہی زیادہ آکسیجن ملتی ہے اور وہ اتنا ہی زیادہ Sharp ہوتا ہے۔

اگر آپ اپنے جسم کا تجزیہ کریں اور دن میں ہر آدھے گھنٹے بعد اپنا بلڈ پریشر چیک کریں تو اس کی Reading کم زیادہ، کم زیادہ آتی رہے گی۔ ہفتہ بھر کا شیڈول بنا کر گراف بنالیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ دن کے ایک خاص حصہ میں Blood circulation بہت تیز ہو جاتی ہے اور بلڈ پریشر Top پر چلا جاتا ہے۔

سات دن کا Mean (اوسط) نکال لیجئے۔ یہ Highest point نکل آئے گا۔ یہی وہ وقت ہے جب Concentration point بھی سب سے زیادہ عروج پر ہوتا ہے اور انسان سب سے زیادہ Receptive ہوتا ہے۔ اُس وقت پڑھائی کی جائے تو زبردست اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ (یہاں پڑھائی سے مراد ذکر اذکار ہیں۔)

فقیر کا علم بغیر کسی Mathematical calculation کے اُسے بتا دیتا ہے کہ اُس کے پاس آنے والے آدمی کے لیے پڑھائی کا بہترین وقت کون سا ہے۔ اس لیے میں Punctuality پر زور دے رہا تھا۔ اگر ہم کوئی لفظ صبح پڑھیں تو اُس کے اثرات کچھ اور ہوں گے۔ دوپہر، شام یا رات میں پڑھیں تو اثرات فرق ہوں گے۔ انسان بھی وہی، تعداد بھی وہی، ذکر اذکار بھی وہی..... لیکن اثرات تبدیل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ Punctuality پر زور دیا جاتا ہے۔ اگر فقیر نے کہا کہ 11 بجے وظیفہ شروع کریں اور سہ پہر کے وقت ختم کر دیں تو اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔

Regularity (باقاعدگی) کی اس لیے اہمیت ہے کہ پتھر پر بھی مسلسل پانی پڑے تو اُس میں سوراخ ہو جاتا ہے۔ باقاعدگی سے ذکر اذکار کرنے سے اثرات ہماری Body chemistry پر پڑتے ہیں۔ ہمارے ذہن پر مرتب ہوتے ہیں اور اس کے Desired results (متوقع نتائج) ہمیں ملنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر ذکر اذکار یا وظائف میں باقاعدگی نہ ہو تو پڑھائی کا جو اثر ہمارے جسم اور ذہن پر مرتب ہو چکا ہوتا ہے نا، وہ ضائع ہو جاتا ہے اور نئے سرے سے ہمیں محنت کرنا پڑتی ہے۔ یوں سانپ اور سیڑھی والا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ جس طرح اس کھیل میں آہستہ آہستہ اُوپر چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ Destination (منزل) پر پہنچنے سے ذرا ہی پہلے سانپ کے منہ میں چلے جاتے ہیں اور یوں دوبارہ شروع میں زیرو پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح بے قاعدگی سے ثواب اور وقت کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ یوں ذکر اذکار میں Regularity اور Punctuality دونوں اہم ہیں۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ فقرا جو کام شروع کرتے ہیں اُس کو پورا اگر

کے ہی دم لیتے ہیں۔

اور اوووظائف سے ایک خاص قسم کا ڈسپلن، قوت برداشت اور مستقل مزاجی ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے۔

کامیابی کے لیے یہ تینوں خصوصیات بہت اہم ہیں۔

سوال: FaceBook پر توہین ناموسِ رسالت ﷺ روکنے کے لیے ہمیں کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟

جواب: میرے نظریات اس حوالے سے ذرا مختلف ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ کو پسند نہ آئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شخص کے لیے اُس کے والد صاحب بہت محترم ہیں۔ اگر اُس شخص کے بیٹے اعلیٰ تعلیم یافتہ، نیک ہیں، Independent اور طاقت ور ہیں تو محلہ میں کسی شخص کو یہ جرأت ہو ہی نہیں سکتی کہ اُس بوڑھے باپ کو ایک لفظ ہی کہہ دے یا اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے کھانس ہی لیں۔ لیکن اگر اس شخص کے بیٹے نکمے ہیں، لوگوں کے ساتھ فریب کرتے ہیں۔ اُدھار اور بھیک مانگ کر کھانا کھاتے ہیں تو ایسے شخص کے باپ کو جس کا جی چاہے گا بُرا بھلا کہے گا اور دھکے بھی مارے گا۔ آپ ﷺ کی ناموس 1.2 بلین مسلمانوں کی جانوں سے کہیں زیادہ قیمتی اور محترم ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک کمزور، نکمے، نکھٹو اور اخلاقی لحاظ سے کمزور مسلمانوں کے مجموعہ کی بات کون مانے گا۔

اگر Website کی Management اظہار رائے کی آزادی کا Motto اپنائے ہوئے ہے تو وہاں ہمیں بھی ٹھوس انداز میں اپنا احتجاج اور اظہار Record کرانا چاہیے۔ اگر بحیثیت مسلمان ہم مضبوط اور خوددار ہوں تو کسی کو ایسی جرأت نہیں ہوگی۔

پوری دُنیا میں یہودی تعداد میں دو کروڑ اور چند لاکھ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دُنیا کا ہر شخص اُن کی حمایت میں بولتا ہے۔ کوئی شخص اُن کی اخلاقیات اور یہودیت کے بارے میں رائے دینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ یہودیوں نے زمین کا ایک چھوٹا سا حصہ جوزبردستی قبضہ میں لے رکھا ہے، اس حوالے سے کوئی یہودیوں کے خلاف بات نہیں کرسکتا۔ وجہ یہی ہے کہ یہودی مضبوط بہت ہیں۔ وہ زبانی دھمکی نہیں دیتے لیکن انھوں نے سب کو ڈرا کر رکھا ہوا ہے۔

جب ہم مضبوط تھے تو تب بھی کسی کو ایسی جرأت نہ تھی۔ آج بھی اگر ہم ایسی ہی طاقت اکٹھی کرلیں تو کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ لیکن موجودہ حالات میں ہمیں Military strength سے پہلے Moral strength حاصل کرنا ہوگی کیونکہ Moral strength کے بغیر Physical strength کسی کام کی نہیں۔

اگر آج ہم Morally strong اور خوددار ہو جائیں تو دُنیا میں کسی کو بھی توہین ناموسِ رسالت ﷺ کی جسارت اور ہمت نہ ہوگی۔ یہ تو ایک پہلو ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایسی جسارت کرنے والا شخص بدترین سزا کا مستحق ہے۔ اب بھی اگر 56 ممالک اقوام متحدہ کے فورم (Forum) پر اس مسئلے کو لے جائیں تو عین ممکن ہے کہ یہ لوگ نہ صرف باز آ جائیں بلکہ معافی بھی مانگ لیں۔ اس لیے میرے خیال میں تو یہی بہتر ہے کہ دُنیا بھر کے 1.2 بلین مسلمان اکٹھے ہو کر اقوام متحدہ کے فورم پر جائیں اور وہاں سے آواز اُٹھائیں۔ تب اس آواز کو نظر انداز کرنا آسان نہ ہوگا۔

سوال: کیا عبادت کو صرف عبادت سمجھ کر کرنے سے عبادت کا حق ادا ہو جاتا ہے؟

جواب: ابھی ہم ذکر کر رہے تھے اوراد و وظائف کا۔ عبادت کو صرف عبادت سمجھ کر کرنے سے عبادت کا حق ادا نہیں ہوتا۔ عبادت کا حق صرف اُس وقت ادا ہوتا ہے جب ہم اس کی تین چیزیں اکٹھی لے کر چلیں۔

1- حکم الٰہی کی تعمیل کا جذبہ کہ یہ عبادت اللہ نے ہم پر فرض کی ہے۔ یہ اُس کا حکم ہے اور ہمیں اپنے رب کا حکم ماننا ہے۔

2- اس عبادت کا ذوق وشوق...... عبادت سے ہماری لگن ایسی ہو کہ ہم عبادت کو ذوق وشوق سے ادا کریں۔

3- عبادت کے پیچھے اپنے رب سے محبت کا جذبہ...... رب تعالیٰ سے محبت کا جذبہ کیا ہے؟ یہ کہ میرا رب سب سے بڑا ہے۔ میرا رب پالن ہار ہے اور وہ اس لائق ہے کہ اُس کی عبادت کی جائے۔

جب تک عبادت کے پیچھے یہ تین چیزیں اکٹھی نہیں ہوتیں عبادت کا حق ادا نہیں ہوتا۔ جب ہم ان تین قسم کے جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ہمارے اندر یہ خوف رہے کہ ہمیں اپنی ڈیوٹی پوری کرنا ہے ورنہ سزا ملے گی۔ پھر ہم اس ڈیوٹی کی ادائیگی میں سچائی، خوب صورتی اور خوشبو بھی شامل کر لیں۔ اس کے بعد جب ہم رب کی محبت سے مغلوب ہو کر عبادت کریں گے تو ایسی عبادت رب تعالیٰ سے ہمیں ملا دے گی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک Architect ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر Architect Board پر کچھ لکیریں کھینچتا ہے اور فیس (Fee) کی صورت وہ Cost of Construction کا 2 فیصد لے لیتا ہے۔ اس میں آرکیٹیکٹ کے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے صرف ہوئے ہیں۔ جب کہ معمار چار گھنٹے کی اس محنت پر تین مہینے کام کرتا ہے تب کہیں جا کر وہ عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

اینٹیں اُٹھانے والا مزدور صبح سے شام تک لرزتی سیڑھی کے ذریعے سب سے اُوپر والی منزل پر سیمنٹ، بجری اور ریت پہنچاتا ہے۔ اب سب سے زیادہ سخت کام کرنے کے باوجود مزدور سب سے کم معاوضہ پاتا ہے۔

معمار سر پر رومال رکھے دھوپ میں ایک ہی جگہ کھڑا ہو کر دیوار بنا رہا ہے لیکن کم سخت کام ہونے کے باوجود وہ مزدور کی نسبت زیادہ اُجرت لے رہا ہے۔

آرکیٹیکٹ نے AC کمرہ میں چار لکیریں کھینچ کر چار گھنٹے کام کیا اور سب سے زیادہ معاوضہ لیا۔

فرق یہ ہے کہ مزدور صرف معمار کی ہدایات پر عمل کر رہا ہے کہ کتنی بجری اور ریت چاہیے۔ اس میں مزدور

کی جسمانی مشقت ہے۔ لیکن اُس کا دل اور ذہن آزاد ہے۔ محض ہاتھوں سے کام کر رہا ہے۔ اس کے برعکس معمار تعمیر کے وقت اپنا ذہن بھی Apply کر رہا ہے۔ اپنے اُستاد سے جو کچھ سیکھا تھا اُس کو استعمال کر رہا ہے۔ تھوڑی دیوار بنانے کے بعد وہ چیک کرتا ہے کہ دیوار سیدھی تو ہے۔ سیمنٹ اور ریت کا تناسب تو درست ہے۔ یوں وہ ہاتھ اور ذہن دونوں کا استعمال کر رہا ہے اُس نے اس کی اجرت مزدور سے پانچ چھ گنا زیادہ وصول کی۔

آرکیٹیکٹ نے اپنا علم اور دماغ استعمال کیا ہے۔ گھر کا ڈیزائن بناتے ہوئے اُس نے ذوق وشوق، دل اور ہاتھ سب کا استعمال کیا ہے۔ اس لیے باوجود کم وقت صرف کرنے کے اُس کی اُجرت معمار اور مزدور دونوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔

بعینہ جب ہم عبادت میں یوں مشغول ہوتے ہیں کہ ہمارا دل، ذہن، جسم سب یکسو ہو کر اس میں مبتلا ہوتے ہیں تو اس کا معاوضہ اور انعام قرب الٰہی کی صورت میں بہت خوب صورت اور بہت زیادہ ہوتا ہے۔

جس طرح ایمان اگر تصدیق باللسان تک محدود رہے تو انسان مسلمان تو ہو جاتا ہے مومن نہیں ہوتا۔ مومن ہونے کے لیے تصدیق باللسان کو تصدیق بالقلب میں بدلنا پڑتا ہے۔ لیکن مومن ہونے کے باوجود وہ قرب الٰہی حاصل نہیں کر پاتا تاوقتیکہ اُس کا ایمان عمل کی صورت اختیار نہ کر پائے۔

اُس نے زبان سے جو اقرار کیا اللہ کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی رسالت کا۔ وہاں وہ مسلمان ہو گیا۔ یہ ایمان کا ابتدائی درجہ ہے۔ ایمان کا اگلا درجہ یہ ہے کہ انسان تصدیق کرتا ہے کہ میں اللہ کی وحدانیت، آپ ﷺ کی رسالت، قرآن پاک کے کتاب الٰہی ہونے، اللہ کے تمام فرشتوں، تمام الہامی کتابوں پر اور آپ ﷺ سے قبل مبعوث ہونے والے تمام پیغمبروں، رسولوں اور انبیاء پر ایمان لایا۔ اس سے اگلا مرحلہ آتا ہے کہ وہ ایمان لاتا ہے روز حساب پر، اللہ کی تمام صفات پر اور ہر اُس لفظ پر جو آپ ﷺ نے ہم تک پہنچایا۔ اس کے بعد جب انسان اس پر عمل کرتا ہے تو اللہ کی دوستی حاصل کر لیتا ہے۔

اخلاص، جنون، ادب

سوال: مرشد صاحب کشف اور صاحب نظر ہوتا ہے۔ وہ مرید کو اپنی Watchful eye میں رکھتا ہے۔ کیا اس کے باوجود ضروری ہے کہ مرید اپنی قلبی کیفیات اور رُوحانی واردات کا زبانی احوال بھی مرشد کے سامنے پیش کرے؟

جواب: رُوحانیت میں بہت سی غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں اُن کتابوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں جو مختلف مریدوں نے اپنے مرشد کے بارے میں لکھیں۔ مریدوں نے مرشد سے اپنی عقیدت سے مغلوب ہو کر اُن کے بارے میں بہت سی باتوں میں مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ ایسی تمام کتابوں میں بدقسمتی سے مرشد کی تعلیمات کی بجائے اُن کے تصرفات و کرامات پر زور دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کتابوں کو پڑھتے پڑھتے ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ مرشد شاید کوئی مافوق الفطرت انسان ہوتا ہے۔ ہر چیز اُس کے احاطہ علم میں ہوتی ہے۔ وہ ہر مرید پر نظر رکھے ہوتا ہے اور ہر مرید کے باطنی احوال کا اُسے علم ہوتا ہے۔ یہ سب غلط فہمیاں ہیں۔ ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ہر شے کا علم صرف اور صرف رب تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ اپنے ہر بندے کی ضروریات اور اُس کے احوال سے واقف رہنا صرف اللہ ہی کی صفت ہے۔ غیر اللہ کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ہر وقت ہر شخص کے بارے میں علم رکھتا ہو۔ لہٰذا کوئی مرشد کیسے اپنے تمام مریدوں کے حال احوال اور واقعات سے واقف رہ سکتا ہے۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ مرشد جو صاحب کشف، صاحب علم اور صاحب حال ہوتے ہیں وہ اگر کسی شخص پر توجہ کریں تو رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقہ کشف کے ذریعہ اُس کے احوال مرشد پر کھول دیتا ہے لیکن محض اُس قدر احوال جس قدر رب تعالیٰ چاہتا ہے۔

اگر کوئی مرید کسی مرشد کا پسندیدہ ہے اور وہ اپنے مرشد کے پاس آتا ہے تو مرشد اپنی پسندیدگی کی وجہ سے اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یوں اُس کے احوال سے واقف ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی بتا دوں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ احوال کا کھلنا بھی رب تعالیٰ کی مرضی اور رحمت پر منحصر ہے۔ ورنہ صاحب کشف بھی اندھوں کی طرح بیٹھا رہ جائے گا۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اپنے مرشد کو ہمیشہ انسان سمجھئے کیوں کہ وہ بنیادی طور پر انسان ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کے مرشد صاحب نے ریاضتیں اور چلّے کاٹ کے، مجاہدے کر کے اپنی رُوحانی قوت کو

بڑھالیا ہے اور اللہ نے اُس کی عبادات سے خوش ہو کر اُسے صاحبِ دُعا اور صاحبِ کشف و کرامات کر دیا۔

اگرچہ مرشد کو اپنے نفس اور ذہن پر عام انسانوں کی نسبت کہیں زیادہ کنٹرول ہوتا ہے لیکن پھر بھی رہتا وہ ایک عام انسان ہی ہے اور کہیں بھی اُس سے غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ نے لاتعداد ایسے واقعات پڑھے ہوں گے کہ کسی جگہ مرشد کا پاؤں پھسل گیا اور اُسے سزا مل گئی۔ لہٰذا یہ توقع رکھنا کہ آپ کے مرشد اپنے مرید کے احوال اور کیفیات سے ہمیشہ اور کلیتاً واقف ہوتے ہیں یہ ذرا زیادہ ہے۔ انھیں اپنے جیسا عام انسان سمجھئے۔ اپنے احوال، کیفیات اور واردات اپنے مرشد صاحب سے بیان کر دیجئے تا کہ جو چیزیں اُن کے علم میں نہیں ہیں وہ اُن کے علم میں آ جائیں اور وہ آپ کو Proper گائیڈ کر سکیں۔

سوال: کبھی کبھی ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پیشانی کے عین درمیان سے کوئی Invisible چیز ہمیں Focus کر کے اپنی طرف کھینچ رہی ہے؟

جواب: ہندوازم میں موجود رُوحانیت کے مطابق ہر انسان کی ایک Third eye (تیسری آنکھ) ہوتی ہے اور اس کی Location بھنوؤں کے درمیان بتائی جاتی ہے۔

انگریزی اصطلاح میں اس حصہ کو Sixth sense کہا جاتا ہے۔ سائنس کے مطابق ہر انسان کا ایک Magnetic Field (مقناطیسی میدان) ہے اور ہر انسان کے جسم سے Vibrations (لہریں) خارج (Emit) ہوتی ہیں۔ سائنس یہ بات تسلیم کرتی ہے کہ Vibrations کی یہ Emission (اخراج) بھنوؤں کے درمیانی حصہ سے ہوتی ہے۔

اس کا Background (پس منظر) یہ ہے کہ ہر انسانی جسم میں ایک کرنٹ موجود ہے جو 0.5 واٹ کا ہوتا ہے۔ اس کرنٹ اور چارج کی وجہ سے انسانی جسم کے اردگرد ایک Magnetic Field بنتی ہے۔ اور اس مقناطیسی میدان سے Magnetic vibrations (مقناطیسی لہریں) خارج ہوتی ہیں۔

جب ہم کسی ایسے شخص سے ملتے ہیں جس کی Vibrations ہماری Vibrations سے Compatible اور Favourable ہیں تو ہم اُس کی جانب کھنچے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں اُس میں کشش محسوس ہوتی ہے۔

کچھ لوگوں کی Vibrations نیوٹرل ہوتی ہیں۔ جب کہ کچھ لوگوں کے جسم سے نکلنے والی مقناطیسی لہریں ہماری مقناطیسی لہروں سے مطابقت نہیں رکھتیں جس کی وجہ سے ہم اُن لوگوں سے دُور بھاگتے ہیں۔

آپ نے زندگی میں دیکھا ہوگا کہ بسا اوقات کسی شخص سے ہماری ٹھیک طرح سے علیک سلیک بھی نہیں ہوتی لیکن نظر پڑنے پر ہم اُس سے ملنا چاہتے ہیں اور اُس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ یہ سب Favourable vibrations کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح کسی شخص سے بلاوجہ، بغیر بات کیے ہمیں چڑ ہونے لگتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ ہماری اور اُس کی Vibrations میں مطابقت نہیں ہوتی۔

Invisible (غیر مرئی) چیز کا پیشانی کو Focus کر کے اپنی طرف کھینچنے کا جہاں تک تعلق ہے تو دراصل وہ یہی Vibrations ہیں۔ جب کوئی انسان عبادات کثرت سے کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نیکی کی راہ بھی اختیار کرتا ہے تو اُس کے جسم کے اندر Magnetic Field زیادہ Strong ہوتی ہے اور وہ Vibrations جو اُس کے ماتھے سے خارج ہو رہی ہیں وہ بھی بہت زیادہ Strong ہو جاتی ہیں۔ جب ایسا شخص لوگوں میں بیٹھتا ہے تو اپنے گردو پیش موجود لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ نتیجتاً وہ لوگ بھی نیکی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

تمام مذاہب میں کی جانے والی عبادات میں سجدہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جو لوگ زیادہ عبادت کرتے ہیں۔ ذوق وشوق اور محبت سے عبادت کرتے ہیں اُن کے سجدے اور رکوع ہمیشہ طویل ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سجدہ کی حالت میں ہمارا خون سر کی طرف Rush کرتا ہے۔ جس قدر طویل سجدہ ہوگا اُسی قدر زیادہ خون دماغ کی طرف جمع ہو جائے گا۔ دماغ کو جس قدر وافر مقدار میں خون ملتا ہے اُسی قدر زیادہ اُسے آکسیجن ملتی ہے اور جس قدر آکسیجن دماغ کو زیادہ ملے گی اُسی قدر دماغ تیز ہو جائے گا۔

سجدہ کے دوران چہرہ کی طرف بھی خون کا Rush زیادہ ہوتا ہے۔ خون زیادہ ملنے سے آکسیجن زیادہ جذب ہوتی ہے جس سے جلد (Skin) میں ایک عجیب سی چمک اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ چمک اور تازگی چہرے کو ایک دل کش تاثر عطا کرتی ہے اور ہم بے اختیار کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے چہرے پر بہت نور ہے۔

اسی طرح زیادہ عبادت کرنے والے شخص میں پایا جانے والا قدرتی چارج زیادہ Strong ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کے جسم کے اردگرد Magnetic Field (مقناطیسی میدان) Strong ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے رُوحانیت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز لوگ عموماً کہتے ہیں کہ فلاں ولی اللہ کے سر پر اور جسم کے اردگرد میں نے نیلا ہالہ دیکھا۔ یہ دراصل وہ Aura ہے جو ہر انسان کے جسم کے اردگرد موجود ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ عبادت گزار، نیک خیالات رکھنے والے اور نیکی کی طرف راغب لوگوں کے جسم میں یہ چارج اتنا Powerful (طاقت ور) ہو جاتا ہے کہ اُن کا Aura دیگر لوگوں کو بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔

سوال: حدیث پاک ہے "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اُس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اُسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھتا ہی ہے۔" (صحیح بخاری، حدیث نمبر 49) اس کی وضاحت فرما دیجئے۔

جواب: درحقیقت اس حدیث کا تعلق عبادات میں اخلاص اور توجہ سے ہے۔ ہم سب نے ایک چیز کا تجربہ کیا ہو گا کہ جب ہم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو دُنیا بھر کے خیالات ہمارے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ ذہن میں خیالات کا ہجوم جس قدر زیادہ ہوگا عبادت میں توجہ اُسی قدر کم ہوگی۔ ہم عبادت تو کرتے ہیں لیکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ جلدی سے عبادت سے فارغ ہو کر دُنیاوی اُمور کی تکمیل میں مصروف ہو جائیں۔ اس کیفیت سے بچنے کا نسخہ آپ ﷺ نے اس حدیث پاک کی صورت میں ہمیں دے دیا کہ ہم عبادت اس طرح کریں کہ گویا ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کر پاتے تو کم از کم یہ سوچ لیا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ دُنیاوی دفتری معاملات میں Boss ہمیں دیکھ رہا ہو تو ہم کام زیادہ توجہ اور یک سوئی سے کرتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم یہ سوچیں گے کہ رب تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے تو ہماری عبادت میں توجہ اور خوب صورتی پیدا ہو جائے گی۔

خوب صورتی ان معنوں میں کہ جب ہم جلدی میں نماز پڑھتے ہیں تو نماز اٹھک بیٹھک لگتی ہے۔ جب کہ توجہ اور شوق سے ادا کی جانے والی نماز میں ہمارا ہر Posture geometrically بڑا صحیح ہوتا ہے۔ جب ہم کھڑے ہوتے ہیں تو ہمارے پاؤں کا درمیانی فاصلہ چار انچ سے کم اور ایک بالشت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاتھ سامنے کی طرف بندھے ہوتے ہیں۔ ہماری نظر سجدہ والی جگہ پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم قیام میں بے حس و حرکت کھڑے ہوتے ہیں۔ جب ہم رُکوع میں جاتے ہیں تو ہمارے گھٹنے Lock پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ خم نہیں کھائے ہوتے۔ ہماری کمر بالکل سیدھی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں رُکوع میں ہمارا Posture انگریزی کے اُلٹے ایل (L) کی طرح ہوتا ہے۔ سجدہ میں ہمارے دونوں پنجے اُنگلیوں کے Bend ہو جانے کے بعد زمین کے ساتھ لگے ہوتے ہیں اور اُن کا درمیانی فاصلہ اتنا ہی ہوتا ہے جتنا قیام کے وقت تھا۔ سجدہ میں کمر کمان کی مانند نہیں بلکہ سیدھی ہوتی ہے۔ یہ تمام Postures بہت خوب صورت ہیں۔ اللہ کے حضور حاضری کے وقت ہمیں خوب بنا سنورا ہونا چاہیے، خوب صورت دِکھنا چاہیے۔ ہمارا لباس صاف ستھرا اور بے داغ ہونا چاہیے۔ کوشش یہ ہو کہ ہمارے کپڑوں پر خوشبو لگی ہو۔ ہماری نماز سے اطمینان کی کیفیت جھلکنی چاہیے۔ جلدی کا نہیں بلکہ اطمینان کا تاثر اُبھرنا چاہیے۔ جو سورتیں اور آیات ہم نماز میں تلاوت کرتے ہیں اُن میں بھی ترتیب اور ترتیل ہو۔ یوں ہماری نماز ایسی ہو جائے گی کہ نہ صرف خود ہمیں بلکہ دیکھنے والوں کو بھی محسوس ہو جائے گا کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہماری توجہ نماز میں مرکوز ہے۔

مذکورہ حدیث مبارکہ ہم سے اس درجہ کے اخلاص اور انہماک کا تقاضا کرتی ہے جو رب تعالیٰ کو پسند ہے۔ اللہ کے دربار میں حاضری کے وقت ہماری نماز سے اخلاص اور ذوق و شوق جھلکنا چاہیے نہ کہ محض فرض کی ادائیگی کا تاثر۔

سوال: اگر مدینہ منورہ حاضری کا شرف حاصل ہو اور آپ ﷺ کے حضور درخواست پیش کرنا ہو تو طریقہ کار کیا ہونا چاہیے؟

جواب: اللہ کے یہاں حاضری کی Requirement تو یہ ہے کہ اس میں محبت یا عشق نہیں بلکہ جنون ہو تو ایسی حاضری کمال کی ہوگی۔ دیکھیں، پیار کے مختلف درجے ہیں۔ تعلقات۔ پھر Infatuation۔ پھر محبت۔ اس کے بعد عشق اور پھر جنون۔

جنون میں کچھ یاد نہیں ہوتا انسان کو۔ نہ کوئی طور طریقہ...... نہ کوئی ادب...... نہ کوئی قرینہ۔ جنون ان تمام باتوں سے ماورا ہوتا ہے۔ تو رب تعالیٰ سے پیار اس طرح کیا جائے کہ وہ جنون میں داخل ہو جائے۔ جنون میں جب ہم رب کو پکارتے ہیں تو جواب ملتا ہے۔ رب فوراً اپنے اُس نیک بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو

جنون میں رب کو یاد کرتا ہے۔

جس شخص نے اپنی محبت میں اپنے عشق میں رب کے ساتھ جتنا ادب و قرینہ ترک کیا اور مجنوں کی طرح اپنے رب تعالیٰ کو پکارا اُسی قدر اُس کی پکار رب کے حضور قبول ہوئی۔ رب عشق یا جنون کے اس انداز کو پسند کرتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس آپ ﷺ کا دربار مبارک ایسا ہے جو کلیۃً مقام ادب ہے۔ وہاں فرشتے بھی مؤدب رہتے ہیں۔ وہاں انسان جس قدر ادب و احترام کے ساتھ حاضری دیتا ہے۔ جس قدر عاجزی اختیار کرتا ہے۔ اُتنا ہی مقبول ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں انتہائی مؤدب حالت میں حاضر ہوں۔ ہمارا لباس و جسم بھی پاکیزہ ہو۔ خیالات اور سب سے بڑھ کر نیت بھی پاک ہو۔ یہ تو باطن کی بات ہے کہ نیت اور خیال بھی پاکیزہ ہو۔ جب کہ ظاہراً بھی ہم انتہائی مؤدب ہو کر اور انتہائی عاجزی اختیار کرتے ہوئے درود پاک پڑھتے ہوئے حاضر ہوں۔ کیونکہ یہ سنت رب بھی ہے اور سنت ملائکہ بھی۔ اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو آپ ﷺ کے حضور شرمندگی کا اظہار ضرور کر دیا جائے کہ ہم ویسی زندگی نہیں گزار سکے جو زندگی ہمیں گزارنی چاہیے تھی۔ آپ ﷺ کی سنت کے مطابق ہم زندگی بسر نہیں کر سکے۔ یہی عاجزی و ادب اور اظہار شرمندگی شاید ہمیں شفاعت دلا دے۔

اُمید ہے کہ انشاء اللہ اس بارگاہ اقدس میں یہ طریقہ حاضری مقبول ٹھہرے گا۔

سوال: کبھی کبھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ جو منظر ہماری نظروں کے سامنے ہے یہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں یا ایسا ہی واقعہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

جواب: رُوحانیت میں ایک Term ہم نے اکثر پڑھی ہوگی "رُوح کی سیر"۔ جب نیکی اور عبادات کا راستہ ہم اختیار کرتے ہیں اور اس پر مسلسل عمل کرتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں ہماری رُوح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور وہ رُوح لطیف ہو جاتی ہے۔ جوں جوں ہماری رُوح لطیف ہوگی اُسی قدر اُس کی پرواز بڑھتی چلی جائے گی۔ جس قدر رُوح کی پرواز بڑھے گی اُتنی ہی زیادہ وہ سیر کو نکلے گی۔

جب ہم سو رہے ہوتے ہیں تو ہماری رُوح سیر کر رہی ہوتی ہے۔ یہ رُوحانی سیر ہوتی ہے۔ جس کو ہمارا شعور چونکہ Register نہیں کرتا اس لیے ہمیں یہ سیر یاد نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے ہماری رُوح ضرور واقف ہوتی ہے۔ اس لیے بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ رُوحانی طور پر جس مقام یا منظر کی ہم نے سیر کی ہوتی ہے وہ جسمانی طور پر ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم چونک اُٹھتے ہیں۔ مثلاً کسی انسان کی رُوح نے سمندر کے کنارے ایک مخصوص سپاٹ کی سیر کی۔ اب یہ سیر اُس انسان کے شعور میں رجسٹر نہیں ہے۔ پانچ یا دس سال بعد اُسے کراچی جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ وہ سمندر کے کنارے اُسی سپاٹ پر جاتا ہے تو رُوح کی وہ یادداشت عود آتی ہے اور اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ یہ مقام پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ یہ آپ کے سوال کی رُوحانی توجیہہ ہے۔ لیکن

سائنس اور نفسیات میں بھی اس پر تجربات ہوئے ہیں۔ امریکہ میں بہت سے ایسے بچوں پر Study ہوئی ہے جو بہت سے علاقوں میں کبھی نہ گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اُن علاقوں کے نشانات اور Landmarks بہت تفصیل کے ساتھ بتا سکتے تھے۔ سائنس باوجود حیرت کے اسے کوئی نام نہ دے سکی۔ محض یہ کہا کہ

''کسی شخص کی ذہنی قوتیں اور صلاحیتیں بعض اوقات اس قدر تیز ہو جاتی ہیں کہ وہ زمان ومکاں سے بالاتر ہو جاتا ہے اور وہ ایک ہی جگہ پر بیٹھا بیٹھا ذہنی طور پر دوسرے مقام کی سیر کر لیتا ہے۔''

یہ درحقیقت رُوح کی سیر ہے جس کی وجہ سے ہمیں کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ پہلے بھی ہو چکا یا یہ منظر ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔

سوال: آپ نے بار بار پاک بھارت جنگ کا ذکر کیا کہ سخت جنگ سیالکوٹ کے بارڈر پر لڑی جائے گی جس میں ہمارا جانی اور مالی نقصان ہوگا لیکن بالآخر فتح پاکستان کی ہوگی۔ اس پر مزید کچھ روشنی ڈال دیجیے۔

جواب: جس جنگ کا ذکر ہوتا رہا ہے وہ یقیناً ہوگی اور اس میں پاکستان کی فتح یابی میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانا شاید قرینِ مصلحت نہ ہو۔ یہاں اتنا ہی ذکر کافی ہے کہ ہم اُس جنگ میں انشاءاللہ بفضلِ خدا سرخرو ٹھہریں گے اور نتیجتاً پاکستان کو اسلامی دُنیا میں لیڈر مان لیا جائے گا۔ اور وہ دیگر تمام ممالک کو Lead کرے گا۔

حدیث مبارکہ ہے ''تم میں سے کچھ (لوگ) اہلِ ہند کے ساتھ جنگ کریں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں (مسلمانوں کو) فتح نصیب کرے گا۔'' (بحوالہ کنز العمال، حدیث نمبر 39719، باب نزولِ عیسیٰ علیہ السلام)

جہاں تک Life loss (جانی نقصان) کا سوال ہے۔ تو ہر مسلمان کی زندگی کی Ultimate خواہش شہید ہونا ہے۔ جب ہر انسان کے اندر جذبۂ شہادت موجود ہے تو پھر Life losses سے کیا ڈرنا۔ شہید ہونے والے لوگ تو خوش نصیب ہوں گے۔

جہاں تک جنگ میں Material losses (مادی خسارہ) کا تعلق ہے۔ تو ہمارا ایمان ہے کہ سب اللہ کا مال ہے اور یہ مال اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں چلا جاتا ہے۔ کام آ جاتا ہے تو پھر افسوس کس بات کا۔

انسان امن سے محبت تو کرتا ہے اور اُس کی Utmost کوشش ہوتی ہے کہ امن قائم رہے۔ امن کا اس قدر روائی ہونے کے باوجود وہ جنگ سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ جنگ سے اس کا خوفزدہ نہ ہونا ہی درحقیقت امن کی ضمانت ہے۔ اگر آپ کے دشمن کو یہ معلوم ہو کہ آپ جنگ سے خوف زدہ نہیں ہیں اور وقت آنے پر آپ پوری دل جمعی سے آخری وقت تک لڑیں گے تو وہ بہت سوچ بچار کے بعد آپ پر ہتھیار اُٹھائے گا اور یہی امن کی ضمانت ہے۔

دُعا کس طرح مانگی جائے!

سوال: کیا متوقع پاک بھارت جنگ ہی جنگ ہند ہوگی؟ یا جنگ ہند پہلے ہی لڑی جا چکی ہے؟

جواب: آپ ﷺ کی کئی ایسی احادیث ہیں جن میں آپ ﷺ نے آنے والے زمانوں کا ذکر فرمایا ہے جیسے دجال کا ظہور، آغاز اسلام میں مسلمانوں کا غیر مسلموں پر غلبہ اور بعد ازاں دیگر تمام مذاہب پر غلبہ، اسلام کا تمام دُنیا میں پھیل جانا، دریائے اُردن کا بھی اسی ضمن میں ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر آپ ﷺ نے جنگِ ہند کا ذکر بھی فرمایا کہ ہند میں ایک جنگ ہوگی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اور اُس میں مسلمان فتح یاب ہوں گے۔

"تم میں سے جو (اہل) ہند کے ساتھ جنگ کریں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں (مسلمانوں کو) فتح نصیب کرے گا۔" (کنزالعمال حدیث نمبر 39719)

بہت سے محققین کا یہ خیال رہا کہ چونکہ ہندوستان پر مسلمانوں نے پے در پے حملے کیے ہیں۔ شہاب الدین غوری، محمود غزنوی، بابر۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ وہ جنگ ہند ہو چکی ہو۔ لیکن جنگ ہند سے کچھ شرائط بھی منسلک ہیں۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہوگا کہ کیا وہ شرائط پوری ہو چکی ہیں یا نہیں؟

جب ہم تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہندوستان میں جتنی بھی غیر مسلموں سے لڑائیاں ہوئی ہیں وہ اُن شرائط کو پورا نہیں کرتیں۔ اس لیے علمائے کرام کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ وہ جنگ ہند جس کا ذکر آپ ﷺ نے فرمایا تھا، وہ ہونا ابھی باقی ہے۔

متوقع پاک بھارت جنگ ضروری نہیں کہ جنگ ہند ہی ہو۔ کیونکہ ابھی دیگر شرائط پوری نہیں ہوئیں۔ لیکن یہ ایسی جنگ ہے جس کا ذکر تمام فقیر کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی تقریباً سبھی بزرگ کہتے چلے آئے ہیں کہ پاکستان عالم اسلام کے لیڈر کا کردار ادا کرے گا۔

ایک بات حضرت امام بری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور ہے۔ حضرت امام بری رحمۃ اللہ علیہ اسلام آباد میں دفن ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا تھا کہ جس جگہ میں دفن ہوں گا وہاں ایک نیا شہر بسے گا اور عالم اسلام سے متعلق فیصلے اُس شہر میں ہوا کریں گے۔

دیگر بزرگوں نے بھی پاکستان کے اس بڑے رول (Role) کی پیش گوئیاں کی ہیں۔ اس لیے انشاء اللہ تعالیٰ پاکستان دُنیا میں سربلند ہوگا اور ایسا کردار ادا کرے گا جس کے لیے رب تعالیٰ اسے وجود میں لایا تھا۔ اسلام کی سربلندی میں پاکستان کا کردار بہت نمایاں ہوگا۔

یہ وقت بہت دُور بھی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے چند سالوں میں پاکستان اُٹھ کھڑا ہو۔

سوال: کیا دُعا مانگنا انسانی جبلت ہے؟

جواب: ہم اکثر یہاں ذکر کرتے ہیں کہ دُعا کو ہم لوگوں نے ایک غلط رنگ دے دیا ہے۔ انسان کی فطری سہل پسندی شاید بہت زیادہ غالب آ گئی ہے۔ ہندو معاشرہ میں ایک لمبا عرصہ گزارنے کی وجہ سے ہم ابھی بھی اُس کلچر کے کچھ حصہ پر عمل پیرا ہیں۔ اس لیے ہمارا زور جدوجہد اور محنت کی بجائے وظائف اور دُعا پر زیادہ ہے۔ اب تو خالصتاً ہندوانہ طریقہ سے نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ میں جوتے (Shoes) پہننا چاہتا ہوں۔ آپ دُعا کر کے بتا دیجیے کہ میں شوز پہن سکوں گا یا نہیں؟ مجھے کامیابی ہوگی یا نہیں؟

یہ سب مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ مسلمان تو ہر وقت مجاہدوں کی طرح عملی اقدامات کے لیے تیار رہتا ہے۔ وہ محنت کے بعد دُعا کرتا ہے کہ یا باری تعالیٰ! تو نے جو صلاحیتیں مجھے عطا فرمائی ہیں اور جو علم و عقل مجھے عطا فرمائی اُن سب سے بھرپور کام لے کر میں نے محنت کی ہے تو اُس کو قبول فرما لے اور اُس کا وہ پھل اور نتیجہ عطا فرما جو میرے بہترین مفاد میں ہے۔

یوں دُعا وظائف سے مختلف ہے۔ دُعا مانگنا انسان کی جبلت میں ہے۔ جب مذاہب ابھی اپنی بالکل ابتدائی شکل میں تھے تب اُن مذاہب کا پیغام اُس دور کے لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق تھا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ رب تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کا ایک قاعدہ یہ رہا ہے کہ ہمیشہ مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ اسی طرح جو مذاہب اُتارے گئے اور جو پیغمبر بھیجے گئے وہ اُن ادوار کے انسانوں کی ذہنی سطح کے مطابق تھے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور اُن کے زمین پر تشریف لانے کے بعد انسان ارتقا کی جن جن منازل سے گزرا اور جس Stage پر پہنچا اُس دور میں اُتنا ہی پیغام اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا۔ جب اللہ کا پیغام ابھی بالکل ابتدائی شکل میں زمین پر آیا تھا اُس وقت بھی انسان کسی ایسی Supreme power کی تلاش میں رہتا تھا کہ جس کے سامنے وہ گڑگڑائے اور دُعا کے لیے کہے۔

یہ انسانی جبلت ہے کہ وہ مشکل حالات میں ایسی ہستی کے پاس جانا چاہتا ہے جسے وہ خود سے طاقت ور جانتا ہے۔ اسی جبلت کی وجہ سے شروع میں کچھ لوگوں نے اُن چیزوں کی پوجا شروع کر دی جن کو وہ خود سے زیادہ طاقت ور سمجھتے تھے۔ اس کی ایک مثال ہندومت ہے۔ ہندومت کبھی اپنی اصل شکل میں دُنیا میں رہا ہوگا۔ اس وقت یہ دُنیا کا سب سے قدیم مذہب ہے۔ اس کی عمر 5000 سے 7000 سال ہے۔ آج سے پانچ

سات ہزار سال پہلے انسان ذہنی لحاظ سے اتنا ترقی یافتہ نہ تھا۔ اُس کے وسائل بھی محدود تھے۔ رفتہ رفتہ ہندو ازم میں بھی تحریف ہونے لگی۔ چونکہ انسان اُن دنوں ترقی یافتہ نہ تھا لہٰذا وہ قدرتی آفات اور جنگلی جانوروں سے اپنا دفاع نہ کر پاتا تھا۔ اس لیے اُن تمام چیزوں کو اُس نے خود سے زیادہ طاقت ور تسلیم کر لیا اور اُن کی پوجا شروع کر دی۔ اُس کا خیال تھا کہ اس طرح ہاتھ جوڑنے سے یہ چیزیں اُس سے خوش رہیں گی اور اُسے ضرر نہیں پہنچائیں گی۔ اسی طرح جن چیزوں سے اُسے فائدہ ملتا تھا اُس نے اظہار تشکر کے طور پر اُن کی بھی پوجا شروع کر دی۔ ہندومت میں ناگ کو دیوتا تصور کرنے کے پیچھے بھی یہی وجہ ہے کہ ناگ کے زہر سے خوف کھا کر انسان نے اُس کی پوجا شروع کی تھی۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ جسے وہ طاقت ور اور نا قابلِ تسخیر سمجھتا ہے اُس کے سامنے جھک جاتا ہے۔ یہی جبلت انسان سے دُعا کرواتی ہے۔ ہندوؤں نے اپنے بہت سے دیوتا گھڑ لیے۔ کوئی دولت اور طاقت کا، تو کوئی قہر کا دیوتا۔ اُن سب کے سامنے وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوتے اور پوجا کرتے ہیں کیونکہ وہ انھیں خود سے طاقت ور سمجھتے ہیں۔

رب تعالیٰ نے مذہب کے ذریعے انسان کی اسی جبلت کو Channelise کیا اور وہ بار بار اپنے پیغمبروں کو انسانوں کے پاس بھیجتا رہا یہ پیغام دے کر کہ جن سے ڈر کر تم اُن کی پوجا کرتے ہو وہ سب میری تخلیق ہیں۔ میں ہی اُن کا خالق ہوں اور میں ہی سب سے زیادہ طاقت ور ہوں۔

آخری پیغام کے وقت چونکہ انسانی ذہنی ارتقا مکمل ہو چکا تھا اس لیے پیغام بھی مکمل ہو گیا اور رب تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ اب مزید کسی مذہب یا پیغمبر کی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ نے اپنے آخری پیغام میں بھی واضح کر دیا کہ مالکِ کل میں ہی ہوں۔ Ultimate طاقت میں ہوں۔ میں نے ہی تمھیں تخلیق کیا۔ چاند، سورج، آگ ان سب کو میں نے ہی بنایا۔ جو کچھ مانگنا ہے مجھ سے مانگو میں تمھیں دوں گا۔

مسلمان بھی جب دُعا مانگتا ہے تو اللہ کو سپریم سمجھ کر ہی اُس سے دُعا مانگتا ہے اور مدد کا طلب گار ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مسلمان کی ڈائریکشن Set ہو گئی کہ جو کچھ مانگنا ہے، رب ہی سے مانگنا ہے۔ کیوں کہ رب ہی ہے جو سب کچھ عطا کرتا ہے۔

دُعا کرنا انسان کی جبلت ہے۔ اس سے وہ Protection (تحفظ) محسوس کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ انسان بہت بے صبرا ہے۔ (''بے شک آدمی بنایا گیا ہے بڑا بے صبرا حریص۔'' سورۃ المعارج:19)

انسان کو مشکل حالات میں صبر کرنے کے لیے بھی ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام حالات میں وہ صبر نہیں کرے گا بلکہ مایوس ہو جائے گا۔ دُعا مشکل حالات میں انسان کو پُر اُمید رکھتی ہے اور اسی دُعا کے سہارے وہ اچھے وقت کا انتظار کر لیتا ہے۔

کٹھن حالات میں ہم دُعا کرتے ہیں ''رب تعالیٰ! ہمارا یہ کام کر دے۔'' اس کے بعد ہمارے دل میں

یقین ہوتا ہے کہ رب چونکہ دُعائیں سنتا اور قبول کرتا ہے۔ اُس نے ہماری دُعا سن لی ہے اس لیے ہمارا یہ کام ہو جائے گا۔

یہ احساس کہ "ہمارا کام ہو جائے گا" ہمیں صبر پر آمادہ کرتا اور ہمارے صبر کو برقرار رکھتا ہے۔ ہم دن میں پانچ بار نماز کے بعد دُعا مانگتے ہیں۔ نفلی عبادت کے بعد بھی رب کو پکارتے ہیں۔ ہم روز اس اُمید پر سوتے ہیں کہ کل ہمارا کام ہو جائے گا۔ یوں ہم صبر کرتے رہتے ہیں تاوقتیکہ ہمارا وہ کام رب کی طرف سے اپنے مقررہ وقت پر ہو نہیں جاتا۔ اگر دُعا انسان کی جبلت نہ ہوتی تو اس میں خودکشی اور ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑے کی رفتار کہیں زیادہ ہو جاتی۔

ایک ایسی سپریم طاقت موجود ہے جو ہمیں Look after کرتی ہے۔ ہماری ضرورتیں اور حاجات پوری کرتی ہے۔ ہر مشکل وقت میں ہمارے کام آتی ہے۔ یہ احساس ہمیں ہر حال میں پُرامید رکھتا ہے اور تب اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے کہ رب سے مایوسی کفر ہے۔

> "تم فرما دو اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی بخشنے والا مہربان ہے۔" (سورۃ الزمر:53)

اگر ہم رب سے دُعا مانگنے کے باوجود مایوس ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رب پر ہمارا ایمان و بھروسا ختم ہو گیا ہے۔ جب تک رب تعالیٰ پر ہمارا بھروسا اور ایمان قائم ہے ہم رب سے مایوس نہیں ہوں گے۔ کسی بھی دُعا کے پورا ہونے کے لیے رب پر ایمان اور بھروسا ہونا بہت ضروری ہے۔ جتنا زیادہ رب تعالیٰ پر ایمان اور بھروسا مضبوط ہو گا اُسی قدر جلد ہماری دُعائیں قبول ہوں گی کیونکہ جب ہمارا ایمان اور بھروسا رب پر بہت مضبوط ہوتا ہے تو ہم رب تعالیٰ سے ایک مان کے ساتھ مانگتے ہیں۔ وہ مان یہ ہے کہ میرا رب سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ میرے رب کے خزانے بے پایاں ہیں۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کچھ کرنے کے لیے اُسے Effort نہیں کرنا پڑتی۔ وہ 'کُن' کہتا ہے اور سب ہو جاتا ہے۔ کسی بھی کام کے لیے اُس کا ہلکا سا اشارہ کافی ہے۔

جب میرا رب اتنا طاقت ور، اتنا قادر ہے تو وہ یقیناً مجھے Look after کرے گا۔ اس یقین کے بعد دل میں یہ شک آ ہی نہیں سکتا کہ میرا رب مجھے اس مشکل سے نکالے گا بھی یا نہیں۔ وہ مجھے Look after کرے گا بھی یا نہیں۔

جب دل میں پختہ ایمان اور مضبوط احساس کے ساتھ بندہ رب سے دُعا مانگتا ہے تو اُس میں وہ اعتماد ہوتا ہے جسے مان کہتے ہیں۔ یہ مان کہ میرا رب میری دُعا یقیناً قبول کرے گا۔ وہ بچپن سے اب تک میرا خیال رکھتا آیا ہے۔ مجھے پالتا آیا ہے۔ وہ اب بھی میرا خیال رکھے گا۔ جب انسان اس انداز میں سوچتا ہے تو اُس کے لب و لہجہ میں ایک مان پیدا ہو جاتا ہے اور یہ مان رب کو پسند ہے۔ اس مان میں انسان سوچتا ہے کہ میں اُس رب کا بندہ ہوں جو اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ اس مان کے ساتھ مانگی جانے والی دُعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔

سوال: کیا دُعا میں پیرو مرشد کا حوالہ دیا جاسکتا ہے؟

جواب: میرا پختہ عقیدہ و یقین ہے کہ رب ہر ایک کی سنتا ہے۔ اُن کی بھی سنتا ہے جو بہت نیک اور اللہ کے فرماں بردار و برگزیدہ بندے ہیں۔ وہ گناہ گاروں کی بھی سنتا ہے۔ اُن کی بھی سنتا ہے جو ہر وقت گلہ و شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی بھی جو منکر اور مشرک ہیں۔ تو پھر رب تعالیٰ کو کسی بندے کا واسطہ کیا دیا جائے۔ رب جو اتنا مہربان ہے کہ وہ ہر بندے کی سن لیتا ہے وہ تو جانوروں کی بھی سنتا ہے۔ تو پھر کیوں نہ اُس سے براہِ راست مخاطب ہوا جائے۔

اگر دُعا میں حوالہ ضرور ہی دینا چاہیں تو پہلے اللہ تعالیٰ کو اُس کے رحمٰن و رحیم اور قادرِ مطلق ہونے کا واسطہ دیں پھر اُس سے کہیں کہ تو اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اور اپنے نیک بندوں کے صدقے مجھ پر اپنا رحم و کرم فرما دے۔

میرے عقیدہ کے مطابق تو یہ بہتر ہے۔

سوال: دُعا کرتے وقت ہم Confuse ہو جاتے ہیں کہ نہ جانے ہمیں یہ دُعا کرنی چاہیے یا نہیں؟

جواب: جب ہم کسی مخصوص شے کے لیے دُعا مانگتے ہیں تو Confuse ہو جاتے ہیں۔ جیسے ایک ملازم پیشہ آدمی لاہور میں اپنی ٹرانسفر کے لیے دُعا کرتا ہے۔ اب انسان کا علم و عقل دونوں محدود ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ لاہور میں اُس کا ٹرانسفر ہونا کیسا رہے گا۔ ممکن ہے کہ اُس کی کوئٹہ ٹرانسفر بہتر ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ لاہور ٹرانسفر کی دُعا قبول تو ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعد وہ وہاں بہت سے مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ہم اپنی ترقی کے لیے دُعا کرتے ہیں اور ترقی ہو جانے کی صورت میں بہت سی اُلجھنوں اور مشکلات میں پھنس جاتے ہیں۔ چونکہ یہ رب ہی ہے جو غیب کا علم جانتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ ہم یوں دُعا کریں:۔

> ''یا باری تعالیٰ! میری عقل کے مطابق تو لاہور ٹرانسفر بہتر معلوم ہوتی ہے لیکن تو بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے کیا بہتر ہے۔ تو میرے لیے وہ کر دے جو میرے حق میں بہترین ہے۔''

اگر ہم ترقی کے لیے دُعا کر رہے ہیں اور اِس دُعا کے پیچھے وسیع رزق کی خواہش ہے تو ہم یوں دُعا کریں:۔

> ''یا باری تعالیٰ! میرا رزق وسیع فرما دے''۔ اب یہ رب کی صوابدید ہے کہ وہ ہمیں کہاں اور کس ذریعہ سے رزق عطا کرنا چاہتا ہے۔

ایسی دُعا کے بعد آنے والا نتیجہ اور فیصلہ ہمارے لیے بہترین ہوگا۔

ہم ایک Particular چیز کا کہہ کر اپنے Options کو محدود نہ کریں۔ جیسے کچھ لوگوں کو اپنے کسی کام کی تکمیل کے لیے رقم کی ضرورت ہو تو وہ یہ دُعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! میرا مکان فروخت ہو جائے تا کہ میرے پاس اتنی رقم آ جائے کہ میرا فلاں کام ہو جائے۔ ہم معاذ اللہ، اللہ کو غریب کیوں سمجھتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے ہمیں ایک مکان دیا ہے تو وہ دوسرا نہیں دے سکتا۔ رب کے خزانے تو بے پایاں اور بے حساب ہیں اور وہ ہمیں ایک مکان دینے پر قادر ہے تو ہمارے دوسرے کام کی تکمیل کے لیے ہمیں روپیہ پیسہ بھی عطا کر دے گا۔ تو پھر ہم یہ دُعا کیوں نہ کریں کہ یا باری تعالیٰ! یہ ذمہ داری میرے سر آن پڑی ہے اس کے لیے میرے پاس وسائل نہیں ہے تو مہربانی فرما اور وسائل پیدا فرما دے۔

یاد رکھیے! ہمیں اللہ کو مختلف Options دے کر اپنی دُعا کو محدود نہیں کرنا چاہیے۔ جیسے اکثر ہم دُعا مانگتے ہیں کہ یا باری تعالیٰ! میں نے فلاں ادارہ میں Apply کیا ہے تو وہاں مجھے نوکری دے دے۔ اب ہم نہیں جانتے کہ اُس ادارے میں ملازمت ہمارے لیے فائدہ مند ہے بھی یا نہیں۔ لہٰذا ہم یہ دُعا کیوں نہ کریں کہ اے اللہ! مجھ پر روزگار کے دروازے کھول دے اور مجھے ایسا روزگار عطا فرما جس میں میرے لیے سہولت بھی ہو اور عزت بھی۔ اس دُعا کے بعد رب مجھے جہاں چاہے ملازمت دے دے۔ رب کا فیصلہ یقیناً میرے بہترین مفاد میں ہوگا۔

سوال: کیا نماز کے سجدہ میں دُعا کی جا سکتی ہے؟ کیا اللہ نیتوں سے متاثر ہوتا ہے یا ظاہری طور طریقوں سے؟

جواب: دُعا کے لیے سجدہ علیحدہ سے کیا جائے۔ اس سجدہ میں ہاتھ زمین کی طرف نہیں بلکہ آسمان کی طرف اُٹھے ہوں۔ نماز میں کیے گئے تمام سجدے دُنیاوی اغراض سے پاک ہوتے ہیں خواہ وہ فرض نماز ہو یا نفل نماز۔ کیونکہ نماز میں ہم نیت کرتے ہوئے ایک جملہ کہتے ہیں:۔

''نماز برائے اللہ تعالیٰ۔''

لہٰذا جو نماز ہم اللہ کے لیے پڑھ رہے ہیں اُس نماز کے سجدہ میں دُنیا کی کوئی چیز کیسے شامل کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک Logical بات ہے۔ دوسری بات کہ جو نماز ہم اللہ کے لیے پڑھتے ہیں اُس میں غیر اللہ کا کلام نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ''اُف'' تک کا لفظ زبان سے نکل گیا تو نماز دہرانا ہوگی۔ سجدہ، رکوع غرض کہ ہر رُکن نماز کے لیے مقرر کردہ چیزیں بھی پڑھنا ہوں گی۔ البتہ نماز ختم ہو جانے اور سلام پھیرنے کے بعد سجدہ میں گر کر رب کے حضور گڑگڑایا جائے اور دُعا کی جائے۔

اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نیتوں سے متاثر ہوتا ہے یا ظاہری طور طریقوں سے؟ میرا دل اور دماغ تو کہیں اور ہے لیکن میں سجدہ میں جا کر رٹے رٹائے الفاظ بول رہا ہوں۔ یہ دُعا قبول ہوگی یا پھر اُس شخص کی دُعا قبول ہوگی جو بظاہر تو کھانا کھا رہا ہے لیکن دل ہی دل میں مکمل یک سوئی کے ساتھ رب کے حضور گڑگڑا رہا ہے۔ اسی طرح ایک شخص بیٹھا گانا سن رہا ہے۔ موسیقی کی آواز یا گانے کے کسی بول نے اُس کے دل یا دماغ کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ خوفِ خدا سے کانپ اُٹھا اور پوری یک سوئی کے ساتھ رب کی طرف متوجہ ہو کر

اُس سے دُعا کرنے لگا۔

ذرا سوچئے کہ یہ دُعا قبول ہوگی یا پھر اُس شخص کی جو نمائشی نماز میں سجدہ پر سجدہ کیے جارہا ہے؟ رب کے ہاں تو جنون اور دل کے جذبات کام آتے ہیں وہاں زبان اور ظاہری طور طریقوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہاں تو وہ بازی لے گیا جو عشق میں ڈوب کر رب سے مخاطب ہوا بہ نسبت اُس زاہد کے جو بظاہر تو بہت رکھ رکھاؤ سے نماز ادا کر رہا ہے لیکن اُس کا دل اور دماغ کہیں اور ہے۔ رب کے ہاں تو وہی کما کھاتے ہیں جو اُس کے عشق میں مجنوں بن جاتے ہیں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ اُس زبان سے دُعا کراؤ جس سے گناہ نہ کیا ہو۔ اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: اس جملے کو ذرا سا تبدیل کر لیجیے کہ "اس زبان سے دُعا کر جس سے گناہ نہ کیا ہو"۔ "کروا" اور "کر" کا فرق ہے۔

فرض کریں کسی شخص کی ٹوٹل عمر 70 سال ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار اور عرصے میں آنے والی مشکلات کے Patches کو اگر ہم جمع کر لیں اور Length of time کو اکٹھا کریں تو وہ مشکل وقت ٹوٹل زندگی میں بمشکل پندرہ سال کے برابر ہوگا۔

کیا یہ انصاف کے خلاف نہیں کہ 70 سالہ زندگی میں سے 55 سال تو میں نے آرام اور سکون سے گزارے۔ ان 55 سالوں میں تو میں رب سے کبھی کہنے نہیں گیا کہ یارب تعالیٰ! تو نے مجھے اس قدر آسانی اور آرام و راحت سے نوازا ہے میں تو اس کا مستحق نہیں تو مجھ پر اتنی رحمتیں کیوں کر رہا ہے؟

لیکن جب زندگی کے مختلف ادوار میں 3 یا 6 مہینوں یا سال ڈیڑھ سال کے لیے میں مسائل اور مشکلات میں گھر گیا تو میں بار بار رب کے در پر جاتا اور کہتا رہا "یا باری تعالیٰ! تو کیسا رب ہے۔ دیکھتا نہیں میں کس قدر مشکل میں گھر چکا ہوں۔"

میرے مرشد صاحب کا حجرہ 3½×5½ فٹ کے ایک مختصر کمرہ پر مشتمل تھا۔ اُس میں کوئی کھڑکی، روشن دان، ائیر کنڈیشنر نہ تھا۔ لہٰذا حبس بے پناہ ہوتا۔ ایک روز ائیر کنڈیشنڈ آفس سے اُٹھ کر جب وہاں گیا تو بے خیالی میں ملاقات کے ابتدائی لمحوں میں موسم کی گفتگو کے دوران میری زبان سے یہ جملہ پھسل گیا "حضور! آج گرمی بہت ہے۔"

مرشد صاحب غصہ میں آ گئے اور بولے "تمھیں یہ حق کس نے دیا کہ تم اپنے آقا کے کسی عمل پر اُنگلی اُٹھاؤ۔ یہ آقا کی مرضی ہے وہ گرمی کرے یا سردی بھیجے۔ تم کون ہوتے ہو یہ کہنے والے کہ آج گرمی بہت ہے۔ یہ اللہ کا شکوہ بیان کرنا کہاں سے سیکھا تم نے؟"

لوگوں کی موجودگی میں اس سخت سرزنش پر میری زبان سے نکلا "I am sorry sir آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" معلوم نہیں کہ مرشد صاحب کے رُوحانی تصرفات کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ کہ اس دن کے بعد سے اب تک

ایسی بات کبھی دوبارہ میری زبان پر نہیں آئی کہ آج گرمی زیادہ ہے یا آج سردی زیادہ ہے۔
رب ہمارا خالق، مالک اور پالن ہار ہے۔ اُس کا شکوہ ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ ہمیں گلہ کرنے کا حق ہے ہی نہیں۔ یہ کہنا کہ میں مشکل میں یا فلاں آفت میں ہوں یہ بھی گویا رب کا شکوہ بیان کرنا ہے۔ انسان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ ایسے الفاظ زبان پر لائے۔ بہتر یہی ہے کہ جب انسان مشکل میں ہو تو رب تعالیٰ سے کہے "یا باری تعالیٰ! تو بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے کیا بہتر ہے۔ میرا ایمان ہے کہ تو مجھ پر ایسی آفت نہیں بھیجے گا جس کی مجھ میں سکت نہ ہو۔ میں تو تیرے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ تو رحمٰن و کریم اور مہربان ہے۔ تیری مہربانیوں اور رحمتوں کی وجہ سے مجھے قطعاً یہ توقع نہیں کہ تو مجھے مشکل میں رکھے گا۔ تو مجھ پر اپنا کرم فرمادے اور ان پریشانیوں کو مجھ سے دُور فرمادے۔"
یقین کر لیجیے کہ اس کے بعد رب اپنی رحمتوں کے صدقہ ہماری مشکلات اور پریشانیاں دُور فرمادیتا ہے۔

پیر مُرید اور قلب کا رشتہ

سوال: کیا اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے؟ اگر ہے تو جب بھی کوئی بے قرار ہو کر اُسے پکارتا ہے تو نظر اوپر کیوں اُٹھتی ہے؟

جواب: Omnipresence یعنی ہر جگہ حاضر اور موجود ہونا اللہ کی صفت ہے۔ وہ ہر جگہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لیکن اس صفت کے باوجود اُس کی کوئی تو جائے نشست ہوگی۔ اس کا جواب ہمیں معراج شریف کے واقعہ سے ملتا ہے۔ آپ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے اور عرش پر پہنچ کر رب تعالیٰ سے آپ ﷺ کی گفتگو ہوئی تھی۔ وہیں رب تعالیٰ کی نشست گاہ ہے۔ اپنی نشست گاہ وہاں ہونے کے باوجود وہ تمام کائنات کا صفاتی طور پر احاطہ کیے ہوئے ہے اور ذرہ ذرہ میں اُس کی موجودگی کی جھلک موجود ہے۔ لاشعوری طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ رب تعالیٰ عرش پر موجود ہے اس لیے جب بھی ہم رب کو پکارتے ہیں تو بے اختیار ہماری آنکھیں عرش کی طرف اُٹھتی ہیں۔ ورنہ در حقیقت وہ ہر جگہ موجود ہے۔ ہم جہاں سے بھی اُسے پکاریں وہ ہماری پکار کو سنتا اور اس کا جواب دیتا ہے۔ تو یہ قصہ شعور اور لاشعور کے درمیان ہے۔

سوال: آپ نے پیر اور مرید کا تعلق یہ بتایا تھا کہ مرشد محض اپنے مرید کی راہ نمائی کرتا ہے جب کہ ولی اللہ میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر اُن کے مرشد پیر شاہ غازی حضرت دمڑی والی سرکار رحمۃ اللہ علیہ کے دربار کے بڑے دروازے پر لکھا ہے۔

پیر اوہ میرا دمڑی والا پیر شاہ قلندر

ہر مشکل وچ مدد کردا دونوں جہاں اندر

پھر یہ ولی اللہ کن دو جہانوں میں مدد کی بات کر رہے ہیں؟

جواب: ہمارے ہاں ایک بڑے پہلوان گزرے جن کا لقب تھا "رستمِ زماں"۔ اُن کو دنیا کا سب سے طاقت ور پہلوان کہا جاتا تھا۔ کون جانے کہ دُنیا میں کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو اُن سے زیادہ طاقت ور ہوں گے لیکن وہ Limelight میں نہیں آئے۔ ایک شخص Limelight میں آ گیا اور اُس کی کارکردگی سے خوش ہو کر اُسے رستمِ زماں کا لقب دے دیا گیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُس نے ساری دُنیا کو ہرا دیا تھا۔

اسی طرح پیر اور مرید کے مابین پیری مریدی کے علاوہ ایک رشتہ دل کا ہوتا ہے۔ مرید اپنے اُستاد یا اپنے مرشد سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اُس کے مرشد یا اُستاد ہر جگہ اُس کی مدد کو پہنچیں گے۔ جس طرح رستم زماں کی کارکردگی سے خوش ہو کر اُسے دُنیا کا طاقت ور ترین پہلوان مان لیا گیا اور جس طرح ماں اپنے بچے کو سب سے زیادہ پیار کرتی ہے خواہ وہ شکل و صورت میں کم تر ہی ہو۔ اسی طرح مرید اپنے مرشد کو سب سے زیادہ کامل انسان سمجھتا ہے اور اپنے تعلق اور مرشد سے وابستہ توقعات کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ مرشد دُنیا و آخرت میں اُس کی مدد کریں گے حالانکہ ہم سب سمجھتے ہیں کہ وقتِ حساب کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ ہر انسان کو اپنے اعمال کا حساب خود دینا ہوگا۔ لہٰذا یوں سمجھنا کہ ہمارا مرشد روزِ حساب ہماری کوئی مدد کر سکے گا درست نہیں ہے۔

اسلام اعتدال کا سبق سکھاتا ہے۔ اگر ہم محبت میں بھی اعتدال کے دائرے میں رہیں تو یہ ہمارے حق میں بہتر ہے۔ مرشد اور مرید کا تعلق بیان کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ مرید پر لازم ہے کہ وہ اپنے مرشد کو انسان سمجھے۔ اُسے انسان ہی کے مقام پر دیکھے اور ہر انسان کی طرح اُس سے بھی غلطی کی توقع رکھے۔ جب ہم محبت میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں اور مرشد کو Super human سمجھنے لگتے ہیں تو اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مرشد میں کوئی خامی یا غلطی دیکھ کر ہمیں جھٹکے لگتے ہیں اور ہم اپنی توقعات کی وجہ سے اُس سے متنفر ہونے لگتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم مرشد کو اپنے جیسا عام انسان سمجھیں گے تو اُس کو غلطی کرتا دیکھ کر ہم مایوس نہیں ہوں گے۔ اُسے انسان سمجھ کر معاف کر دیں گے اور یوں محبت کا وہ تعلق اُسی طرح قائم رہے گا۔

اسی طرح پیر صاحب جب آپ کی مشکل میں مدد کو نہیں پہنچتے اور آپ کی اُلجھن کا حل نہیں بتاتے تو آپ پریشان نہیں ہوں گے۔ جب آپ کے ڈوبتے بیڑے کو وہ بچا کر سمندر کے کنارے پر نہیں لائیں گے تو آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ اس مایوسی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم مرشد کو کوئی مافوق الفطرت چیز یا Super human نہیں بلکہ ایک انسان سمجھیں۔

میاں محمد بخش صاحب کے مرشد پیر شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں میں بھی حاضر ہوتا رہا ہوں۔ وہ بہت اعلیٰ پائے کے بزرگ ہیں۔ بہت بڑے عاشقِ رسول ﷺ ہیں۔ عشق کا یہ عالم ہے کہ اُن کی آنکھیں پوری نہیں آدھی کھلی ہوتی ہیں۔ لیکن ہیں بہرحال وہ انسان ہی۔ بحیثیت انسان اُن کی جو حدود ہیں اُن سے وہ باہر نہیں جا سکتے۔

شاعری میں عموماً مبالغہ ہوتا ہے۔ اگر شاعری میں کسی کو چاند کا ٹکڑا کہہ دیا جائے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ حقیقتاً چاند کا کوئی بچھڑا ہوا حصہ ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنے سوال میں جس Expression کی طرف اشارہ کیا ہے یہ ایک مرید کی طرف سے اپنے مرشد کے لیے محض محبت کا اظہار ہے کیونکہ پیر خواہ کیسے ہی بلند مرتبہ پر کیوں نہ ہو رہے گا وہ انسان ہی۔ وہ انسانی حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔

یہ توقع نہ رکھیے کہ بروزِ قیامت مرشد یا اُستاد آپ کے کام آئے گا۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود

جواب وہ ہے۔

ایک بار پھر عرض کر دوں کہ اس تمام گفتگو کا مقصد پیر شاہ غازی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مقام کو کم کرنا ہرگز نہیں۔ بلاشبہ وہ بہت بلند مقام ولی اللہ ہیں۔ میرے دل میں اُن کا بے حد احترام اور محبت ہے۔ لیکن تمام تر احترام و محبت کے باوجود میں اُنھیں انسان ہی سمجھتا ہوں۔

سوال: بڑے شاہ صاحب (سید یعقوب علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ) کے وصال کے بعد آپ کی Feelings (احساسات) کیا تھیں؟

جواب: ہر شاگرد کو اپنے اُستاد سے بے پناہ محبت ہونی چاہیے۔ کیوں کہ وہ محبت علم سیکھنے میں مددگار ہوتی ہے۔ انسان ڈر اور خوف سے جب احکامات کی تعمیل کرتا ہے تو وہ دل سے نہیں ہوتی بلکہ انسان اُن احکامات کو ٹالنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ یا نیم دلی سے اُنھیں سرانجام دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ کسی سے پیار کرتا ہے تو اُس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کو پورا کرنے، اپنانے اور اُس پر عمل پیرا ہونے کی تگ و دو کرتا ہے۔

مجھے بھی اپنے مرشد سے پیار ہے۔ ایک زمانہ میں بڑے شاہ صاحب بہت بیمار ہو گئے تھے۔ میں اُن کے پاس اُس وقت پہنچا جب وہ عالمِ نزع میں تھے۔ رات کا ایک بجا تھا۔ وہ بہت تکلیف میں تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔

''لو میاں! ہم تو جا رہے ہیں۔''

مرشد کے ساتھ محبت کی وجہ سے میں یہ سوچ ہی نہیں پا رہا تھا کہ وہ چلے جائیں گے۔ تب میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار گستاخی کی کہ میں مرشد صاحب کی Back پر بیٹھ گیا اور کوشش کی کہ اُن کے کندھے دبا کر اُنھیں تھوڑا سا Comfort (آرام) فراہم کر دوں۔ اُس وقت بے اختیار میرے دل سے دعا نکلی

''یا باری تعالیٰ! مجھے ان کی بہت ضرورت ہے۔ تو مہربانی فرما اور انھیں کچھ مزید زندگی بخش دے۔''

ساتھ ہی خیال آیا کہ نہ جانے یہ دُعا قبول ہو گی بھی یا نہیں۔ تب میں نے یہ دُعا کر دی:۔

''یا باری تعالیٰ! اگر ان کی زندگی کے سانس گنے جا چکے ہیں تو میری زندگی کے سال کم کر دے اور وہ میرے مرشد کو بخش دے۔''

اس دُعا کے بعد میں نے وہ گستاخی کی جس کا ذکر میں نے ابھی کیا تھا کہ میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار اُنھیں دم کر دیا۔ دم کے بعد وہ فوراً سکون میں آ گئے اور پیچھے مڑ کر کہا'' تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔'' لیکن بہرحال فائدہ یہ ہوا کہ وہ عالمِ نزع سے نکل آئے اور اُن کی طبیعت بہتر ہو گئی۔

بات یہ ہے کہ کسی بھی شاگرد یا مرید کے لیے اپنے اُستاد یا مرشد کو آنکھوں کے سامنے رُخصت ہوتا دیکھنا بہت مشکل ہے۔ ہر انسان بے بس ہے۔ اُس کی اپنی Limitations ہیں۔ موت کو تو وہ روک نہیں سکتا لیکن دُعائیں ضرور کر سکتا ہے۔ لیکن رب کے کام اٹل ہیں۔ اگر کسی طریقہ سے زندگی طویل ہوتی ہو تو ماں اپنے بچے کو

کبھی مرنے ہی نہ دے۔ بہر حال اُن نازک اور حساس لمحات میں، میں نے اپنی زندگی کے کچھ سال اپنے مرشد کو دینے کا سوچا جس سے میری Feelings کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جس سلسلہ میں مجھے پہلی خلافت عطا ہوئی اُس میں ایک رسم چلی آرہی ہے کہ جس شاگرد کو خلافت عطا ہونے والی ہوتی ہے مرشد کے وصال کے وقت وہ وہاں موجود نہیں ہوتا۔ مرشد کے انتقال کے فوراً بعد وہاں پہنچتا ہے اور کفن دفن اور جنازہ کا انتظام کرتا ہے۔

یہ اچھا ہوا کہ مرشد صاحب کے وصال کے وقت میں وہاں موجود نہ تھا۔ ورنہ میرے لیے یہ سب برداشت کرنا دشوار ہوتا۔ اس میں دو چیزیں ہیں:-

1۔ صبر

2۔ اللہ کی قضا پر راضی رہنا

مرشد سے محبت اور یہ خواہش کہ وہ کبھی مجھ سے جدا نہ ہوں...... اپنی جگہ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مرشد کے وصال پر انسان چیخ وپکار کرے اور اپنے غم کا دوسروں پر اظہار کرے۔ مرشد کی محبت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اُن کی تعلیمات کو Demonstrate کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ اور اس Demonstration کا موقع وہ ہوتا ہے جب مرشد رُخصت ہو رہا ہو تو اس وقت مرشد کی تعلیمات کے عین مطابق صبر اور رب کے فیصلہ پر بخوشی راضی ہونے کا اظہار کیا جائے۔ آسان لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ انسان کی زندگی میں یہ ایک Test آتا ہے کہ اتنا عزیز ترین انسان آپ کی زندگی سے جا رہا ہے اور اُس وقت انسان سب کچھ اپنے اندر ضبط کر کے اتنا Normal behave کرے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تب انسان اُس Test میں پاس ہوتا ہے۔ کیوں کہ مرشد آپ کو یہی سکھاتے ہیں کہ رب کی طرف سے جو آجائے آپ اُسے ہنسی خوشی تسلیم کر لیں۔

ایک بزرگ نے رضا کی تعریف یوں کی ہے:-

"جس طرح خوشیاں ملنے اور نعمتیں حاصل کرنے پر انسان خوشی کا اظہار کرتا ہے مصیبت آجانے پر بھی اُسی خوشی کا اظہار کرے۔ یہ رضا ہے۔"

رضائے الٰہی پر راضی ہونا بنیادی تعلیمات میں سے ایک ہے۔ انسان سمجھتا ضرور ہے کہ مرشد کے چلے جانے کے بعد میں ہر قسم کے مصائب اور Problems کے سامنے Directly expose ہو گیا ہوں۔ درمیان میں کوئی ڈھال نہیں رہی۔ ساتھ ہی اُسے ذمہ داری کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اپنے مرشد کے مشن (Mission) کو مجھے چلانا ہے اور اپنے مرشد صاحب کا نام بلند کرنے کے لیے اس Mission کو پہلے سے زیادہ بہتر طریقے سے چلانا ہے۔ یہ Feelings بھی ساتھ ہی پیدا ہوتی ہیں۔

غالباً سوال کرنے والے صاحب میری Feelings کو ایک خاص Angle (زاویہ) سے جاننا چاہتے

ہیں تو عرض کر دیتا ہوں۔ ایک بار مرشد صاحب نے فرمایا کہ میں تو فقیر آدمی ہوں۔ درویش ہوں۔ جو شخص جس مقصد کے لیے آتا ہے میں کوشش کرتا ہوں اُس کو وہی دے دوں۔ دُنیاوی فائدہ اور دُنیا کے حصول کے لیے آنے والوں کو میں دُنیا کے حصول کے طریقے بتا دیتا ہوں۔ تب مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے "تمھارا چہرہ مجھے بہت پہلے دکھا دیا گیا تھا۔ لیکن تم نے آنے میں بہت دیر کر دی اس لیے تمھارا حصہ میں نے تمھیں فوراً دے دیا کیونکہ تم آئے ہی علم کے حصول کے لیے تھے۔" پھر انھوں نے اس علم کی خوبی بتائی (جسے Publicly بیان کرنا مناسب نہیں)۔ جب وہ علم کی خوبی بیان کر چکے تو خوش ہو کر میں نے عرض کیا "اب تو اس علم کے حامل دو انسان ہو گئے ایک آپ اور دوسرا میں۔" فرمانے لگے "یہ تمھاری بھول ہے۔ تم اس علم کی معراج کو اُس وقت پہنچو گے جب مجھے دفن کر کے 72 قدم چلو گے اور فاتحہ پڑھو گے۔" الحمد للہ ایسا ہی ہوا۔ اُن کو دفن کرنے کے بعد جب میں 72 قدم چلا اور وہاں میں نے فاتحہ پڑھی تو اچانک مجھے اپنے وزن میں اضافہ کا احساس ہوا۔ یہ جسمانی وزن میں اضافہ نہ تھا بلکہ اُس وقت علم اپنے زوروں پر مجھے عطا ہوا تھا۔

قصہ مختصر دُنیا تو یونہی چلتی رہتی ہے۔ مرشد صاحب، ماں باپ سب رُخصت ہو جاتے ہیں۔ انسان دُنیا کے معاملات ویسے ہی نبھاتا رہتا ہے۔ البتہ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ مجھے توفیق عطا فرما دے کہ جس طرح میرے مرشد نے یہ علم عطا فرما کر اور اللہ کی راہ دکھا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا میں اُس احسان کا ایک معمولی سا حصہ ہی چکا دوں۔ وہ اس طرح کہ میں اپنے مرشد کا نام اس دُنیا میں روشن اور بلند کر سکوں۔ یہ میری خواہش ہے اللہ تعالیٰ میری اس خواہش کو پورا فرما دے۔ (آمین)

علم سے عقل تک

تخلیق کائنات کے بارے میں ہم سب کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے 'کن' کہا اور یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ رب تعالیٰ ایسا صاحب قدرت وکمال ہے کہ اُسے کسی بھی کام کو کرنے کے لیے خود تردد یا محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اُس کا بس ایک اشارہ ہوتا ہے اور وہ کام ہو جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت 'کُن فیکون' ہے۔

قرآن پاک میں سورۃ فاتحہ علیحدہ صفحہ پر ہوتی ہے۔ پہلا پارہ 'الم' سے شروع ہوتا ہے۔ کچھ سورتوں کے بارے میں خصوصیت بتا دی گئی جیسے سورۃ یٰسین کو قرآن پاک کا دِل کہا گیا۔ سورۃ فاتحہ پہلے پارہ سے علیحدہ دکھائی دینے کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ انسانی جسم میں جو فعل بھی سرزد ہوتا ہے اُس میں سب سے پہلے نیت اور ارادے کا دخل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر میں یہ ارادہ کروں کہ اپنے برابر پڑی چیز کو دائیں ہاتھ سے اُٹھالوں تو پہلے میں ارادہ کروں گا۔ پھر چاہوں گا کہ وہ چیز اُٹھاؤں۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ پہلے میں نیت اور پھر ارادہ کروں گا۔ جونہی میں نے قریب رکھی چیز کو اُٹھانا چاہا تو اس خیال کی Processing میرے دماغ میں شروع ہو گئی۔ میری آنکھیں اُس چیز کو دیکھتی ہیں۔ میرا دماغ اُس چیز کے وزن کو تولتا اور میرے جسم کو تیار کرتا ہے کہ اتنی وزنی چیز اُٹھانے سے اتنا بوجھ جسم پر آئے گا۔ آپ نے دیکھا ہو گا جب ہم کوئی چیز اُٹھانے لگتے ہیں اور اُس کا وزن اگر اُس کی ظاہری جسامت یا ہمارے اندازے سے زیادہ ہو تو وہ چیز اُٹھاتے ہوئے ہماری ریڑھ کی ہڈی کی Disk (مہرہ) Slip ہو جاتی ہے کیوں کہ دماغ نے اُس کو اتنے وزن کے لیے تیار نہیں کیا ہوتا۔ Processing کا یہ سارا عمل مائیکرو سیکنڈز میں ختم ہوتا ہے۔

دماغ ہے تو جسم کا حصہ اور بظاہر یہ جسم کے ساتھ جُڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقتاً یہ جسم سے علیحدہ ہے۔ جسم اور دماغ میں Link گردن کا ہے۔ گردن میں طاقت اور سختی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ریڑھ کی ہڈی کے مہرے رکھے ہیں اور اس میں جو نسیں ہیں وہ پیغامات کو ریڑھ کی ہڈی تک لے جاتی ہیں۔ بعینہٖ سورۃ فاتحہ قرآن پاک کا حصہ ہوتے ہوئے بھی پہلے پارہ کے طور پر نہیں بلکہ علیحدہ حصہ کے طور پر متصور ہوتی ہے۔ سورۃ فاتحہ قرآن کا دماغ ہے۔

قرآن پاک کی سب سے لمبی سورہ، سورۂ البقرہ ہے جو تقریباً ڈھائی پاروں پر محیط ہے۔ قرآن پاک کی ترتیب حیران کن ہے۔ اگر ہم غور کریں اور سورۂ فاتحہ کی آیات اور اُن کا مفہوم سمجھیں تو پتا چلتا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں بھی یکجا آ گیا ہے۔

جب تخلیق رُوحِ انسانی کا ذکر ہوا تھا تو میں نے عرض کیا تھا کہ آسمان سے جب کسی رُوح کو روانگی کا حکم ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ جب کسی رُوح کا متعلقہ جسم زمین پر وجود میں آتا ہے تو اس رُوح کو دُنیا کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔ روانگی کے وقت اُس کے ذمہ جو کام یا Task لگایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ رُوح اپنے خالق کی طرف رُجوع رکھے گی۔ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ رُوح کے اسی Task یا ذمہ داری کی یاد دہانی کراتا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں بعینہٖ وہی دُعا نظر آتی ہے۔ غور کیجیے سب سے پہلے اس میں تعریف ہے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ پھر اللہ کی بزرگی کا اقرار ہے اور اس کے ساتھ یہ اقرار بھی کہ میرا خالق میرا رب ہے جو تمام عالمین کو پالنے والا ہے۔ اس سے اگلی آیات کا ترجمہ دیکھتے چلیں تو وہ بھی انسان کی تخلیق کے مقصد سے مطابقت رکھتی ہیں۔ وہ دُعا جو ہم رب کی تعریف کرنے اُس کو خالق و مالک اور رب العالمین ماننے کے بعد اُس سے توفیق مانگتے ہیں کہ ہمیں سیدھے راستے پر چلا دے اور پھر اُس کی پناہ بھی مانگتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ کی تمام آیات Final analysis میں ہمیں رُوحِ انسانی کی تخلیق کے مقصد کی طرف لے جاتی ہیں۔ اسی طرح سورۂ بقرہ دراصل خلاصہ ہے کہ رب تعالیٰ کیا چاہتا ہے کہ ہم کس طرح اپنی زندگی گزاریں۔ باقی ساڑھے ستائیس (27½) پارے سورۂ بقرہ کی Explanation ہیں۔ دُنیاوی طور پر سمجھنے کے لیے یوں کہہ لیجیے کہ سورۂ بقرہ رب کی طرف سے عطا کردہ ہمارا Constitution (قانون) ہے کہ ہمیں زندگی کس طرح گزارنا ہے۔ باقی ساڑھے ستائیس (27½) پارے اس قانون کی وضاحت ہیں۔

سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ انسانی زندگی کی پہلی آیت کُن فیکون ہے کیونکہ اس سے کائنات وجود میں آئی۔ کائنات وجود میں نہ آتی تو انسان زمین پر نہ آتا۔ اسی طرح ''قلم'' کُن فیکون کے بعد ہماری زندگی میں دوسرا اہم لفظ ہے۔ قلم بمعنی علم کے آیا ہے۔ چودہ حروفِ مقطعات میں سے ایک حرف ''ق'' بھی ہے جو تین چیزوں کو Depict (ظاہر) کرتا ہے۔ قلم بمعنی علم۔ اسی طرح 'ق' سے مراد قدر اور قیامت ہے۔ اس حرف ''ق'' کا ورد، اس کی تسبیح اور اس کا دور بہت سوچ سمجھ کر کیا جانا چاہیے۔

علم کے بعد جو چیز انسان کی زندگی میں بہت معنی رکھتی ہے وہ عقل ہے اور عقل حاصل نہیں ہو سکتی جب تک ہمارے پاس علم نہ ہو۔ دُنیاوی علم کے بغیر بھی عقل حاصل ہو جائے گی کیونکہ عقل علم سے آتی ہے اور علم انسان دو ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔

1۔ کتاب

2۔ مشاہدہ

اسی لیے جناب حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ''فقیر پر لازم ہے کہ وہ زمین پر گھوم

پھر کر اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرے۔ دُنیاوی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سفر بذاتِ خود ایک بہت بڑا اُستاد ہے کیونکہ انسان کتاب کی نسبت مشاہدے سے زیادہ سیکھتا ہے۔ اگرچہ کتاب بھی اچھا ساتھی ہے لیکن مشاہدے کی اہمیت کتاب سے دوچند ہے۔ اگر کوئی انسان کتاب اور مشاہدہ دونوں ذرائع کو حصولِ علم کے لیے استعمال کرتا ہے تو یہ سونے پہ سہاگا ہے۔

اب گھوم پھر کر مشاہدہ تو آپ نے کر لیا لیکن یہاں آپ کو ایسے گائیڈ کی ضرورت ہوتی ہے جو ان راہوں سے گزر چکا ہو۔ کیوں کہ دورانِ مشاہدہ بہت سی چیزوں کو دیکھ کر ہم سمجھ نہیں پاتے اور ان چیزوں کی توجیہہ اور وضاحت ہمیں درکار ہوتی ہے اور یہ توجیہہ اور وضاحت ہمیں گائیڈ فراہم کرتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر آپ لاہور سے اسلام آباد جا رہے ہیں تو گائیڈ کے فرائض وہی شخص سرانجام دے سکتا ہے جس نے اس Route پر سفر کر رکھا ہو۔ وہی شخص آپ کو بتا سکے گا کہ راستے میں کہاں کہاں نشیب و فراز، اُترائی چڑھائی، خطرات یا سپیڈ بریکرز ہیں۔ وہی گائیڈ بتائے گا کہ اتنے میل سفر کرنے کے بعد گنجان آبادی ہے اور وہاں لوگ بھاگ کر سڑک کراس (Cross) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا وہاں محتاط رہیے گا۔ فلاں جگہ پر بائی پاس اور فلائی اوورز (Flyovers) ہیں۔ یا پھر آپ پوچھتے ہیں کہ فلاں جگہ میں نے ایک عمارت دیکھی تھی جس پر کوئی بورڈ نہیں تھا۔ تب وہ گائیڈ آپ کو بتاتا ہے کہ وہ ایک فیکٹری ہے۔

یہ تو مشاہدہ کی بات ہو گئی جس میں چیزوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں گائیڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح کتاب میں موجود کچھ اصطلاحات اور مواد کو سمجھنے کے لیے بھی ہمیں ایک راہنما درکار ہوتا ہے۔ مثلاً ہم نے کتاب میں ایک Term پڑھی "نفسِ رحمانی" اور ہم نے فرض کر لیا کہ اگر نفسِ رحمانی ہوتا ہے تو نفسِ شیطانی بھی ضرور کوئی Term ہو گی۔ یوں ہم بھول بھلیوں میں اُلجھتے رہیں گے۔ لیکن ایک گائیڈ ہمیں Explain کر دے گا کہ نفسیات کی زبان میں نفسِ رحمانی کو شعور کہتے ہیں۔ تب انسان قہقہہ لگاتا ہے کہ کمال ہے اتنی آسان بات سمجھ میں نہیں آئی۔

مشاہدہ ہو یا کتاب...... دونوں ذرائع سے اکتسابِ علم کرتے ہوئے ہمیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ عموماً ہم کسی کی ظاہری شخصیت، حلیہ، گفتگو اور لفاظی سے متاثر ہو کر اُسے گائیڈ مان لیتے ہیں۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ اُس کی ساری باتیں تو الل ٹپ کے سوا کچھ نہ تھیں۔ یوں وقت کے ضیاع کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گائیڈ یا راہنما کو منتخب کرتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھا جائے۔ گائیڈ کے دو Test ہیں۔ ایک Litmus Test ہے اور دوسری طویل المیعادی آزمائش (Long-term Test)۔ Litmus Test فوری رزلٹ دیتا ہے۔ جیسے ہم کسی صاحب سے ملے، اُن کے پاس چند منٹ بیٹھے، اُن کی گفتگو سنی تو اگر وہ واقعی صاحبِ علم ہیں تو ہمیں اُن میں سے ایک عجیب کشش محسوس ہو گی اور ہم اُن صاحب سے دوبارہ ملنا چاہیں گے۔ دوسری چیز یہ ہو گی کہ اُن صاحب سے ملاقات کے بعد ہمیں ایک عجیب مسرت اور انجانی خوشی کا احساس ہو گا اور تیسری بات یہ ہو گی کہ ہمیں یوں لگے گا جیسے ہمارے کندھوں سے کوئی بوجھ اُتر گیا

ہو۔ یاد رکھیے ایسا اُس آدمی اُس صاحب علم کا کمال نہیں۔ وہ شخص کوئی مافوق الفطرت انسان نہیں۔ بلکہ یہ کشش، یہ انجانی مسرت اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنا، یہ سب درحقیقت اُس کلام پاک کی برکت کی وجہ سے ہے۔ جس کا وہ صاحب علم باقاعدگی اور پابندی سے ورد کرتا ہے۔ کلام الٰہی کے بارے میں خود اللہ پاک کا قرآن پاک میں فرمان ہے:۔

"وہ جو ایمان لائے اور اُن کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں۔ سن لو اللہ کی یاد میں ہی دلوں کا چین ہے۔" (سورۃ الرعد:28)

لہٰذا یہ کشش، خوشی اور سکون اسی کلام پاک کا اعجاز ہے۔ اس لیے آپ اُس شخص کی بجائے اللہ کے کلام سے متاثر ہوئے۔ اُس شخص کے گھٹنوں کو چھونے اور دست بوسی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر آپ بھی اس کلام پاک کا باقاعدگی اور پابندی سے ورد کریں گے تو نہ صرف آپ میں یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں گی کہ لوگ آپ سے مل کر خوشی، سکون اور کشش محسوس کرنے لگیں گے بلکہ آپ کے جسم سے خوشبو بھی آنے لگے گی اور آپ کو کسی عطر یا پرفیوم کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ تو Litmus Test تھا جس کا نتیجہ فوراً سامنے آجاتا ہے۔

دوسرا Long-term Test (طویل المیعادی آزمائش) ہے۔ اگر آپ صاحب علم کے پاس باقاعدگی سے جاتے ہیں تو وہ کبھی آپ کو نصیحت نہیں کرے گا، کبھی نیکی کی تلقین نہیں کرے گا لیکن اس کے باوجود آپ نیکی کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔ نماز اور دیگر احکامات الٰہی کی پابندی کرنے لگیں گے۔ سب سے بڑھ کر جو تبدیلی آپ اپنے اندر محسوس کریں گے وہ یہ کہ آپ کے دل سے دُنیا کی محبت نکل گئی ہے۔ صاحب علم کا یہ بہت بڑا Test ہے کہ اُس کے نصیحت کیے بغیر دُنیا کی محبت آپ کے دل سے نکل جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ سمجھ جائیے کہ اب آپ کو علم عطا کرنے کے لیے گراؤنڈ تیار کر کے دے دی گئی ہے۔ یاد رکھیے حُب دُنیا دل سے نکل جانے کے بعد ہی علم عطا ہوتا ہے۔ اپنی شخصیت میں تبدیلی کا تب پتا چلتا ہے جب آپ اپنے رویوں اور علم پر خود چونکنے لگتے ہیں۔ پہلے آپ کسی کو کچھ دیتے ہوئے دس بار سوچتے تھے۔ اب بغیر دیکھے خاموشی سے جو ہاتھ آیا دینے لگتے ہیں۔ صاحب علم کے پاس جانے سے پہلے چھوٹا سا نقصان بھی آپ کو بے حد پریشان کر دیا کرتا تھا لیکن اب یوں ہونے لگا کہ نقصان ہونے پر آپ ذرا سا پلٹ کے دیکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں "کوئی بات نہیں اللہ نقصان پورا کر دے گا۔ کوئی پرواہ ہی نہیں۔" گائیڈ مل جانے کے بعد آپ کو صدمہ سے دوچار ہونا پڑے یا خوشی ملے آپ ہر حال میں کہتے ہیں "یا اللہ! تیرا شکر۔" "یہ سب کیا ہے؟ یہ وہی مقام تو ہے جس کے بارے میں حضرت علیؓ نے فرمایا تھا" جب پانے کی خوشی اور کھونے کا ملال نہ رہے تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو۔"

ایک اور تبدیلی جو بتاتی ہے کہ علم حاصل ہو رہا ہے۔ پہلے آپ پریشانی آنے پر ہر ایک سے اس سلسلہ سے جان چھوٹنے کے طریقے پوچھا کرتے تھے۔ لیکن اب صاحب علم اور گائیڈ کی توجہ سے آپ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ یا پریشانی آتی ہے تو اس کے چند لمحوں بعد اُن مسائل سے نبرد آزما ہونے کے

لیے حل بھی خود بخود فوراً ہی آپ کے ذہن میں آجاتا ہے۔ یہ اسی بات کی علامت ہے کہ آپ میں یہ تبدیلی صاحب علم کی محبت کا فیض ہے۔

زندگی میں جب بھی آپ کو اس طرح کی تبدیلیوں کا احساس ہونے لگے تو سمجھ لیجیے کہ علم حاصل ہو رہا ہے۔ مسئلہ کے بعد فوراً حل ذہن میں آجانا عقل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یوں علم کے بعد عقل حاصل ہو جائے گی۔

یہ صاحب علم کا Test ہے۔ جب وہ ان دونوں Tests (آزمائشوں) پر پورا اُترے تو اُسے راہ نما یا گائیڈ بنا لیجیے۔

سوال: کیا دست بوسی جائز ہے؟ کچھ لوگ درباروں پر جا کر دیواروں کو بوسہ دیتے ہیں۔ مزار کی طرف منہ کر کے دُعا مانگتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: تعظیماً بزرگوں کا ہاتھ چومنا اسلام میں جائز ہے لیکن سوائے رب تعالیٰ کے کسی کو سجدہ روا نہیں۔ بزرگانِ دین کی زندگی میں اگر کوئی تعظیمی سجدہ بھی کرتا تو وہ اُسے زبردستی منع کرتے۔ اب وصال کے بعد چونکہ دُنیاوی تصرفات ان بزرگوں کے پاس نہیں ہیں اس لیے وہ اپنے مزار پر آنے والوں کو سجدہ کرنے سے نہیں روک سکتے۔ غیر اللہ کو سجدہ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ درباروں پر جا کر مسنون طریقے سے فاتحہ خوانی کر لیجیے۔ خانہ کعبہ کے رُخ بیٹھ کر قرآن خوانی کیجیے اور دعا کیجیے "یا اللہ پاک! میں نے جو کلام پاک تلاوت کیا تو اس کا ثواب اپنی رحمت کے صدقے ان صاحب مزار کی رُوح کو پہنچا دے۔"

اگر آپ دُعا کرنا چاہتے ہیں تو رب کے حضور دُعا کیجیے "یا اللہ پاک! تو رحمٰن و کریم اور مہربان ہے۔ تو اپنے رحیم و کریم ہونے کے صدقے آپ ﷺ اور اپنے محبوب بندوں کے صدقے ہم پر رحم و کرم فرما۔"

رب کے سوا کسی اور سے دُعا مانگنا گناہ ہے۔

سوال: آپ نے فرمایا علم کے بعد عقل ملتی ہے۔ کیا علم Itself عقل نہیں؟ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب: آپ آگ جلاتے ہیں اور اس آگ پر ایک کیتلی میں پانی Boil کرتے ہیں۔ اب آگ بذاتِ خود ایک عنصر ہے جو حدت پیدا کر رہا ہے اور اس حدت یا حرارت کو آپ پانی اُبالنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اگر آگ جل رہی ہو لیکن آپ اس کمرہ میں Temperature (درجۂ حرارت) اتنا کم کر دیں کہ دونوں Equalise ہو جائیں تو پانی Boil نہیں ہوگا۔ یوں آگ بذاتِ خود پانی کو Boil نہیں کر سکی۔ دراصل آپ نے اس کی حدت کو پانی اُبالنے کے لیے استعمال کیا۔ ورنہ اگر آگ پانی کو Boil کر سکتی ہوتی تو Cooling unit سے ٹمپریچر Equalise کرنے کے بعد بھی پانی گرم ہو جاتا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ آگ سے پیدا ہونے والی حدت کو Arrest کر لیا جائے تاکہ پانی Boil نہ ہو سکے۔ اسی طرح اگر ہم علم کو اپنے دل میں Arrest نہ کریں تو اس کو Utilise نہیں کر سکتے اور علم استعمال نہ

کیا جائے تو بے کار ہے۔ اسی لیے محاورہ ہے کہ علم بغیر عمل کے بے کار ہے۔ اور یہ عقل اسی وقت آتی ہے جب ہم علم سے استفادہ کرتے ہیں۔ یوں سیکھنے کا عمل جاری رہتا ہے۔

مثلاً ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اگر میں Convex lens لے لوں اور اس کی Adjustment کرلوں تو سورج کی شعاعیں ایک نقطۂ اشتعال پر کاغذ کو جلا دیں گی۔ پریکٹیکل کر کے ہی میں اس تھیوری کو سمجھ سکوں گا اور اس کے بعد ہی میں اس تھیوری کو بہت سی جگہوں پر Apply کرسکوں گا۔ اس تھیوری کو اپنے گیزر پر استعمال کر کے میں پانی گرم کرلوں گا۔ علم بذاتِ خود کوئی کام نہیں کرتا۔ جب تک اس کو Exercise نہ کیا جائے اس سے استفادہ ممکن نہیں۔ یہ مشق ہی ہے جو دراصل عقل کو بڑھانے کا موجب بنتی ہے۔

قربِ الٰہی

سوال: ماہ رجب کے تین روزے رکھنے کے بعد یہ کیسے پتا چلے گا کہ اللہ کی دوستی اور قرب عطا ہو گیا ہے؟

جواب: میں نے پہلے بھی گزارش کی تھی کہ اعلیٰ ترین عبادت وہ ہے جو بے غرض اور بے لوث ہو۔ اس کے پیچھے جذبہ صرف ایک ہو کہ میرا رب اتنا عظیم، اتنا مہربان اور اتنا کریم ہے کہ صرف وہی لائق عبادت ہے اس لیے میں اُسی کی عبادت کروں۔

عبادت کئی طرح کی ہے...... روزہ بھی ایک عبادت ہے۔ کسی مقصد کے تحت روزہ رکھنا ادنیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ Game کی طرح رُوحانیت کے بھی کچھ آداب ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے سے نقصان ہوتا ہے۔ جس شخص نے یہ تابنگ رکھی کہ عبادت کے نتیجہ میں مجھے آج کچھ ملا یا نہیں یا آئندہ کچھ ملے گا یا نہیں...... اُسے ساری عمر کی عبادت کے بعد بھی کچھ نہیں ملتا۔ جس شخص نے بغیر کسی لالچ کے یہ سوچ کر عبادت کی کہ میرا رب لائق عبادت ہے، اُسے بہت جلد، بہت کچھ عطا ہو گیا۔ بہتر یہی ہے کہ رجب کے روزے ہوں یا شعبان کے، کسی بھی لالچ اور غرض سے بالاتر ہو کر رکھے جائیں۔ دل میں یہ سوچ اور جذبہ ہو کہ ہمارا رب لائق عبادت ہے۔ پھر آپ کو بہت کچھ مل جائے گا۔

باقی اس سوال کے جواب میں عرض کردوں کہ رب کے راضی ہونے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسان خود کو راضی بہ رضا محسوس کرنے لگتا ہے۔ کوئی خوشی ہو یا غم...... انعام ہو یا سزا...... دُکھ ہو یا سکھ، انسان سب حالات کو ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ برداشت کرنے لگتا ہے۔ جب ایسا محسوس ہو تو سمجھ لیجیے کہ رب آپ سے راضی ہو گیا ہے اور جس بندے سے وہ راضی ہو جاتا ہے اُسے اپنا قرب اور دوستی عطا کر دیتا ہے۔

سوال: اگر رب کی دوستی اور قرب حاصل ہو جائے تو اُسے Everlasting کیسے بنایا جاسکتا ہے؟

جواب: ہم بائیسکل، موٹر سائیکل، کار یا جہاز چلاتے ہیں۔ جہاز Land کرتا ہے تو اُس کے انجن Full Throttle پر ہوتے ہیں۔ پورا زور لگا رہے ہوتے ہیں۔ جونہی جہاز Take off کرتا ہے ایک خاص بلندی پر پہنچتا ہے تو ان Throttles کو Cruise پر کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس میں انجن تھوڑا سا زور لگا رہے ہوتے ہیں اور ہوائی جہاز اُڑتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب گاڑی کھڑی ہے تو ہم اسے حرکت دینے کے لیے فرسٹ

گیئر لگاتے ہیں۔ جہاں پر انجن Maximum power کو ٹرانسمشن کے ذریعے Wheels پر Transfer کر رہا ہوتا ہے۔ جوں جوں کار سپیڈ (Speed) پکڑتی جاتی ہے ہم گیئر تبدیل کرتے جاتے ہیں حتیٰ کہ کار کو آخری گیئر میں ڈال دیتے ہیں جہاں انجن بہت کم زور لگاتا ہے۔ اسی طرح جب انسان کسی درجہ پر پہنچتا ہے تو پھر وہ روٹین (Routine) میں عبادات کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ فقیر وہ ہے جو دُنیا بھر کی مشقتیں اُٹھا رہا ہوتا ہے۔ جب وہ فقیر کے درجہ سے بلند ہو کر صوفی کے درجہ پر پہنچتا ہے تو رب تعالیٰ اُس پر سے مشقتیں اُٹھا دیتا ہے اور وہ روٹین (Routine) کی عبادات کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب رب تعالیٰ ہم سے راضی ہو گیا پھر اگر ہم روٹین کی عبادات بھی کرتے چلے جائیں گے اور اپنے معمولات ادا کرتے چلے جائیں گے تو رب تعالیٰ راضی رہتا ہے۔

سوال: چند وظائف کے بعد سونا لازمی کیوں ہوتا ہے؟ اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: چند ایک وظائف ایسے ہیں جن کے بعد سونا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے بسم اللہ الرحمن الرحیم والا وظیفہ ہے یا سورۂ فاتحہ کا وظیفہ ہے۔ سوتے وقت عشاء کی نماز کے بعد ایک خاص تعداد میں اگر سورۂ فاتحہ پڑھی جائے تو اس کے بعد لازم ہے کہ بغیر بات کیے سو جائیں۔ اس صورت میں پڑھائی کے جو اثرات جسم، ذہن اور رُوح پر مرتب ہوتے ہیں وہ سونے کی وجہ سے Store ہو جاتے ہیں۔ اگر وظیفہ کے بعد آپ سو جائیں تو یوں کہہ لیجیے کہ وہ اثرات جسم، رُوح اور ذہن پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ بھلے 15 منٹ ہی سو لیں اور اس کے بعد اُٹھ کر بات چیت کر لیں۔ کیوں کہ اگر وظیفہ پڑھنے کے فوراً بعد بات کریں گے تو اس کا اثر کچھ ایسا ہو گا کہ جیسے کسی Object پر اگر Static charge آ جائے اور اُسے آپ زمین پر Touch کر دیں تو وہ Static charge زائل ہو جائے گا۔ اسی طرح وظیفہ کے فوراً بعد جب ہم دُنیاوی Activity کرتے ہیں تو وہ ان اثرات کے لیے Earthing کا کام کرے گی اور وظیفہ کے اثرات ضائع ہو جائیں گے۔ اسی لیے ان اثرات کو محفوظ رکھنے کے لیے Nap لے لیا جاتا ہے۔ بھلے وہ Catnap ہی کیوں نہ ہو۔

سوال: کیا بُرے آدمی کی رُوح بھی اسی طرح قبض کی جاتی ہے جس طرح نیک آدمی کی؟ کیا سب کو رُوح قبض ہونے کے دوران تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے؟

جواب: رُوح قبض ہونے کا جو عمل ہے وہ اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ وہ تو ہلکی سی سنسناہٹ ہوتی ہے جس کا آغاز پاؤں کے انگوٹھے سے ہوتا ہے۔ اس سنسناہٹ کے ساتھ انسانی ذہن یوں محسوس کرتا ہے جیسے اُس کا جسم رفتہ رفتہ فضا میں بلند ہو رہا ہے اور ایک عجیب سناٹا چاروں طرف پھیل رہا ہے۔

پاؤں کے انگوٹھے کی Tip سے رُوح قبض ہونا شروع ہوتی ہے اور Gradually ذہن کے آخری حصہ تک پہنچ جاتی ہے۔ یوں رُوح قبض ہونے کا عمل کچھ زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے۔ البتہ نزع کا عالم جو مرنے سے کچھ دیر پہلے شروع ہوتا ہے اس میں کچھ لوگوں کو تکلیف سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ رُوح قبض ہونے کی کیفیت میں بہت سرور ہے۔ اس سرور کی کوئی مثال بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس میں ہلکی ہلکی سنسناہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ فضا میں اوپر اُٹھ رہا ہے اور اس کے چاروں اطراف گہرا سناٹا چھا رہا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ طویل بیماری کے بعد انتقال کرتے ہیں۔ ایک حدیث مبارکہ کے مطابق بیماری سے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ ماسوائے پیغمبروں کے ہر انسان سے خواہ وہ کیسے ہی بلند مقام و مرتبہ پر کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی گناہ سرزد ہو ہی جاتا ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی کرم نوازی ہے کہ وہ بیماری کے ذریعہ اپنے بندوں کے گناہ جھاڑ دیتا ہے۔

تخلیق رُوحِ انسانی

بنیادی طور پر انسانی جسم کے چار اجزاء ہیں:۔

1۔ مٹی

2۔ پانی

3۔ ہوا

4۔ آگ

رُوحانیت میں ہم یہ کہتے ہیں کہ مٹی ثقیل مطلق ہے۔ جو چیز ثقیل ہے سائنس اور انگریزی میں اُسے Opaque کہتے ہیں۔ جس کے آر پار دیکھا نہ جاسکے اُسے اُردو میں ثقیل کہا جاتا ہے۔ مٹی کے آر پار کسی طور دیکھا نہیں جاسکتا۔ یہ اس کی ایک صفت ہے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ مٹی بھربھری ہو جاتی ہے۔ مٹی کی تیسری صفت یہ ہے کہ اس میں چکناہٹ ہوتی ہے۔ چکناہٹ کی وجہ سے مٹی بھربھری ہونے کے باوجود ایک شکل اختیار کر لیتی ہے اور جب تک اُسے ٹھیس نہ لگائی جائے یہ شکل قائم رکھتی ہے۔

دوسرا عنصر ''پانی'' ہے۔ جو ثقیل مصاف ہے۔ اس کی خاصیت شفافیت ہے۔ اس میں ہلکی سی چکناہٹ بھی ہوتی ہے۔

تیسرا عضو ''ہوا'' ہے یہ خفیف و جاذب ہے۔ اس میں لطافت ہے۔ یہ نمی کو جذب کرنے کی قوت بھی رکھتی ہے لیکن یہ ثقیل نہیں ہے۔

چوتھا عنصر ''آگ'' ہے۔ اس میں فنا کی قوت ہے۔ اور وہ مطلق ہے۔ یہ ہر چیز کو فنا کرتی ہے۔

اب ان چاروں بنیادی عناصر (Basic elements) کی خاصیت اگر ہم رُوحانی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ سب عناصر ایک دوسرے سے متضاد (Opposite) نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ بھی Common نہیں ہے لیکن یہ پھر بھی یک جا ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اعجاز ہے ''کُن فیکون'' کا۔ چونکہ یہ رب کا حکم ہے اس لیے ہی چاروں بنیادی عناصر متضاد ہونے کے باوجود ایک جگہ قائم

ہو جاتے ہیں۔ جب ان چاروں عناصر سے انسان کا پُتلا بنتا ہے اور اس میں حلول نورِ حق پھونکا جاتا ہے تو پُتلے میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ حرکت علامت ہے زندگی کی۔ پھر وہ زندہ پُتلا اپنے اندر دو حسیات رکھتا ہے۔

1۔ عنانی حس

2۔ غیر عنانی حس

یہ رُوحانیت کی اصطلاحات ہیں جنھیں آسان زبان میں شعورِ فطرت اور لاشعورِ فطرت کہا جاتا ہے۔ ان دونوں فطرتوں کو جو چیز Bridge کرتی ہے وہ نفسِ رحمانی کہلاتی ہے۔ نفسِ رحمانی ہی انسانی زندگی میں سب کچھ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ہمیں ایسے باغ میں لے جاتی ہے جہاں فطرت کے مختلف رنگ و بو پھیلے ہیں۔ یہی حس ہمیں اُس گلستان میں لے جائے گی جہاں گوہرِ نور المروارید پایا جاتا ہے۔ اور یہی وہ حس ہے جو ہمیں اُس گلستان تک لے جاتی ہے جہاں خوشبوئے وحدت ہوتی ہے۔ اور یہی وہ حس ہے جو ہمیں وہاں لے جاتی ہے جہاں باغ کے بیچوں بیچ خوشبوئے دریائے وحدت رواں ہے۔

حروفِ مقطعات کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ تمام حروفِ مقطعات درحقیقت رب تعالیٰ کا وہ تحفہ ہیں جو اُس نے علم الاسما کی صورت حضرت آدم علیہ السلام کو تو سکھائے ہی تھے لیکن اس کی وضاحت اور اصل حقیقت بطور تحفہ شب معراج آپ ﷺ کو عطا فرمائی تھی۔

انہی حروفِ مقطعات میں دو حروف "ق" اور "ن" ہیں۔ جس دریائے وحدت کا ابھی ذکر ہوا ہے اُس کا ایک کنارہ "ق" اور دوسرا کنارہ "ن" ہے۔

"ق" سے مراد "قلم" اور قلم سے مراد "علم" ہے۔ دریائے وحدت کا کنارہ "ق" Represent (ظاہر) کرتا ہے علم کو۔

نفسِ رحمانی جو ہمیں ان سب جگہوں پر پہنچاتا ہے اور ان مقامات کی سیر کراتا ہے، کو قابو کرنا ہی اصل ریاضت ہے۔ کیوں کہ یہ شعورِ فطرت اور لاشعورِ فطرت کو Bridge کر رہا ہے۔ اگر ہم نے اس پر قابو پالیا تو ہم اپنے شعور اور لاشعور دونوں پر حکومت کر رہے ہوں گے۔

جبلت پر قابو پایا جا سکتا ہے لیکن لاشعور پر قابو پانا بے حد دشوار ہے۔ اس پر قابو صرف رُوحانیت کے ذریعے پایا جا سکتا ہے۔ انسان کی جبلت ہے کہ وہ دھماکا سنتا ہے تو اُس کا جسم بہت زوردار جھرجھری لیتا ہے۔ پھر وہ جبلی تقاضوں کے تحت دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ دھماکا ہوا کہاں ہے۔ یہ ایک عام آدمی کا ری ایکشن (Reaction) ہوگا جب کہ ایک فوجی کا Reaction یہ ہوگا کہ وہ دھماکا سنتے ہی زمین پر لیٹ جائے گا یہ دیکھنے کے بجائے کہ دھماکا ہوا کہاں ہے۔ یہ دراصل اُس کی ٹریننگ کا نتیجہ ہے جس کے بعد اُس کی جبلت اُسے کھڑے ہو کر جائے دھماکا دیکھنے پر مجبور نہیں کرتی اور لاشعور اُس کا پھر بھی Active رہتا ہے۔

رُوحانیت کے ذریعے جب ہم نیکی کی طرف چلے جاتے ہیں اور اپنے آپ کو Intellectual

strength بخشنے کے لیے ہم مختلف ریاضتیں اور مجاہدے کرتے ہیں اور اس سے ہم ایسی ذہنی قوت حاصل کرتے ہیں جس سے شعور اور لاشعور دونوں کو ہم قابو میں لے آتے ہیں۔ مثلاً شعور یہ کہتا ہے کہ یہ آدمی جو مجھے ایک لاکھ روپیہ رشوت دے رہا ہے اس رقم سے میں اپنی ضروریات پوری کرلوں گا۔ لیکن ساتھ ہی آپ سوچتے ہیں کہ رشوت لینا نیکی نہیں بلکہ جہنم کی راہ ہے۔ یہاں آپ اپنے شعور کو شکست دیتے ہیں اُس قوت کے ذریعے جو آپ کو عبادتوں، ریاضتوں اور مجاہدوں کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے۔ آپ فوراً اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ میرا رب میرا رازق ہے۔ اس نے مجھے پالنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ وہ مجھے پالے گا۔ آپ کا یہ یقین اس بات کا غماز ہے کہ آپ نے اپنے شعور پر قابو پایا ہوا ہے۔ اسی طرح بچپن میں ہونے والی زیادتی انسان کو تشدد پسند بنا دیتی ہے۔ وہ زیادتیاں اُس کے لاشعور میں کہیں موجود ہوتی ہیں۔ جب اُس کے ہاتھ قوت اور Authority آتی ہے تو وہ انسان دوسروں کو لاشعوری طور پر اذیت پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔ اس مقام پر انسان اپنے لاشعور کے ساتھ لڑتا ہے۔ وہ سیدھی راہ پر چلتا اور خود سے کہتا ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ دو۔ یوں انسان غلط کام سے باز رہتا ہے۔

یہ جدوجہد شروع سے لے کر آخر تک جہاد ہے جو انسان ساری عمر کرتا ہے۔ جس طرح جہاد بالسیف میں شہید ہونے والے کے لیے بے پناہ انعامات ہیں اسی طرح جہاد بالنفس کے انعامات بھی بہت زیادہ ہیں اور Ultimate انعام اللہ کا قرب ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بندے کو رب مل جاتا ہے۔

سوال: مٹی، پانی اور ہوا تو انسانی جسم میں ہیں لیکن آگ کا عنصر انسانی جسم میں موجودگی کا پتا نہیں دیتا۔

جواب: آپ کو انسانی جسم میں مٹی، ہوا اور پانی کہاں سے نظر آ گئے۔ ان چاروں عناصر کی دراصل صفات انسانی جسم میں موجود ہیں۔ رُوحانیت سے ہٹ کر اگر ہم بات کریں تو کہا جاتا ہے کہ ایک خاص عنصر انسان پر حکومت کرتا ہے جو انسانی فطرت پر غالب ہوتا ہے۔

علم ہندسہ یا علم الاعداد کو اگر آپ دیکھیں تو وہاں بھی یہ چاروں عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ یہ جو سیاروں کا علم ہے اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ اللہ نے اس سے منع کیا ہے لیکن علم کو بطور علم Discuss کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح دہریت کو بطور علم تو Discuss کرنا نامناسب نہیں لیکن دہریہ ہونا نہ صرف گناہ ہے بلکہ لعنت ہے کہ رب کو ہی نہ مانے انسان۔

انسانی جسم میں ان چاروں عناصر کی Chemical properties پر بات ہوئی کہ مٹی ثقیل مطلق، پانی ثقیل مصاف، ہوا خفیف و جاذب ہے جب کہ آگ میں فنا کی قوت ہے۔ ان چاروں بنیادی عناصر کی Physical properties کا جہاں تک تعلق ہے (یاد رہے کہ جس علم کے تحت یہ بات کر رہا ہوں اُس کا رُوحانیت سے کوئی تعلق نہیں) جن لوگوں میں مٹی کا عنصر نمایاں کام کر رہا ہوگا وہ Down to earth ہوں گے۔ جن لوگوں میں ہوا کا عنصر زیادہ غالب ہوگا اُن کا موڈ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی بہت مہربان تو کبھی بہت سخت۔ علاوہ ازیں ایسے لوگوں کی پوری زندگی میں عروج و زوال کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جن لوگوں میں پانی کا

Element زیادہ Dominate کرتا ہے وہ یکساں سلوک کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ جن کے ساتھ مہربان ہیں اُن کے ساتھ ہمیشہ مہربان ہوں گے تاوقتیکہ کوئی بڑی تبدیلی نہ آجائے۔ اسی طرح اُن کا غصہ بھی زیادہ دیر تک قائم رہتا ہے۔ جن لوگوں میں بنیادی عنصر آگ غالب ہوتا ہے وہ دو سیکنڈ میں بھڑک اُٹھتے ہیں۔

رُوحانیت میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر انسان میں ان چاروں عناصر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ انسان کو رب تعالیٰ نے اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے اور اللہ نے اپنی صفات کا تھوڑا تھوڑا عکس بھی انسان میں رکھا ہے تو انسان اتنا مجبور نہیں ہے کہ اُس کو یہ Basic elements کنٹرول کرلیں بلکہ یہ انسان ہے جو اگر اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت دے تو ان تمام چیزوں پر قابو پا سکتا ہے۔ ریاضت اور مجاہدے کے ذریعے اگر انسان ان عناصر کے منفی اثرات پر غالب آجائے تو وہ اللہ کے مقربین میں شامل ہو سکتا ہے۔

سوال: کیا اللہ تعالیٰ خود بھی کوئی کام کرتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی کوئی مصروفیت نہیں۔ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو محض اشارہ کرتا ہے اور فرشتے وہ حکم بجالاتے ہیں۔ واحد کام جو اللہ خود کرتا ہے وہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنا ہے۔

سوال: اجزائے ترکیبی سے کیا مراد ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ہمیں بنیادی عناصر جسم میں اثرات کی صورت میں ملتے ہیں اصلی حالت یا Compound فارم میں نہیں ملتے؟

جواب: اجزائے ترکیبی سے مراد ایسے اجزا ہیں جن سے مل کر کوئی چیز بنتی ہے وہ Compound کہلاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم کیمسٹری کی کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھیں تو آج سے ایک صدی پہلے کی تحقیق یہ کہتی تھی کہ دُنیا میں صرف چار بنیادی عناصر ہیں۔ مٹی، ہوا، پانی اور آگ۔ لیکن میرے علم کے مطابق آخری ریسرچ بتاتی ہے کہ عناصر کی تعداد 105 تک پہنچ چکی ہے لیکن اس کے باوجود بنیادی عناصر آج بھی چار ہی ہیں۔

انسانی جسم میں ان چاروں عناصر کی صفات موجود ہیں۔ Physically یہ موجود نہیں۔ ایسا نہیں کہ ہم اپنے بازو کو چیر کر دیکھیں تو وہاں ہمیں مٹی، ہوا، پانی یا آگ دکھائی دینے لگے۔ کیوں کہ یہ سب چیزیں ہمارے جسم میں اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہیں۔ انسان مٹی کی صورت میں گوندھا گیا۔ اس میں حلول نورِ حق پھونکا گیا جسے ہم عرفِ عام میں ''رُوح'' کہتے ہیں۔ رُوح امرِ رب ہے۔ رُوح کے حلول کی وجہ سے جسم میں ان بنیادی عناصر کی Chemical composition تبدیل ہو گئی ہے۔ اس لیے ہمیں جسم میں ان عناصر کے صرف اثرات ملیں گے۔ بذاتِ خود یہ عناصر یا ان کا مرکب نہیں ملے گا۔

تقدیر اور تدبیر

سوال: تقدیر اور تدبیر کی وضاحت فرما دیجیے۔ جب ہر چیز اللہ کے قابو میں ہے تو پھر ہم کیوں کہتے ہیں کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔

جواب: اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ آپ کے گھر میں آپ کے اہلِ خانہ ہیں، ملازم ہیں۔ آپ ملازم سے کہتے ہیں کہ فلاں چیز، فلاں کوالٹی میں فلاں مقدار میں لے آئیں۔ جب ملازم بازار جا رہا ہوتا ہے تو آپ اُسے ہدایات کے ساتھ اختیارات بھی دے دیتے ہیں۔ گھر سے باہر نکلتے ہی وہ بااختیار ہو گیا اُن چیزوں کو خریدنے کے لیے اپنی مرضی استعمال کرنے کے لیے۔ جب وہ چیزیں لا کر آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے جو چیزیں آپ کو پسند نہیں آتیں آپ انھیں واپس کرا دیتے ہیں۔ اب ملازم آپ کے دیئے گئے اختیارات کے تحت کام کر رہا ہے۔ وہ Power آپ ہی کی دی گئی ہے۔ آپ جب چاہیں اُسے Withdraw کر سکتے ہیں۔ آپ اُس سے کام تو لے رہے ہیں لیکن اپنی Powers میں سے کچھ Powers اپنے ملازم کو Delegate کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہر شے کا مالک، قادر اور حاکم رب تعالیٰ ہے۔ جس طرح کوئی اچھا افسر اور مالک اپنے نمبر 2 کو بے اختیار نہیں رکھتا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے نائب کی صورت، بہت سے اختیارات سے نوازا ہے لیکن حتمی حکم اور ویٹو پاور بہرحال اُسی کی ہے۔ جہاں رب دیکھتا ہے کہ بندہ کا کوئی کام اُس کے خلاف ہو رہا ہے تو وہ بندے کو دیئے گئے اختیار کو وہیں Cut کر دیتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہماری بہترین حکمتِ عملی اور کوشش کا نتیجہ ہمیشہ بہترین ہی ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ اکثر کوشش کے باوجود ہم مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر پاتے۔ اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم قدرے بے پروائی اور بے دلی سے کام کرتے ہیں۔ محنت زیادہ نہیں کرتے پھر بھی کامیابی ہو جاتی ہے۔

جہاں اللہ سمجھتا ہے کہ کوئی کام ہمارے مفاد میں نہیں۔ ہمیں اُس سے نقصان ہوگا تو وہاں وہ اپنی ویٹو پاور استعمال کرتا ہے۔ جہاں وہ سمجھتا ہے کہ ہمارے کسی قدم سے اُس کے نظام میں خلل واقع ہوگا اور Balance out ہوگا تو وہ اُسے Cut کر دیتا ہے۔ انسان نے ادویات پر بے پناہ ریسرچ کی۔ بہت سی بیماریوں کے علاج دریافت کیے۔ تندرست رہنے کے طریقے ایجاد کیے۔ حتیٰ کہ Genetic science میں ریسرچ بہت آگے چلی گئی لیکن انسان موت کو پھر بھی روک نہیں پایا۔ شیر خوارگی، ادھیڑ عمری، بڑھاپا غرض یہ کہ ہر عمر میں

انسان انتقال کر جاتا ہے اور انسان اس کو روک نہیں پایا۔ یہ انسان کے بے اختیار اور اللہ کے قادر مطلق ہونے کا ثبوت ہے۔ نمونیا کا علاج دریافت ہو چکا لیکن کئی لوگ نمونیا سے ہلاک ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ Cholera اور Flu جیسی معمولی بیماریوں کا علاج موجود ہونے کے باوجود لوگ ان بیماریوں سے فوت ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی اور قوت ہے جو اپنا حکم چلا رہی ہے۔ ورنہ اگر دس آدمی نمونیا سے صحت یاب ہو جاتے ہیں تو گیارھویں اور بارھویں کو بھی صحت یاب ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ انسان کے پاس اختیارات محدود ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ تمام اختیارات کا مالک اور ہر شے پر قادر ہے۔

جہاں تک تقدیر کا تعلق ہے تو تقدیر دو طرح کی ہے۔

1۔ تقدیر مبرم (جسے تقدیر معین بھی کہتے ہیں)

2۔ تقدیر معلق

تقدیر مبرم ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ صرف رب کے اختیار میں ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ ٹوٹل تقدیر کا پانچ سے دس فیصد حصہ ہے۔ باقی تقدیر معلق ہے جو اللہ نے ہم پر چھوڑ دی کہ ہم جتنی محنت و کوشش کریں گے، تدبیر لڑائیں گے اور جتنے Proficient ہوں گے اُسی قدر بہتر اپنی تقدیر لکھ لیں گے۔ اگر ہم گھر پر چادر تان کر سوئے رہیں گے تو مسلسل محنت اور کوشش کرنے والے لوگ ہم سے کہیں آگے نکل جائیں گے۔ جو شخص آگ پکڑتا ہے اُس کا ہاتھ جل جاتا ہے۔ جو احتیاط کرتا ہے اُس کا ہاتھ جلنے سے محفوظ رہتا ہے۔ میں صحیح وقت پر گھر سے نکلتا ہوں تو Train پکڑ لیتا ہوں۔ گھر پر سویا رہوں گا تو ٹرین Miss کروں گا۔ یہ سب میرے اختیار میں ہے۔ میری کوشش اور Reactions فیصلہ کریں گے کہ مجھے کامیاب انسان بننا ہے یا ناکام انسان۔ لیکن بات وہی آجائے گی کہ Ultimate authority اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کبھی کبھار کوشش کے باوجود انسان کہیں پہنچ نہیں پاتا۔ یہ رب کے قادر مطلق ہونے کا ثبوت ہے۔ پھر ہم اپنی کوششوں کے برعکس نتیجہ دیکھ کر بے اختیار کہتے ہیں تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ یہ دراصل قضا و قدر کا معاملہ ہے۔ مختصراً یوں کہہ لیجیے کہ اپنی تقدیر معلق ہم خود لکھتے ہیں جب کہ تقدیر مبرم (معین) کلیتہً اللہ کے اختیار میں ہے۔ جیسے موت پر کسی کا اختیار نہیں۔ مرنے کا طریقہ، وقت اور مقام متعین ہے۔ اسی طرح اولاد کتنی ہوگی یہ بھی رب تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور تقدیر مبرم کا حصہ ہے۔

سوال: جب حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے دربار پر دھماکے ہوئے اُس وقت صاحب ڈیوٹی اولیاء اللہ کہاں تھے؟ کیا حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ، قطب وقت یا صاحب ڈیوٹی ولی اللہ اُن دھماکوں کو ہونے سے روک نہیں سکتے تھے؟

جواب: اولیائے کرام کے بارے میں ہم کتابیں پڑھتے ہیں۔ اُن کی کرامات و تصرفات کا ذکر پڑھنے کے بعد ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ولی اللہ (نعوذ باللہ) ہر چیز پر قادر ہیں۔ وہ جو چاہیں کر لیں (نعوذ باللہ)۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

اللہ کے یہ دوست تو ایک عام آدمی سے بھی زیادہ مجبور ہیں کیوں کہ اُن پر قانون زیادہ لاگو ہوتا ہے بالکل اُسی طرح کہ اگر ایک ٹریفک سارجنٹ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اُس کو زیادہ سزا بھگتنا پڑے گی کیوں کہ اُس کا کام تو قانون لاگو کرنا تھا لیکن وہ خود ہی قانون کی خلاف ورزی کر بیٹھا۔ اللہ کے دوست پر بھی ایسے ہی قوانین لاگو ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی ذراسی کوتاہی پر اُنھیں جھٹکا دے دیتا ہے تا کہ اُن کا پاؤں زیادہ نہ پھسلنے پائے۔

قضا وقدر کے معاملات میں اولیاء اللہ دخل انداز نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو اُن کی اولاد کبھی اُن سے جُدا نہ ہوتی۔ کیوں کہ اولاد سے محبت تو جانوروں کی جبلت میں بھی ہے۔ اولیا اور خود پیغمبروں کی اولاد بیماری اور کم عمری میں دُنیا سے رُخصت ہوتی رہی۔ قضا و قدر میں کبھی ولی اللہ دخل نہیں دیتا۔ اسی طرح ولی اللہ بھی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ دعویٰ کرتا ہے تو اگلے ہی لمحہ رب تعالیٰ اُسے جھوٹا ثابت کر دیتا ہے۔ اسی طرح جو ولی اللہ دُنیا سے چلا گیا دُنیا کے روز و شب سے اُس کا تعلق اور تصرف منقطع ہو گیا۔ انتقال کے بعد وہ اس پر بھی قادر نہ رہا کہ کوئی نیکی کر کے اپنے نامۂ اعمال میں اضافہ کر سکے۔ وہ اب ثواب کے لیے زندہ لوگوں کا محتاج ہو گیا کہ وہ نفلی عبادات، تلاوت قرآن، فاتحہ خوانی اور صدقہ و خیرات کے ذریعے ایصال ثواب کر کے اُس کے نامۂ اعمال میں درج کروا دیں۔ جو ولی اللہ وفات پا گیا اُس کے دربار میں اگر کوئی شخص بیٹھا چرس پی رہا ہے تو وہ اس پر قادر نہیں کہ ہاتھ اُٹھا کر اُس شخص کو وہاں سے اُٹھا دے۔

جو کچھ داتا صاحب کے مزار پر ہوا۔ اس پر ہمارے رنجیدہ ہونے میں زیادہ حصہ اُن کرامات کا ہے جو کتابوں میں پڑھ پڑھ کر ہم اولیاء اللہ کو مافوق الفطرت انسان سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ہم تصور کر لیتے ہیں کہ چونکہ وہ ولایت کے بلند مرتبہ پر فائز ہیں اس لیے اس بات پر قادر ہیں کہ اپنے دربار پر آنے والے کی حفاظت کا سامان بھی کریں گے۔ یہ Misconception ہے۔

ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ ہم تو وہاں رُوحانی فیض کے حصول کی نیت سے جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ وہاں سے جو ہمیں دُنیاوی فیض ملتا ہے وہ داتا صاحب سے نہیں بلکہ رب تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اب فرق کیا ہے؟

داتا صاحب کے مزار پر کی جانے والی دُعا اگرچہ رب تعالیٰ ہی سے کی جاتی ہے لیکن اس میں دو چیزیں ہمیں اضافی ملتی ہیں۔

1۔ ہم وہاں جا کر سلام عرض کرنے کے بعد فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ جو کلام میں نے تلاوت کیا اسے تیرے اور تیرے حبیب ﷺ کے حضور بطور نذرانہ پیش کیا۔ تو اس کو قبول فرما لے اور اس کا ثواب داتا صاحب کی رُوح کو بخش دے۔ اب اللہ نے اس کا ثواب ہمارے نامۂ اعمال کے ساتھ ساتھ داتا صاحب کے نامۂ اعمال میں بھی لکھ دیا۔ اس سے داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رُوح خوش ہو جاتی ہے۔ چونکہ نیک آدمی بھی وفات کے بعد اپنے نامۂ اعمال میں اپنے طور پر کوئی کی

پیش نہیں کر سکتا لہٰذا جب کوئی زندہ شخص کسی مرحوم کو ایصالِ ثواب کرتا ہے تو اُس کی رُوح خوش ہو کر اللہ کی بارگاہ میں عرض کرتی ہے کہ یا اللہ! جس شخص نے میرے نامۂ اعمال میں ثواب کا یہ اضافہ کیا ہے تُو اُس کی بھی جائز خواہشات پوری فرما دے اور اُس کی مشکل آسان فرما دے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ بہت حیا والا ہے اس لیے وہ اپنے پیارے بندوں کی دُعاؤں کو رد نہیں فرماتا۔

2۔ مزار پر دُعا کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ چونکہ جہاں رب کا ذکر ہوتا ہے وہاں رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اور فرشتے اُترتے ہیں۔ داتا صاحب کے مزار پر بھی چوبیس گھنٹے فاتحہ خوانی، ذکر الٰہی اور نفلی عبادات ہو رہی ہوتی ہیں۔ جہاں اس کثرت سے ذکر الٰہی اور تلاوت ہو وہاں رحمت کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ جس طرح بارش سے لوگ سیراب ہو جاتے ہیں اسی طرح وہاں حاضری دینے والے اللہ کی رحمتوں کی بارش میں بھیگ جاتے ہیں۔ جب وہ وہاں دُعا کرتے ہیں تو وہاں اُترنے والے فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔

اس پر وہ صاحب Convince (قائل) ہو گئے اور بولے ''پھر رُوحانی فیض کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا چونکہ وہاں ہر وقت رحمت کی بارش ہو رہی ہے۔ پھر صاحب مزار کی Vibrations (لہریں) اور Magnetic Field وہاں موجود ہے۔ جب ہم اس دائرے میں آتے ہیں تو رحمت کی بارش اور Magnetic Field ہم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ داتا صاحب کے مزار پر حضرت خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ صاحب نے چلہ کاٹا اور تب اُنھیں ادراک ہوا کہ داتا صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ اسی لیے اُنھوں نے کہا

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را راہنما

اسی طرح حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ صاحب بھی وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جو شخص وہاں چلہ کاٹ رہا ہے وہ نیک ہے۔ وہ پاکیزگی اور رُوح کی لطافت کے لحاظ سے اُس مقام پر ہے جہاں وہ Time and Space سے Beyond ہو چکا۔ جب اُس شخص کی ذہنی اور رُوحانی قوتیں ایک جگہ Focus ہوتی ہیں بالکل اُسی طرح جس طرح Convex lens کے ذریعے سورج کی شعاعیں ایک خاص نقطہ پر Focus ہو کر کپڑے یا کاغذ پر جب پڑتی ہیں تو اُسے جلا دیتی ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص اس نقطۂ اشتعال کو چھو لیتا ہے تو تب اُس کی صاحب مزار سے ملاقات ہو جاتی ہے اور ہم کہنے لگتے ہیں کہ اُسے کشف القبور حاصل ہو گیا۔ اس ملاقات میں رُوح کا رُوح سے مکالمہ ہوتا ہے۔ اور مکالمہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر داتا صاحب کی زبان فارسی تھی اور چلہ کاٹنے والے کی زبان انگریزی تو دونوں کو Communication میں کوئی دقت پیش آئے۔ وہ تو دراصل رُوح کا رُوح سے مکالمہ ہوتا ہے جس کو دونوں رُوحیں بآسانی سمجھ رہی ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اقوام متحدہ میں بولنے والا خواہ کسی بھی زبان میں تقریر کر رہا ہو سننے والا مادری زبان میں اُسے سن سکتا ہے اُسے صرف Translater کو Adjust کرنا ہوتا ہے۔ رُوح سے رُوح کا مکالمہ جو انسان اپنی

مادری زبان میں سنتا ہے اِس میں وہ صاحب مزار سے رُوحانی فیض حاصل کرتا ہے۔اُس کی رُوح کی قوت اور Vibrations انسان کی رُوحانی Vibrations پر اثر انداز ہوتی ہیں کیوں کہ صاحب مزار کی Magnetic Field مضبوط ہے جب کہ چلہ کش کی Magnetic Field اور Vibes کمزور ہوتی ہیں۔اس لیے Strong vibrations کا Flow کمزور سمت میں جائے گا اور یوں چلہ کش کو Strength ملے گی۔

رُوحانی فیض کا معاملہ اس سے تھوڑا سا مختلف ہو جائے گا۔اسے Receive کرنے کے لیے اور اس مقام تک جانے کے لیے انسان کا خود رُوحانی طور پر ایک خاص مقام پر ہونا ضروری ہے۔داتا صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فیض دیتے تو ہیں اور کھلے ہاتھ سے دیتے ہیں لیکن ایک وقت گزرنے کے بعد اُس شخص کو دیکھنے، پرکھنے اور تولنے کے بعد۔اتنا وقت لگنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس عرصہ میں انسان بتدریج رُوح کی بالیدگی کی مطلوبہ سطح یا درجہ تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔اس کی مثال یوں ہے کہ 500 فٹ لمبا ایک ہال ہے۔ ہر 20 فٹ کے بعد ایک دروازہ ہے۔ایک شخص پہلا دروازہ کھولتا ہے۔لائٹ آن کرتا ہے تو Light ایک محدود دائرے تک کمرے کو روشن کرتی ہے۔وہ اس دائرہ میں چیزوں کو دیکھتا ہے اور باہر آ کر بتاتا ہے کہ میں نے کمرے میں فلاں فلاں چیز دیکھی۔تب ایک شخص اُسے بتاتا ہے کہ کمرے میں تو اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں موجود ہیں۔اگلے دن وہ شخص دوسرا دروازہ کھولتا ہے اور لائٹ آن کرتا ہے تو اُسے روشنی کے دائرہ میں کچھ مزید اشیا دکھائی دیتی ہیں۔تب وہ سوچتا ہے کہ فلاں صاحب بالکل بجا فرما رہے تھے یہاں تو واقعی بہت سی اور چیزیں بھی موجود ہیں۔حتیٰ کہ وہ شخص جب آخری دروازہ کھولتا ہے تو ہال میں موجود تمام چیزوں کے بارے میں اُسے ادراک ہو جاتا ہے۔تب اُسے Zero foot سے لے کر 500 feet تک تمام چیزوں کا علم ہو جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح رُوحانیت میں چیزیں تو موجود ہیں لیکن ہمیں اُن کا ادراک نہیں ہو پاتا۔لیکن جوں جوں ہماری رُوح کی پرواز بڑھتی ہے ہمیں وہ چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔وہ چیزیں بھی جن کے بارے میں ہم نے کبھی پڑھا تھا اور یقین کرتے ہوئے ہچکچائے تھے۔ہم کہتے ہیں کہ نماز کے دوران سلام پھیرتے ہوئے یا دُعا مانگتے ہوئے میں نے فلاں بندے یا مقام کو دیکھا۔یہ بات سن کر کچھ لوگ از راہِ مروت منہ پر تو کچھ نہیں کہیں گے لیکن بعد میں کہیں گے کہ یہ شخص کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا۔جس شخص کے انتقال کو کئی صدیاں گزر چکی ہیں اس کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ میں نے دُعا کے دوران اُسے دیکھا ہے۔پھر ہوتا یوں ہے کہ مذاق اُڑانے والا کچھ عرصہ بعد رُوحانیت کی راہ پر چلتا ہے اور اُس کا واسطہ رُوحانی کیفیات سے پڑتا ہے تب وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ پندرہ بیس برس قبل وہ شخص بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔میں بلاوجہ اُس کا مذاق اُڑاتا رہا۔رُوحانی فیض جو آپ کو کسی صاحب مزار سے حاصل ہو رہا ہے اس میں اہم کردار آپ کی اپنی رُوح ادا کر رہی ہے۔ہوتا یہ ہے کہ کشف و کرامات کے مقام تک پہنچنے کے لیے ایک چیز بہت اہم ہے۔وہ یہ کہ آپ کے خیالات، آپ کا شعور، لاشعور، آپ کی ساری سوچیں ہر وقت ایک ہی Direction (سمت) میں رہیں اور وہ ہے رب تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ، اُس کی کتاب۔جب ہم ہر وقت اپنے خیالات کو ان پر مرتکز رکھتے ہیں تو ہمارے ذہن کے

تمام Cells جن کا تعلق مرئی اور غیر مرئی چیزوں کے ساتھ ہے وہ Active ہونے لگتے ہیں۔ اور دُنیاوی معاملات سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے Cells hibernation میں چلے جاتے ہیں۔ نتیجتاً دُنیاوی چیزوں پر ہماری توجہ کم ہو جاتی ہے اور اللہ، اُس کے رسول ﷺ اور کتاب کی طرف توجہ زیادہ ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ سوتے ہوئے بھی ہمارا لاشعور رب تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنے لگتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہمارے دُنیاوی معاملات، کاروبار اور گھریلو زندگی میں گڑبڑ ہونے لگتی ہے۔ بچوں کو توجہ نہیں ملتی اور گلے شکوے شروع ہو جاتے ہیں۔ وجہ وہی ہے کہ انسان ذہنی، جسمانی اور رُوحانی طور پر رب اور اُس کی تخلیقات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب اُس کی سوشل لائف اور فیملی لائف ہاتھ سے نکلنے والی ہی ہوتی ہے اور وہ ڈوبنے ہی والا ہوتا ہے کہ یک دم اُسے وہ کیفیت عطا ہو جاتی ہے کہ جس سے اُس میں رُوحانیت آ جاتی ہے اور اُسے کشف و کرامات حاصل ہونے لگتی ہیں۔

اگر آپ اس کیفیت کو کم کرنا چاہیں تو آسان طریقہ ہے۔ آپ دوبارہ سوشل ہو جایئے۔ اخبارات اور ٹی وی میں مصروف ہو جایئے۔ لوگوں کے ساتھ گپ شپ میں وقت گزارنا شروع کر دیجیے۔ پھر بھلے آپ ساری رات عبادت کرتے رہیں وہ کیفیت نصیب نہیں ہوگی۔

لیکن اس کے برعکس ایک مقام پر پہنچ جانے کے بعد یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ دوستوں میں بیٹھے ٹی وی ڈرامہ Discuss کر رہے ہیں اور اچانک بات اللہ تعالیٰ کی طرف مڑ جائے گی۔ اسی طرح ایک شخص فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان جاتا ہے اور واپسی پر سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ اب دوبارہ کب جانا ہے۔ تب وہاں جا کر میں فلاں چیز پڑھوں گا۔ ہے تو انسان دُنیا میں لیکن سوچ آخرت کا رہا ہے۔ جب ایسا ہو تو عموماً وہ سمجھتا ہے کہ رُوحانی فیض حاصل ہو رہا ہے لیکن دراصل وہ رُوحانی فیض میں ترقی ہو رہی ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ مادی دُنیا میں رہتے ہوئے بھی متوجہ رُوحانی چیزوں کی طرف ہے۔ یہ انسان کی اپنی رُوح کا کھیل ہے۔ یہ اُس کی محنت اور ریاضت ہے جو اُسے رُوحانی ترقی دلا رہی ہے حتیٰ کہ وہ اُس مقام پر جا پہنچتا ہے کہ اُسے کشف القبور حاصل ہونے لگتا ہے اور اُس کی رُوح صاحب مزار کی رُوح سے Communicate کرنے لگتی ہے۔ یہ سب رب ہی نے کیا ہے۔ رب کی رحمت اور ہماری محنت سے یہ سب ممکن ہوا۔

آپ نے فرمایا کہ داتا صاحب کے دربار پر ہونے والے سانحہ پر آپ کا دل بہت رنجیدہ ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ اگر میری باتوں پر کچھ توجہ دی ہوتی تو دل آج رنجیدہ نہ ہوتا۔ یہ رنجیدگی اس لیے ہے کہ ہم نے داتا صاحب کا جو بت دل میں گھڑا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ میں ہمیشہ گزارش کیا کرتا ہوں کہ اپنے مرشد کو انسان سمجھیں۔ وہ بھی خطا کا پتلا ہے۔ اُس کا پاؤں بھی پھسل سکتا ہے۔ اُس سے بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اُسے Superhuman سمجھ بیٹھے اور ایسے میں آپ کو اُس میں کوئی غلطی دکھائی دے گئی تو عقیدت کا بت لمحوں میں ٹوٹ جائے گا اور آپ کے لیے سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔

اس کے برعکس اگر ہم سمجھیں کہ مرشد بھی انسان ہیں۔ اُن کی جبلت میں بھی غلطی کرنا لکھا ہے۔ اُن کا علم،

عقل بھی ناقص ہو سکتی ہے۔ ہاں اُن کو اس لحاظ سے ایک عام آدمی پر فوقیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم اور دین کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اللہ نے اُنھیں توکل کی دولت بخشی ہے جو ہم میں نہیں۔ اللہ نے اُنھیں تقویٰ کی صفت سے نوازا ہے جو ہم میں نہیں ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے اولیاء اللہ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں۔ چونکہ یہ صفات ہماری ذات میں موجود نہیں اور مرشد بغیر کسی لالچ کے وہ چیزیں ہمیں Pass on کر رہا ہے اس لیے ہم اُن کی تعظیم کریں، اُن سے پیار کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُنھیں مافوق الفطرت مخلوق نہیں بلکہ محض ایک انسان ہی سمجھیں۔

داتا صاحب کا مقام اتنا بلند ہے کہ وہاں اگر کوئی عمران جاتا ہے تو اُنھیں اخیار کے مقام پر سمجھتا ہے۔ کوئی اخیار جاتا ہے تو وہ اُنھیں ابدال سمجھتا ہے۔ ابدال جائے اُنھیں قطب سمجھتا ہے اور قطب وہاں جاتا ہے تو اُنھیں غوث سمجھتا ہے اور غوث وہاں جاتا ہے تو حیران کھڑا ہے کہ یہ کس مقام پر ہیں۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔ داتا صاحب کا مقام اس قدر عظیم ہے کہ کوئی انسان اس مقام کو سمجھ ہی نہیں پاتا اور یہ مقام ہر لحظہ بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ باوجود تمام تر رُوحانی قوتوں، علم اور تصرفات کے وہ انسان ہی تھے۔ جب ہم یوں سمجھیں گے تو ہمیں اُن سے ایسی محبت اور عقیدت ہوگی جو دربار پر ہونے والے کسی بم دھماکے کی وجہ سے کم نہیں ہو سکے گی۔

سوال: علم اور حکمت میں کیا فرق ہے؟

جواب: جب رب تعالیٰ نے رُوحیں تخلیق کیں تو تخلیق کے بعد انسانی رُوح کو اُس آسمان پر اُتارا گیا جہاں فرشتے رہتے ہیں اور انسانی رُوح کو فرشتوں کے نور میں غسل دیا گیا۔ اُس غسل کے بعد انسانی رُوح کا نام رُوحِ پاکیزہ (The pious soul) رکھا گیا۔ وہاں سے اُسے تیسرے آسمان پر اُتارا گیا اور اُس آسمان پر ایک بار پھر اُسے غسل دیا گیا۔ جس کے بعد اُس رُوح کا نام رُوحِ متحرکہ (The moving soul) رکھا گیا۔ تب اُسے زمین پر اُتارا گیا جہاں یہ رُوح انسانی کی شکل میں موجود ہے۔ جب شکمِ مادر میں بچے کی تخلیق شروع ہوتی ہے اور اُس کا دل وجود میں آتا ہے تو اُسی وقت اُس رُوح کو آسمان سے روانہ کر دیا جاتا ہے اور ایک فرشتہ اُس رُوح کو انسانی دل کے عین وسط میں رکھ دیتا ہے اور رُوح وہاں قید ہو جاتی ہے۔

رُوحِ انسانی کو دُنیا میں روانگی کے وقت ایک Task دیا جاتا ہے کہ جب تک یہ زمین پر ہے اپنے خالق کی طرف رُجوع رکھے گی۔ اس سے آپ کو سمجھ آ جائے گی کہ یہ جو اکثر ہم پڑھتے ہیں کہ انسان کو رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کے واسطے پیدا کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جو رُوح وجود میں آنے کے بعد دُنیا میں آ جانے اور ہوش سنبھالنے کے بعد، بلوغت کی حد تک پہنچنے کے بعد رب تعالیٰ کی طرف رُجوع تو رکھتی ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح رُجوع رکھنے کا حق ہے۔ رب تعالیٰ اُس سرسری رُجوع کو بھی قبول کرتا ہے اور اُسے رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اُس کو Reward کے طور پر گھر کا آرام و آسائش عطا کرتا ہے۔ جو رُوح اس سرسری رُجوع سے بڑھ کر رُجوعِ الی اللہ رکھتی ہے اللہ تعالیٰ اُسے دُنیاوی آرام و آسائش اور مال و زر سے مالا مال کر دیتا ہے۔ اگر

کوئی روح اس سے بھی آگے چلی جائے اور ہمیشہ اپنے خالق سے رُجوع رکھے تو رب تعالیٰ اُسے اپنا علم عطا فرما دیتا ہے۔ جسے وہ علم عطا فرماتا ہے اُسے اپنے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ جو روح کلیۃً اپنے رب اور خالق کی ہو کر رہتی ہے رب تعالیٰ اُسے Wisdom (دانائی) عطا کرتا ہے اور Essence of wisdom خود رب ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے۔ (جامع ترمذی، حدیث نمبر 3052)

علم درحقیقت چیزوں کے ادراک کا نام ہے۔ اچھے اور بُرے کی تمیز کا نام ہے کہ انسان کو نیک و بد، گناہ و ثواب اور اچھے بُرے میں فرق کرنا آ جائے۔

علم سے ہمیں پتا چلتا ہے what is what۔ جب ہمیں تمام چیزوں کے بارے میں معلوم ہو گیا اور اچھے بُرے میں تمیز کرنا آ گئی تو اُس علم کو خوب صورتی کے ساتھ Apply کرنے کا نام حکمت ہے۔ اسی کو عقل کہتے ہیں۔ جہاں ہم علم کو بہترین مفاد کے لیے استعمال کرنے لگے تو وہ حکمت ہے۔ حکمت دراصل دانائی اور مصلحت کو کہتے ہیں۔ لیکن اصطلاحی طور پر علم کو بہترین مفاد کے لیے استعمال کرنا حکمت کہلاتا ہے۔ لہٰذا صرف علم کا حصول ہی کافی نہیں ہوگا بلکہ اس علم کو ہمیں انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال بھی کرنا ہوگا۔ جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ سڑک میں کس جگہ گڑھا ہے تو یہ علم ہے۔ اب اگر میں احتیاط نہیں کرتا۔ خود بھی گرتا ہوں اور دوسروں کو بھی نہیں بتاتا اور نہ ہی ہاتھ پکڑ کر انھیں وہاں سے محفوظ گزارتا ہوں تو ایسے علم کا کیا فائدہ۔

الغرض، علم کو دانائی سے استعمال کرنے کا نام حکمت ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی

سوال: زمان و مکاں سے بالاتر ہو جانے اور کشف سے کیا مراد ہے؟

''زماں'' لفظ زمانے سے نکلا ہے اور زمانہ Alternatively وقت کہلاتا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ زمانہ کو برا نہ کہو کیوں کہ زمانہ میں خود ہوں[3]۔

لفظ ''مکاں'' سے مراد وہ مقام ہے جہاں لوگ بستے اور رہتے ہیں۔ یہ لفظی معنی ہیں۔ لیکن اصطلاحی طور پر روحانیت میں لفظ ''مکاں'' سے مراد ہے ''دوز''۔ جب کوئی شخص رب کا ہو جاتا ہے اور رب تعالیٰ کے تمام احکامات آنکھیں بند کر کے سرانجام دینے لگتا ہے۔ تب وہ Total surrender (مکمل بندگی) میں چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنی ضروریات، ارادے، آرام و آسائشات اور خواہشات سب کو اللہ کے ارادوں کے ماتحت کر دیتا ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے احکامات کی تعمیل اس طرح سے کرتا ہے کہ اس کے ذہن میں کوئی سوال نہیں اُٹھتا کہ میں یہ کیوں اور کیسے کروں۔ وہ اللہ کے احکامات کی تعمیل کے وقت نفع نقصان میں نہیں اُلجھتا۔ یہ انداز اطاعت Total surrender ہے۔ جس میں اللہ کی طرف سے جو بھی فیصلہ اُسے عطا ہوتا ہے..... نعمت یا اذیت...... وہ سب خوشی سے برداشت کرتا اور اپناتا ہے۔ Total surrender وہ مقام ہے جہاں رب تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی دوستی عطا کر دیتا ہے۔ رب تعالیٰ بہت دوست نواز ہے۔ وہ اپنے دوستوں پر بہت مہربانیاں کرتا ہے۔ جب وہ بندے کے ساتھ دوستی کرتا ہے تو اُسے یہ اجازت مرحمت فرما دیتا ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کے کارخانہ قدرت میں ایک مخصوص حصے تک جھانک سکے۔ اس کے بعد وہ اُسے کشف عطا فرما دیتا ہے۔ کشف سے مراد ہے کسی چیز میں جھانکنا۔ کشف کا مطلب ''اسرار تک رسائی'' بھی ہے۔ کسی شخص کا کشف جتنا تیز ہوگا اُسی قدر زیادہ وہ وقت اور زمانے سے بالاتر ہو کر عالم اسرار کی سیر کرلے گا۔ کشف حاصل ہو جانے کے بعد انسان گزرا ہوا زمانہ اور ایسے مقامات جہاں وہ کبھی گیا نہیں ہوتا، اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح مستقبل کے اُن واقعات کو دیکھ لیتا ہے جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے ہوتے۔ تب ایسے شخص کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ فلاں صاحب تو زمان و مکاں سے آگے چلے گئے یا Time and space سے Beyond ہو گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کا خطبہ پڑھتے پڑھتے اچانک ہزاروں میل دُور برسرِ پیکار اپنی فوج کے کمانڈر کو ہدایات دی تھیں۔ یہ بھی ایک مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو Time and space سے Beyond کر دیا تھا۔

مختصر یہ کہ جب ہم زمان و مکاں سے آگے نکل جائیں تو یہ کشف ہے۔

سوال: انسان ایک حیوانی جبلت کے ساتھ پیدا کیا گیا۔ اس حیوانی جبلت کو کیسے پہچانا اور Control کیا جا سکتا ہے؟

جواب: انسان میں کئی Instincts موجود ہیں۔ اس میں Animal Instinct (حیوانی جبلت) بھی ہے جو ہمارے اندر نفس کی صورت میں ہے اور ہمیں گناہوں کی طرف لے جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو بھوک لگی ہے جس طرح بھوک کے عالم میں کوئی جانور تمیز نہیں کرتا کہ یہ میرے مالک کا ہے یا کسی اور کا کسی اور جانور کے لیے۔ بھوک کی صورت میں وہ منہ ضرور مارے گا۔ اسی طرح انسان کو اُس کا نفس چوری پر مجبور کرتا ہے۔ ایک بہت ہی Strong حیوانی جبلت ہے (جس کا میں یہاں ذکر نہ کر پاؤں گا) اس سے مغلوب ہو کر انسان ہوش و حواس سے عاری ہو جاتا ہے۔ یہ اصل میں حیوانی جبلت ہے۔

ہر انسان میں چار طرح کی قوتیں ہیں۔

1۔ قوت صفرا

2۔ قوت سودا

3۔ قوت خون

4۔ قوت بلغم

قوت صفرا میں زیادہ تر نباتات کی جزیات ہیں۔ قوت سودا میں زیادہ تر حیوانی جذبات یا جبلتیں ہیں۔ قوت خون میں زیادہ تر جزئیات پانی کی ہیں۔ قوت بلغم میں زیادہ تر جزئیات جم جانے اور پیوست ہو جانے کی ہیں۔ خون میں زندگی ہے اور فنا ہے۔

جو ہماری ایک جبلت ہے (جس کا ذکر کرنا یہاں مناسب نہیں) وہ قوت سودا کے تحت آتی ہے۔ اگر ہم روحانی طور پر مضبوط نہ ہوں تو قوت سودا ہمیں مغلوب کر لیتی ہے۔ جو شخص اللہ کو یاد کرتا ہے۔ عبادات کرتا ہے وہ قوت سودا پر قابو پا لیتا ہے۔ اس کو سدھا لیتا ہے۔ ورنہ عموماً یہ جبلت منہ زور رہتی ہے۔ لہٰذا حیوانی جبلت کو قابو کرنے کے لیے اللہ کو یاد کرتے اور پکارتے رہیے۔ جب ہمارا دل اور توجہ اللہ کی طرف رہے گی تو ہمارا نفس ہمیں مغلوب نہیں کر سکے گا۔

سوال: کیا کسی دوسرے سیارے پر بھی اللہ کی مخلوق رہتی ہے؟

جواب: کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا علم انسان کو ہوہی نہیں پاتا۔ اگر اُسے علم ہو بھی جائے تو عام حالات میں وہ اس کو بیان نہیں کرتا۔ جیسے ایک صوفی نے کہا تھا:۔

"خاصاں دی گل عاماں اگے نئیں مناسب کرنی"

اندیشہ یہ رہتا ہے کہ اگر خاص باتیں عام لوگوں میں بیان کردی جائیں تو جو لوگ رُوحانیت کا بنیادی علم نہیں رکھتے اُن کے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ اِس کائنات میں ستر ہزار عالم ہیں۔ اُن میں کہیں نہ کہیں انسانوں کی آبادی ہے۔ اُن کی رہائشیں ہماری طرح کی نہیں۔ وہاں کے جانور ہمارے روئے زمین کے جانوروں سے مختلف شکل کے ہیں۔ وہاں کے طریقہ کاشت میں فرق ہے۔

سوال: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور شان کے ادراک کے بارے میں جنرل نسخہ بتا دیجیے۔

جواب: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شانِ اس زمین کے تمام قلم اکٹھے کر لیے جائیں تب بھی بیان نہیں ہوگی۔

لایمکن الثناء کما کان حقہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس سے بڑھ کر کوئی جامع اور واضح تعریف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور شان دل میں کیسے پیدا ہو؟ اس کا مجرب نسخہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ یاد رکھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر احسان عظیم یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا پیغام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہم تک من و عن پہنچا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا احسان عظیم ہم پر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کی تربیت اور عملی نمونہ پیش کرنے کے لیے ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزاری۔ اُمت پر یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا احسان ہے۔

ہم اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں احسانات ہی اپنے آپ کو Remind (یاد) کراتے رہیں تو احسان شناسی کی یہ کیفیت ہمارے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت اور احساس شکر گزاری پیدا کردے گی اور انسان جس کا شکر گزار ہوتا ہے اُس سے پیار بھی بہت کرتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں احسانات کو یاد رکھا جائے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے اپنے دو صفاتی نام "رؤف و رحیم" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے اور قرآن پاک میں ان ناموں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بھی فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اسمائے مبارکہ میں اللہ کی صفات کس قدر پائی جاتی ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے ماسوائے "رحمانیت" اور "ربوبیت" اپنی تمام صفات کا عکس انسانوں میں رکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ میں ان صفات کا عکس بہت Strong ہے۔ رؤف و رحیم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت اللعالمین کے Reference سے کہا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحیم ہونے سے مراد ہے "رحمت والا۔"

آپ ﷺ کی ساری زندگی کا ہم مطالعہ کر لیں۔ آپ ﷺ ہر اس شخص کے لیے بھی مہربان تھے جس نے آپ ﷺ کو دُکھ دیے۔ اپنوں کے لیے تو آپ ﷺ مہربان تھے ہی۔ معافی، درگزر، سخاوت..... آپ ﷺ کے اعلیٰ ترین کردار میں یہ صفات بہت نمایاں تھیں۔ آپ ﷺ اعلیٰ درجہ کے معاف فرمانے والے تھے۔ آپ ﷺ نے کبھی نہ تو کسی مخالف کو بُرا بھلا کہا، نہ بدلہ لیا حتیٰ کہ ہندہ جنھوں نے آپ ﷺ کے انتہائی عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کا جنگ اُحد میں کلیجا چبا ڈالا..... اُن چچا کا جن سے آپ ﷺ کو اس قدر محبت تھی کہ ایک لمبے عرصہ تک آپ ﷺ انھیں یاد کر کے آب دیدہ ہو جاتے۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے اُنہی ہندہ اور ابوسفیانؓ کو نہ صرف معاف فرما دیا بلکہ اُن کے گھر کو جائے پناہ قرار دے دیا۔

آپ ﷺ کا کردار اور طرزِ زندگی صرف واہ واہ کے لیے نہیں ہے بلکہ جس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے بشری زندگی گزاری تھی وہ یہ تھا کہ ہمارے لیے ایک مثال قائم کر دیں کہ زندگی کو گزارا کیسے جاتا ہے۔ ورنہ یہ کوئی دشوار نہ تھا کہ دُعا کے بعد آپ ﷺ پُر آسائش زندگی بسر کر لیتے۔ وقتاً فوقتاً دستیاب ہونے والے وسائل کے ساتھ بھی پُر آسائش زندگی آپ ﷺ گزار سکتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا بلکہ عام بشر کی سی زندگی گزاری تاکہ ہم یہ بہانہ نہ گھڑ سکیں کہ آپ ﷺ تو Superhuman تھے۔ لہٰذا اب ہمیں آپ ﷺ کے طرزِ زندگی اور چلن کو اپنانا ہے کیوں کہ آپ ﷺ نے ایک عام انسان کے طور پر زندگی گزاری۔ ہمارے لیے مناسب یہی ہے کہ محض واہ واہ کرنے کی بجائے ہم آپ ﷺ کے کردار کی کسی ایک خوبی پر ہی مکمل طور پر عمل کر لیں۔ معاف کر دینے کا جذبہ آپ ﷺ کے ہاں بہت نمایاں ہے۔ سخاوت اس قدر کہ قرض اُٹھا کر بھی دوسروں کی مدد فرماتے۔ آپ ﷺ بلا کے متواضع تھے۔ اگر ہم ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اپنا لیں تو یہ دُنیا بھی جنت بن جائے گی اور ہم آخرت میں بھی سرخرو ہو جائیں گے۔

سوال: مراقبہ کیا ہے؟ اس کی رُوحانیت میں کیا اہمیت ہے؟

جواب: آسان لفظوں میں مراقبہ سے مراد ہے "اپنے حواسِ خمسہ اور ذہنی قوتوں کو کسی ایک خاص نقطہ پر اس طرح focus کرنا کہ انسان کا اپنے اردگرد کے ماحول سے رابطہ ٹوٹ جائے۔"

جب ہم مراقبہ کرتے ہیں تو ہم اپنی تمام تر توجہ اپنے قلب پر مرتکز کر دیتے ہیں اور یہ ارتکاز اس شدت کا ہوتا ہے کہ ہم اپنے گرد و پیش سے کٹتے چلے جاتے ہیں اور اس بے خودی کی کیفیت میں جب ہم رب تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ رب کے ساتھ ہمارا ایک رابطہ اور ربط قائم ہو گیا۔ رجب کے مہینہ میں جو دُعا پڑھنے کے لیے دی تھی اس دُعا کے سلسلے میں لوگوں کا Feedback یہ تھا کہ دُنیاوی خواہشات تو پوری نہیں ہوئیں لیکن ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے کہ جیسے ہمارا رابطہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے قائم ہونے لگا ہے۔

یہ مراقبہ کی کیفیت ہے جس میں یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ذکر کرتے ہوئے ہماری توجہ مکمل طور پر اس پر مرکوز ہو جاتی ہے اور شدت کے ساتھ اس کے اثرات ہم پر مرتب ہونے لگتے ہیں۔

ذکر سے مراد رب کو پکارنا ہے۔ جب ہم رب کو کسی بھی طریقے سے پکارتے ہیں۔ ذاتی یا صفاتی اسماء الحسنیٰ کی تسبیح پڑھیں۔ کلام پاک کی تلاوت کریں یا ہم نماز پڑھیں...... یہ سب اللہ کا ذکر ہی تو ہے۔ ہم تلاوت کلام پاک کرتے ہیں تو رب تعالیٰ کا کلام پڑھنا گویا کہ رب کا ذکر کرنا ہے۔ ہم اُس کی طرف رجوع کر رہے ہوتے ہیں اور اُس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جو رب کی طرف متوجہ ہوتا ہے رب تعالیٰ اُس کی طرف توجہ کرتا ہے۔ یہ سب ذکر کے معنوں میں آتا ہے۔

رُوحانیت میں مراقبہ کی اہمیت بے حد زیادہ ہے۔ رُوحانیت ہمارے اندر پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ہم اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا نہ کرلیں کہ اپنے ماحول سے کٹ کر رب کی طرف متوجہ کیسے ہوا جاتا ہے۔

ایک مشہور قصہ ہے ایک خاتون اپنے محبوب کے خیال میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ انجانے میں نماز پڑھتے ہوئے ایک بزرگ کے سامنے سے گزر گئی۔ بزرگ نے ڈانٹا ''کیا تمھیں معلوم نہ تھا کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں۔'' خاتون نے بہت خوب صورت جواب دیا۔ کہنے لگی ''میں تو محبوب کی یاد میں گم تھی جس نے مجھے سب کچھ بھلا دیا۔ آپ کی اللہ سے کیسی محبت ہے کہ اُس کے حضور کھڑے ہونے کے باوجود آپ کو یہ احساس ہو گیا کہ میں آپ کے سامنے سے گزری ہوں۔''

لہٰذا جس قدر محبت زیادہ ہوگی اُسی قدر یک سوئی زیادہ ہوگی۔ ہم رب کی یاد میں اس قدر ڈوبے ہوں کہ ہمیں اردگرد کی خبر نہ ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نماز ایسی ہی تھی۔ جنگ میں لگنے والا تیر حالت نماز میں کھینچنے کی ہدایت کی۔ تیر کھینچ لیا گیا اور آپ کو خبر تک نہ ہوئی۔

مفتی محمد حسن صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ ڈاکٹر اُن کے شاگرد ہی تھے۔ مفتی صاحب کی ٹانگ کاٹنے کے لیے جب Anaesthesia دینا چاہا تو اُنھوں نے حرام چیز لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں اللہ کے ذکر میں مشغول ہوتا ہوں آپ آپریشن کریں۔ حتیٰ کہ آپریشن ہو گیا اور مفتی محمد حسن صاحب کو تکلیف کا ذرہ برابر بھی احساس نہ ہوا۔

جب ہم اس درجہ کے انہماک میں چلے جاتے ہیں تو اس کے بہت شدید اثرات ہماری رُوح پر مرتب ہوتے ہیں اور ہماری رُوح لطیف ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس قدر رُوح لطیف ہوگی اُسی قدر اس کی پرواز بلند ہوگی۔ مراقبہ کے ذریعے انسان جب بہت انہماک اور توجہ سے اپنے رب تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تب اللہ کے انعامات کی بارش ہوتی ہے۔

سوال: کیا سجدہ میں دُعا قبول ہوتی ہے؟ کیا عصر اور فجر کے وقت سجدہ میں دُعا نہیں کرنی چاہیے؟

جواب: جہاں تک آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو Logically ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ فجر کے وقت سجدہ میں دُعا سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ اگر فجر کی نماز خاصی تاخیر سے پڑھی جائے اور چار پانچ منٹ بعد سورج طلوع ہونے لگے تو طلوع آفتاب کے وقت سجدہ منع ہے۔ اسی طرح عصر کی نماز اگر تاخیر سے ادا کی جائے حتیٰ کہ غروب آفتاب کا وقت سر پر آن پہنچے تو نماز کے بعد سجدہ میں دُعا نہ کی جائے۔

تین اوقات میں سجدہ منع ہے۔

1۔ طلوع آفتاب کا وقت

2۔ زوال کا وقت

3۔ غروب آفتاب کا وقت

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا سجدہ میں گڑگڑا کر دعا کی جائے تو وہ جلد قبول ہوتی ہے۔

دُعائیں تو ایسے بھی قبول ہوتی ہیں لیکن سجدہ میں زیادہ جلدی کیوں قبول ہوتی ہیں اس کی سائنسی توجیہہ یہ ہے کہ جب ہم سجدہ میں جاتے ہیں تو ہمارے جسم کا زیادہ تر خون ہمارے سر کی طرف Rush کرتا ہے۔ خون جس قدر زیادہ سر کی طرف جائے گا دماغ اُسی قدر تیز کام کرے گا اور اس کی قوت بڑھے گی۔ دماغ جتنی تیزی سے کام کرے گا اُسی تیزی سے Concentrate کرے گا۔ دُعا کے وقت ہم جتنی زیادہ اپنی توجہ اس کی طرف مذکور کرتے ہیں اُسی قدر جلد ہماری دُعا قبول ہوتی ہے۔

ہم پانچ وقت نماز کے بعد سجدہ میں دُعا مانگتے رہتے ہیں "یا اللہ! کشمیر کو آزاد فرما دے۔ دشمن کو نیست و نابود فرما دے۔" چونسٹھ سال سے یہ دُعائیں کرنے کے باوجود صورت حال کچھ Fruitful (ثمر آور) نہیں۔ لیکن وہی امام صاحب اور وہی لوگ جب خشک سالی سے تنگ آ کر کھلے میدان میں نماز استسقاء پڑھتے ہیں اور اللہ کے حضور بارش کے لیے دعا کرتے ہیں تو وہ دُعا کچھ ہی دیر میں قبول ہو جاتی ہے۔

اس کے پیچھے وجہ "توجہ" ہے۔ عموماً ہم جب دُعا مانگتے ہیں۔ تو رٹے رٹائے لفظ بولتے ہیں۔ ہمارا دل ہماری زبان کا ساتھ نہیں دے رہا ہوتا۔ وہ ایک مکینکل انداز ہوتا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر چل رہا ہوتا ہے۔ لیکن نماز استسقاء میں انسان ذہنی توجہ مرکوز کر کے دُعا مانگتا ہے۔ پوری طرح رب کی طرف متوجہ ہو کر ذہن و دل کی حاضری کے ساتھ دُعا مانگتا ہے اس لیے دُعا جلد قبول ہو جاتی ہے۔

سجدہ میں دماغ کو خون کی زیادہ فراہمی ہونے کی وجہ سے ذہنی یکسوئی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سجدہ میں ہونے کی وجہ سے اردگرد کی چیزیں بھی چونکہ دکھائی نہیں دیتیں اس لیے بھی یکسوئی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور دُعا جلد قبول ہوتی ہے۔

جب ہم اللہ کے حضور دُعا مانگتے ہیں تو انکساری اور عاجزی کا سب سے زیادہ خوب صورت انداز یہ ہے کہ ہم اپنا ماتھا زمین پر ٹیک دیں۔ انسان میں غرور اُس وقت ہوتا ہے جب وہ بالکل سیدھا کھڑا ہوتا ہے لیکن جب اپنا سر اُس رب تعالیٰ کے حضور ٹیک دیا تو عاجزی آ گئی کہ رب تیرا یہ انتہائی عاجز و حقیر بندہ تیرے حضور حاضر ہے۔ رب تعالیٰ کے پاس عاجزی نہیں اور وہ عاجزی بے حد پسند فرماتا ہے۔ ہم قیامت کے روز رب تعالیٰ کے پاس جو تحفہ لے جا سکتے ہیں وہ عاجزی ہے۔

اللہ ہمیں اگر توفیق عطا فرما دے تو ہم سجدہ میں گڑگڑا کر دُعا مانگنا شروع کر دیں۔

سوال: سورۂ فاتحہ کی کیا اہمیت ہے؟

جواب: سورۂ فاتحہ کی حیثیت قرآن پاک کے Brain (دماغ) کی ہے۔ درحقیقت پورے قرآن پاک کی تلخیص سورۂ فاتحہ میں بیان کی گئی ہے۔ پورا قرآن سورۂ فاتحہ میں بند ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔

''پورے قرآن میں جو کچھ ہے وہ سورۂ فاتحہ میں ہے۔ سورۂ فاتحہ میں جو ہے وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم میں ہے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم میں جو ہے وہ بسم اللہ کے ''ب'' میں ہے۔ ''ب'' میں جو ہے وہ ''ب'' کے نیچے موجود نقطہ میں سمایا ہے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا ''میں گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھنے اور گھوڑے کی پشت پر سوار ہونے کے درمیانی عرصہ میں پورا قرآن پاک تلاوت کر لیتا ہوں۔'' اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اُس وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا کرتے تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم بدن کی شفا اور سینوں کا نور ہے۔ یہ دودھاری تلوار ہے۔

منزلیں علم باطنی کی

سوال: کیا جادو کے اثرات سے کسی کی صحت پر بُرے اثرات ہو سکتے ہیں مثلاً اولاد کا نہ ہونا وغیرہ؟

جواب: جادو ایک حقیقت ہے۔ دُنیا میں موجود تمام علوم کی تعداد 81,000 ہے۔ دُنیا میں جس قوم نے سب سے زیادہ علوم حاصل کیے اور زمین کی گہرائی سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قوم سائنسی علوم میں ہم سے کہیں آگے تھی اور علوم کی زیادتی ہی اُس قوم کی تباہی کا باعث بنی۔

جادو بھی ان علوم میں سے ایک ہے۔ جادو برحق ہے اور آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ پر بھی جادو کا اثر ہوا تھا۔ اور آپ ﷺ نے اس کا توڑ بھی بتا دیا۔ معوذتین تین بار پڑھ کر اپنے اُوپر پھونک ماریں۔ اللہ کے بعد آپ ﷺ کا مقام ہے اور اللہ کے بعد علم میں آپ ﷺ سب سے آگے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ ﷺ جیسی ہستی پر جادو اثر انداز ہو سکے۔ آپ ﷺ پر جادو کا اثر دراصل اُمت کی تعلیم کا ایک ذریعہ تھا۔ یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جادو کا وجود ہے اور اس کا توڑ بھی ممکن ہے۔ ہم اکثر دلیل یہ دیتے ہیں کہ صاحب جادو کا اثر تو آپ ﷺ پر بھی ہو گیا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ سب اُمت کے سبق کے لیے تھا اور اس کا توڑ بھی فوراً بتا دیا گیا تھا۔

جادو اگرچہ حقیقت ہے لیکن اس سے خوفزدہ اور پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) کی صورت اِس کا توڑ موجود ہے اور ان سورتوں کے ہوتے ہوئے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی پر خدانخواستہ جادو ہو جائے تو وہ سات دن تک یہ سورتیں پڑھ کر دم کرلے۔ انشاءاللہ جادو کا اثر کمزور پڑ جائے گا۔

سوال: ولایت یا علم باطنی کی کتنی منزلیں ہیں؟

جواب: ولایت یا علم باطنی میں 19 منزلیں ہیں۔

- پہلی منزل پر وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس علم کی راہ پر ہیں۔ اُن کی تعداد 40,000 ہے۔ اُن کو اہل اللہ، اہل ارشاد اور رجال اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی ڈیوٹی ہر وقت کرتے رہتے ہیں اور اُن کے یہاں چھٹی یا رخصت کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اگر خدانخواستہ ان میں سے کوئی غیر حاضر ہو جائے تو فی الفور اس کی جگہ دوسرا آدمی بٹھا دیا جاتا ہے۔ یوں 40,000 تعداد ہر وقت موجود رہتی

ہے۔

- علمِ باطنی کی دوسری منزل پر موجود لوگ "اہلِ حق" یا "اہلِ عمران" کہلاتے ہیں۔ ان کی کل تعداد 272 ہے۔ اُن میں سے کچھ حالت سُکر اور کچھ حالت صحو میں ہوتے ہیں۔ حالت سُکر وہ ہے جہاں انسان اپنے ہوش وحواس سے بے نیاز ہو جائے اور ذہن پر اس کا کنٹرول ختم ہو جائے۔ جب کہ حالت صحو میں ذہن پر پورا کنٹرول رہتا ہے۔
- علمِ باطنی کی تیسری منزل پر جو لوگ فائز ہوتے ہیں۔ اُن کو "اوتار" کہا جاتا ہے۔ (لفظ اوتار ہندو دھرم میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن ہندو دھرم کے مطابق اوتار سے مراد وہ شخص ہے جسے آسمان سے اُتارا گیا ہو۔) "اوتار" کی تعداد ایک وقت میں 373 ہوتی ہے اور یہ زمین کے گرد قائم چار برجوں پر پہرے دار ہوتے ہیں۔
- چوتھی منزل پر فائز لوگوں کو "خالصین" کہا جاتا ہے۔ ان کی کل تعداد 676 ہے۔ ان میں سے کچھ حالت سُکر اور کچھ حالت صحو میں ہوتے ہیں۔
- علمِ باطنی کی پانچویں منزل پر فائز لوگ "اوتاد" کہلاتے ہیں۔ یہ مقام لاہوت تا ہوت کے نگران ہیں۔ ان کی کل تعداد 233 ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں سے فقر کی اصل رُوح نکلتی ہے اور فقر کی اصل ابتدا ہوتی ہے۔
- چھٹی منزل کے لوگ "اخیار" کہلاتے ہیں۔ یہ حالت سُکر وصحو دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی کل تعداد 313 ہے۔
- ساتویں منزل پر فائز لوگ وہ ہیں جو بہت مشہور ہوئے اور جن کے بارے میں لوگ اکثر سوال کرتے ہیں۔ یہ "ابدال" کہلاتے ہیں۔ ایک وقت میں ان کی تعداد 72 ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ گھومتے ہیں۔ یہ زمین کے اردگرد پرواز کرتے ہیں اور 7,7 کی ٹولیوں میں ہوتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے روضے پر 11 ابدال ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔
- آٹھویں منزل پر فائز لوگ "مقرب الحق" کہلاتے ہیں۔ یہ بہت اہم پوزیشن ہے۔ مقرب الحق وہ لوگ ہیں جو درس وتدریس اور لوگوں میں علم پھیلانے پر مامور ہوتے ہیں۔ ان کی کل تعداد 40 ہوتی ہے۔ یہ اپنی نوعیت میں بظاہر ایک طرح ابدال ہی ہوتے ہیں لیکن درحقیقت ان سے ایک Step (قدم) آگے ہوتے ہیں اور لوگوں میں علم پھیلاتے ہیں۔
- علمِ باطنی کی نویں منزل پر فائز لوگوں کو "ابرار" کہا جاتا ہے۔ یہ تعداد میں 227 ہوتے ہیں جن میں سے تین ہر وقت حضوری میں اور 224 ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔

- علم باطنی کی دسویں منزل خاصی Confusion پیدا کر دے گی۔ جب ہم درجات ولایت کی بات کرتے ہیں تو دسویں درجے کا مقام ''قطب'' سے بلند ہے۔ لیکن جب منزل کی بات ہوتی ہے تو یہ قطب سے نیچے ہوتے ہیں اور ''غوث'' کہلاتے ہیں۔ ''غوث'' بظاہر تو ایک وقت میں ایک ہوتا ہے جسے ''غوث الثقلین'' کہا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ تین ہوتے ہیں جن میں سے دو ڈیوٹی پر نہیں آتے۔
- علم باطنی کی گیارھویں منزل ''نقیب اعلیٰ'' ہے۔ یہ ایک وقت میں دو ہوتے ہیں۔ یہ ہمیشہ حالت صحو میں ہوتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ حالت صحو حالت سُکر سے کہیں زیادہ Superior (برتر) گنی جاتی ہے۔ حالت صحو میں رہنے والا ولی اللہ بلند ہے کیوں کہ اُس کی زبان سے خلق خدا کے فائدے کی بات نکلتی ہے۔ اُسے اپنی زبان پر عموماً قابو رہتا ہے تاوقتیکہ وہ جذبات میں بہہ کر حالت سُکر میں نہ چلا جائے۔ اور حالت جذب میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے خلق خدا کے نقصان کا اندیشہ ہو۔ ''نقیب اعلیٰ'' ہمیشہ حالت صحو میں ہوگا۔
- بارھویں منزل پر ''رقیب علی الحق'' ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں منصور حلاج فائز تھے۔ ''رقیب علی الحق'' کبھی اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے۔ اپنے بارے میں کبھی کوئی بیان نہیں دیتے لیکن رب تعالیٰ ایسا علم رکھنے والے اشخاص کی خوشبو خود زمین پر پھیلا دیتا ہے۔ ان پر جب حالت جذب طاری ہوتی ہے تو اُن کا اپنا مقام اُن کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور وہ بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں ''انا الحق''۔ پھر یہ لوگوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ ''رقیب علی الحق'' یہ ایسا اعلیٰ مقام ہے جہاں اولیاء اللہ کی حضوری میں رہ رہ کر اُس سے اِس قدر پیار کرنے لگتے ہیں کہ پھر دُوری دُوری نہیں رہتی یہاں تک کہ وہ بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں ''انا الحق''۔ اِس کا انجام موت ہے جیسا کہ منصور حلاج کے ساتھ ہوا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی تین مرتبہ حالت جذب میں ایسا ہی ہوا اور وہ دعویٰ کر بیٹھے لیکن اتفاقاً بچ گئے۔
- تیرھویں منزل پر وہ مقام ہے جس کے بارے میں لوگ سب سے زیادہ جانتے ہیں اور کم از کم نام کی حد تک واقف ہیں اور اِسی منزل کے دُنیا میں سب سے زیادہ دعویٰ دار ہیں۔ یہ قطب کی منزل ہے جو ایک وقت میں تین ہوتے ہیں اور زمین کے چاروں کونوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ نگرانی کے وقت یہ اپنی جان سے بھی چلے جاتے ہیں۔ ''قطب'' بہت بڑا مقام اور ذمہ داری ہے کیوں کہ ہر قطب ایک تہائی زمین کا نگران ہے اور وہ ایک تہائی زمین پر اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے۔
- علم باطنی کی چودھویں منزل ''قطب الاقطاب'' کی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ صاحب تھے۔ ایک روایت کے مطابق اُن کے دائیں بازو کا اگلا حصہ جھلسا ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اُن کے ہم عصر قطب جو سید تھے اور بے حد حسن و جمال کے مالک تھے۔ اُن کا مقام تشت پشاور تھا۔ جب حضرت بختیار کاکی صاحب پشاور تشریف لے گئے تو اُن قطب نے اپنے علاقے کی حدود شروع ہوتے ہی قطب الاقطاب کا استقبال آگ سے کیا۔ تب حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ صاحب

نے اپنا بازو آگ میں ڈال کر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔

اس واقعہ کی صداقت اُس وقت ہوگئی جب 1985ء میں پشاور میں موجود اُن خوب صورت اور حسین قطب سے میری ملاقات ہوئی۔ اُن کا حسن و جمال واقعی بے مثال ہے۔ بہت اچھے انسان ہیں۔ لیکن وہ اپنی راز روحانی کے بارے میں بہت حساس ہیں اور واقعی آگ سے استقبال کرتے۔ (جملہ معترضہ)

جب کوئی شخص قطب کی منزل پر آتا ہے تو وہ درجہ بدرجہ سیڑھی اُوپر چڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ قطب الاقطاب کی منزل تک جا پہنچتا ہے۔ قطب الاقطاب کی منزل سے پہلے قطب ابدال، قطب الارشاد، قطب مسلکین کا درجہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک درجہ قطب المدار کا ہے جو خاصا Senior ہے۔

قطب العالم، قطب الاوتار اور قطب القلندر کا درجہ بھی قطب الاقطاب کی منزل کا سنگِ میل ہے۔ اسی طرح اس میں ایک درجہ قطب شاہ کا ہے۔ یہ لوگ ایک وقت میں 13 مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ دورانِ حج کثرت سے بالخصوص خانہ کعبہ میں مسجد الحرام اور بالعموم پوری زمین پر پھیلے ہوتے ہیں۔ حجر اسود پر ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور موجود رہتا ہے۔ اسی لیے یہاں خانہ کعبہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

- علم باطنی کی پندرھویں منزل پر جو آدمی فائز ہوگا وہ "نگرانِ اعلیٰ" کہلائے گا۔ نگرانِ اعلیٰ ایک وقت میں ایک ہی ہوتا ہے۔
- علم باطنی کی سولھویں منزل "امام" کی ہے۔ (اب آپ کو پتا چل جائے گا کہ منزلیں زیادہ اور درجات کم کیوں ہیں۔)

امام طریقت کے سلسلوں کے والی اور نگران ہوتے ہیں اور ایک وقت میں ان کی تعداد صرف چار ہوتی ہے۔ یہ اپنا وقت پورا کر کے بدلتے رہتے ہیں۔ جب ایک امام دُنیا سے چلا جاتا ہے تو نیا امام اُس کی جگہ لے لیتا ہے

- علم باطنی کی سترھویں منزل بھی "امام" ہی کی منزل ہے لیکن یہ بارہ امام وہ ہیں جن میں سے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو سب سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ ان دونوں کا مقام بے حد بلند ہے۔ وہ سلسلہ منقطع ہو چکا۔ اب ان دونوں جیسا مقام کوئی نہیں پا سکتا۔
- اٹھارویں منزل جناب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ہے۔ یہ منزل حضرت علیؓ کے لقب اور کنیت کی نسبت سے "باب علم" اور "باب ابوتراب" کہلاتی ہے۔
- علم باطنی کی انیسویں اور آخری منزل جناب آپ ﷺ کی ہے۔ آپ ﷺ اس کونسل کو Chair کرتے ہیں جہاں طریقت کے تمام معاملات کے حتمی فیصلے ہوتے ہیں۔

یہ 19 منزلیں ہیں۔ فقر کے درجات کچھ سلاسل میں 10-1 ہیں، کچھ میں 50-1 اور کچھ میں 100-1 ہیں۔ اصل میں یہ دس ہی ہیں کیوں کہ 50 درجات والے سلسلے میں ہر درجہ پانچ Stages پر اور 100 درجات والے سلسلے میں ہر درجہ دس Stages پر مشتمل ہے۔

یہ درجات بالکل ایسے ہی ہیں کہ سول سروس (Civil Service) میں سیکشن آفیسر سے لے کر سیکریٹری تک کے عہدے ہیں۔ فوج میں افسروں میں سیکنڈ لیفٹیننٹ سے فیلڈ مارشل تک کے درجے ہیں۔ کہلاتے وہ سب افسر ہی ہیں لیکن اُن کے علم کی منزلیں مختلف ہیں۔ ایک ہی عہدہ پر فائز آدمی مختلف منزلوں پر ہو سکتے ہیں۔

درجے اور منزل میں یہ فرق ہے۔ فقیر غوث اور قطب الاقطاب سے آگے نہیں جاتا۔ امام کے مقام تک بہت لوگ پہنچے۔ ایک امام سیالکوٹ میں دفن ہیں امام ولی الحق صاحب۔ فائر بریگیڈ سٹیشن کے پاس پہاڑ کی بلندی پر اُن کی آخری آرام گاہ ہے۔ انہی کے ایک بھائی انڈیا میں دفن ہیں امام ولی ناصر۔ اُن کے تیسرے بھائی بھی امام کے درجے پر فائز ہیں۔ پچھلی ایک صدی میں امام کے درجے تک کوئی نہیں پہنچ پایا۔ کوئی بھی ولی اللہ قطب اور غوث کے مقام سے آگے نہیں جا سکا۔

سوال: اگر کوئی صاحب کسی صاحب علم، صاحب دُعا اور صاحب کشف و نظر کو اپنا مرشد مان چکے ہوں تو کیا وہ کسی دوسرے صاحب دُعا سے دُعا کی درخواست کر سکتے ہیں؟

جواب: جس طرح ملازمت، شادی یا دوستی یک طرفہ نہیں ہوتی کہ میں یہ تصور کر لوں میں فلاں ادارے میں ملازم ہو گیا یا فلاں صاحب میرے دوست ہیں۔ ملازمت تو اُس وقت پکی ہو گی کہ میں کسی ادارے میں ملازمت کا فیصلہ کروں اور وہ ادارہ بھی میرا تقرر کرے۔ اسی طرح میں تو کسی صاحب کو اپنا دوست سمجھتا ہوں لیکن وہ ایسا نہیں سمجھتا تو یہ دوستی نہیں کہلائے گی۔

اسی طرح ہم کسی صاحب نظر کو مرشد مان لیں لیکن اگر وہ ہمیں اپنا شاگرد تسلیم نہ کرے تو یہ دوستی پکی نہیں ہو گی۔ لازم ہے کہ قول و اقرار دونوں جانب سے ہو۔ مرشد کسی شخص کو اپنا شاگرد اور شاگرد کسی شخص کو اپنا مرشد Acknowledge (تسلیم) کر لے۔ اگر کوئی صاحب دل میں کسی کو اپنا مرشد مانتے ہیں لیکن مرشد صاحب انہیں اپنا مرید یا شاگرد نہیں مانتے تو Rule of game لاگو نہیں ہو گا۔ ایسی صورت میں آپ آزاد ہیں۔ جہاں اور جس صاحب نظر و دُعا کے پاس چاہیں جائیں۔ آپ پر کوئی قدغن لاگو نہیں ہو گی۔

سوال: اس آیت کی تشریح فرما دیجیے۔

مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (سورۃ الکھف: 39)

جواب: سورتوں اور آیات کی تفسیر میرے نزدیک اس طرح بتانا ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ قرآن پاک کی سورتوں کی اکثریت ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہے۔

قرآن پاک کی دو ترتیب ہیں۔

1۔ نزولی ترتیب

2۔ کتابی ترتیب

قصہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی ایک آیت اگر آج نازل ہوئی تو عین ممکن ہے کہ اُس کی اگلی آیت چار ماہ بعد نازل ہوئی ہو۔ جیسے طلاق کے معاملات، نماز، زکوۃ اور دیگر ایسے احکامات ایک سے زیادہ سورتوں میں بکھرے ہیں۔ لہٰذا جب ہم کسی ایک سورۃ میں موجود کسی آیت کی تشریح کریں تو ضروری ہے کہ دیگر سورتوں میں اس حکم یا معاملہ کے حوالے سے آیات کو دیکھ لیں۔ ایک آیت کا علیحدہ سے ترجمہ کرنا Out of context ہو جائے گا۔

جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے مَاشَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ جس کا ترجمہ ہے "جو اللہ چاہے ہمیں کچھ زور نہیں مگر اللہ کی مدد کا۔" بے شک اللہ کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا۔ درحقیقت یہ Concept (تصور) اور یہ یقین کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے۔ میرے ساتھ جو بھی پیش آئے گا وہ من جانب اللہ ہوگا۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑی حکمت ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ جب وہ محنت کرے، جب وہ زندگی میں سختیاں اُٹھائے تب اُس کے اندر یہ احساس ہو کہ کوئی Superior power (اعلیٰ طاقت) ہے جو مجھے Support (مدد) کر رہی ہے۔ جب مشکل اور کڑے حالات میں انسان کے اندر یہ یقین ہو کہ میرا رب سب سے زیادہ قوت کا مالک ہے۔ میرا رب میری والدہ سے 70 گنا زیادہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ ان دونوں احساسات وجذبات کو جب ہم اپنے اندر موجود پاتے ہیں تو ہم اللہ سے خوفزدہ ہونے کی بجائے اُس سے پیار کرنے لگتے ہیں۔ اللہ واحد و یکتا ہے۔ ہر صفت میں بے مثل اور لاثانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی مہربان بھی ہے۔ جب ہم یہ سب سوچتے ہیں تو اللہ پر بھروسا کرنے لگتے ہیں اور اپنے معاملات و نتائج اُس کے حوالے کرنے لگتے ہیں۔

رب تعالیٰ کا قوی و تمام اختیارات کا مالک ہونا، اُس کا زبردست ہونا ہم پر رحمت بن کر آتا ہے اور اللہ پر ہمارے یقین میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ بے پناہ طاقت ور ہونے کے باوجود ہم پر کس قدر مہربان ہے، اللہ کے ساتھ ہمارا پیار کا رشتہ قائم کرتا ہے اور یہ یقین کہ اللہ سب سے زیادہ طاقت ور ہے ہمیں خوف سے نجات دلاتا ہے۔ میرا یہ یقین کہ میری زندگی و موت رب کے ہاتھ میں ہے، میرا رزق رب تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، تمام عزتیں اللہ ہی کے لیے ہیں وہ جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے۔ وہ مجھے عزت دینا چاہے تو کوئی چھین نہیں سکتا اور وہ نہ چاہے تو کوئی مجھے عزت دے نہیں سکتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر نہ تو کوئی میرا رزق چھین سکتا ہے اور نہ ہی کوئی مجھے رزق دے سکتا ہے۔ یہ یقین ہمیں دوسروں کے خوف سے نجات دلا دے گا اور رب تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کی طرف لے جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر ہماری کوششیں ناکام ہو جائیں گی تب بھی ہمیں یہ یقین اور تسلی رہے گی کہ چونکہ سب قوتیں رب تعالیٰ ہی کے پاس ہیں اور یہ سب میرے رب کا فیصلہ ہے۔ میرا رب طاقت وقوت والا ہے۔ اُس کے پاس کسی کی سفارش نہیں چلتی۔ لہٰذا جب ہم ان خطوط پر سوچیں گے تو ہم اپنے رب کی طرف سے آنے والے فیصلوں سے بھاگیں گے نہیں بلکہ ان فیصلوں کو بخوشی قبول کرلیں گے۔

سوال: رب تعالیٰ انسان سے کب راضی ہوتا ہے؟ رب کی دوستی اور رضا کے حصول کا مجرب نسخہ کیا ہے؟ رب کی چاہت کیا ہے؟

جواب: رب انسان سے کب راضی ہوتا ہے؟ اس کا ایک عام اور سہل Yardstick (پیمانہ) ہے کہ اگر انسان کا دل رب سے راضی ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ رب بھی اُس سے راضی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کا دل رب سے کب راضی ہوتا ہے؟ یہ بہت آسان کام ہے جس پر نہ کوئی محنت لگتی ہے، نہ خرچ آتا ہے۔ اگر میں چاہتا ہوں کہ رب مجھ سے اور میں رب سے راضی ہو جاؤں تو بجائے ریاضتوں، مشقتوں کے بس ایک کام کروں کہ میں اپنے ارادے، خواہشات، تمنائیں رب کے ارادوں، خواہشات اور تمناؤں کے ماتحت کر دوں۔ حتیٰ کہ اپنی سوچیں بھی رب تعالیٰ کے ماتحت کر دوں۔ یہی رب کی دوستی کا مجرب نسخہ ہے۔

رب تعالیٰ کی چاہت کیا ہے؟

چاہتیں دو طرح سے پیدا ہوتی ہیں۔

1. میرے دل میں کسی کے لیے محبت اور چاہت اُس وقت پیدا ہوگی جب کوئی بہت بڑا آدمی مجھ پر مہربان ہو جائے گا۔ مجھ پر اپنی نوازشات کرے گا اور مجھے وہ نوازشات یاد رہیں گی۔ تب میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ میں اُس شخص کو نہ تو کچھ دے سکتا ہوں اور نہ اُس شخص کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں پھر بھی یہ مجھ پر اس قدر مہربان ہے۔ یہ احساس اور جذبہ ہی میرے دل میں اُس شخص کے لیے پیار پیدا کر دے گا۔
2. دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مجھے کسی شخص کی Personality (شخصیت)، اُس کی شکل و صورت، طور طریقے، ادب آداب اس حد تک بھا جائیں کہ میرے دل میں اُس کا پیار پیدا ہو جائے۔

بعینہٖ رب کے ساتھ ہمارا پیار پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ یا تو ہم اُس کی صفات پر اندھا ایمان لے آئیں۔ غائبانہ ایمان لا کر اپنے رب کی پرستش کرنے لگیں کہ میرا رب بے پناہ صفات کا مالک ہے اور سب سے بڑھ کر مہربان ہے۔ رب کے ساتھ پیار کی ایک صورت یہ ہے کہ مجھے یہ ادراک ہونے لگے کہ میں اس قدر حقیر ہوں کہ رب کے سامنے ایک ذرّے سے بھی کم تر ہوں اور رب تعالیٰ، اتنی قوت والا اور بے نیاز ہونے کے باوجود مجھے بغیر کسی غرض و لالچ کے پال رہا ہے۔ جب یہ یقین ہمارے دل میں پیدا ہوگا تو ہمارے دل میں رب کی محبت پیدا ہو جائے گی۔

رب تعالیٰ صبح سے شام تک مجھ پر اپنی رحمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ اُس کی نوازشات کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی ایک خواہش کی تکمیل میں دیر ہو گئی تو میں نہ صرف اُس کو یاد رکھتا ہوں بلکہ جگہ جگہ جا کر کہتا ہوں کہ میری فلاں خواہش پوری نہیں ہوئی۔ میرے لیے دُعا کیجیے۔ مقامِ افسوس ہے کہ ہمیں رب کی صبح سے شام تک ہونے والی نوازشات تو یاد نہیں رہتیں لیکن ایک خواہش جو ادھوری رہ جاتی ہے وہ یاد رہتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے

جس میں اگر ہم سوچ لیا کریں کہ رب تعالیٰ نے ہمیں کیا کچھ عطا فرمایا۔ یہ احسان شناسی رفتہ رفتہ ہمیں رب تعالیٰ سے پیار کی طرف لے جائے گی اور ہم دل سے اُس کی پرستش کرنے لگیں گے۔

یاد رکھیے! دل سے کی جانے والی پوجا ظاہری پوجا سے بلند تر ہے کیوں کہ ایسے میں جب میں نماز ادا کروں گا تو وہ صحیح معنوں میں نماز ہوگی۔ تب مجھے رب سامنے دکھائی دے گا۔

دوسری صورت "خوف" کی ہے کہ اگر میں رب تعالیٰ کے قہار و جبار ہونے سے خوف زدہ ہوگیا تو میرا ہر کام پیار کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس کے ڈنڈے اور سزا کے ڈر سے ہوگا۔

جب ہم کسی کام کو محض فرض سمجھ کر یا سزا کے خوف کے تحت کرتے ہیں تو فرض تو ادا ہو جائے گا لیکن اس میں محبت کا عنصر نہیں ہوگا۔

اگر رب تعالیٰ کی محبت ہمارے دل میں پیدا ہو جائے گی تو دل سے خوف رُخصت ہو جائے گا اور محبت اُس کی جگہ لے لے گی۔ جب دل میں رب تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے تو انسان رب کی ناراضگی سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ محبوب کی ناراضگی انسان سے برداشت نہیں ہوتی۔ پھر وہ رب تعالیٰ کی ہر بات بہت جذبے سے مانتا ہے، اُس کی اطاعت بہت جذبے سے کرتا ہے کیوں کہ اُسے اپنے رب، اپنے محبوب کی ناراضگی کسی صورت قبول نہیں ہوتی۔

لہٰذا ضروری ہے کہ جب بھی ہماری کوئی خواہش پوری نہ ہو تو ہم لاحول ولا قوۃ پڑھیں۔ اللہ کی نعمتوں کی بارش کو یاد کریں۔

زیادہ نہیں تو کم از کم صرف اتنا ہی سوچ لیں کہ صبح سے اب تک ہم نے کتنی بار سانس لیا اور کس قدر آکسیجن ہمیں بغیر کسی مشقت کے ملتی رہی۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرنے سے ہم نے رب تعالیٰ کی کائنات کا ماحول آلودہ کر دیا۔ لیکن یہ بھی تو رب کی رحمت ہے کہ وہ اس کی کوئی پوچھ گچھ ہم سے نہیں کرے گا کہ تم نے کتنی آکسیجن Inhale کی اور اس کے نتیجے میں کتنی کاربن ڈائی آکسائیڈ Exhale کی۔

جب ہم رب کی رحمتوں کو یاد رکھیں گے تو ہمارے اندر احسان مندی اور شکر گزاری پیدا ہوگی اور رفتہ رفتہ یہ شکر گزاری اللہ سے محبت میں بدل جائے گی۔

نور، محبت، توجہ

جب ہم خانہ کعبہ کے بارے میں سوچتے ہیں تو پہلا سوال جو ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یہ کہ خانہ کعبہ ایک مخصوص جگہ کی بجائے کہیں اور بھی تو ہو سکتا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب زمین پر صرف پانی تھا۔ سائنس کے مطابق بگ بینگ (Big Bang) اور اسلام کے مطابق 'کُن فیکون' کے بعد زمین آگ کا ایک گولا تھی جو رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ پھر اُس پر صرف پانی تھا۔ تب اُس جگہ جہاں خانہ کعبہ موجود ہے صرف سانپ کے پھن کے برابر چند انچ خشکی تھی۔ رب تعالیٰ نے اُس خشکی کو پھیل جانے کا حکم دیا اور وہ خشکی اطراف کے کناروں سے پھیلتی چلی گئی۔ یوں وہاں خانہ کعبہ قائم کر دیا گیا۔ یہ خشکی کی ابتدا تھی۔ اس لیے خانہ کعبہ کے مقام کو خشکی کا مرکز مانا جاتا ہے۔

خانہ کعبہ جس شہر میں موجود ہے اُسے ایک زمانے میں "مکہ" کی بجائے "بکہ" کہا جاتا تھا۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہوئی تو حجرِ اسود جنت سے زمین پر بھیجا گیا۔ موجودہ دور میں جنت کی واحد چیز جو زمین پر پائی جاتی ہے وہ یہی حجرِ اسود ہے۔ تصوف میں حجرِ اسود کے بارے میں ایک اور بات کہی جاتی ہے کہ درحقیقت یہ ایک فرشتہ ہے جسے رب تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے پتھر کی صورت دے دی۔ یہ حساب رکھتا ہے اُن لوگوں کا جو اسے بوسہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔

ایک اور روایت ہے کہ جس طرح رب تعالیٰ نے عرش پر لوحِ محفوظ بنائی جس میں قرآن پاک محفوظ تھا اور وہاں سے شب قدر کو قرآن پاک اُتار کر آسمان دُنیا پر نازل کیا گیا۔ ایک رات میں قرآن پاک کے نزول کے پیچھے یہی روایت موجود ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ہر شب قدر حضرت جبرائیل علیہ السلام گزشتہ سال میں نازل ہونے والی وحی یک جا کر کے آپ ﷺ کو سنایا کرتے تھے۔

ایک اور روایت ہے کہ عرش پر موجود لوحِ محفوظ پر پوری کائنات کی تقدیر لکھی ہے جو حجرِ اسود زمین پر موجود خانہ کعبہ میں نصب ہے اس پر اُن لوگوں کی تقدیر محفوظ ہے جو اسے بوسہ دیتے ہیں۔

حجرِ اسود کے حوالے سے یہ مختلف روایات اپنی جگہ لیکن اصل حقیقت یہی ہے کہ حجرِ اسود دراصل جنت سے بھیجا گیا پتھر ہے جسے قیامت کے روز اُٹھا لیا جائے گا۔

ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ مکہ میں خانہ کعبہ کے اردگرد موجود تمام پہاڑیاں سیاہی مائل ہیں اور ان کا پتھر سیاہ ہے۔ دراصل اللہ کا جو نور ہے وہ چمک دار سیاہی مائل ہے۔ اس میں آمیزش ہے سفیدی اور سیاہی کی۔ لیکن اس آمیزش میں بہت چمک ہے۔ چونکہ یہ پتھر جنت کا ہے اور اس میں اللہ کا نور ہے اور اگر غور سے دیکھیں تو وہ پتھر سیاہ نہیں بلکہ اس میں سفیدی کی آمیزش اور چمک کا احساس ہوتا ہے۔

خانہ کعبہ کے قریب ہونے کی وجہ سے اُن پہاڑیوں پر اللہ کا نور برستا ہے اس لیے وہ چمک دار سیاہ دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق چونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تیرہ برس تک مکہ میں تشریف لاتے رہے اور اُن کی آمد چونکہ نور کی آمد تھی اس لیے ان پہاڑوں کا رنگ سیاہ ہو گیا کیوں کہ جہاں نور ہو گا وہاں سیاہی ہو گی۔ لیکن میرے خیال کے مطابق یہی روایت درست ہے کہ آپ ﷺ کی آمد سے پہلے بھی وہ پہاڑیاں سیاہی مائل ہی تھیں اور خانہ کعبہ پر اللہ کے نور کی بارش کی وجہ سے اردگرد کی پہاڑیاں چمک دار سیاہ ہیں کیوں کہ ان انوار کا عکس ان پہاڑیوں پر پڑتا ہے۔

سوال: شب برأت میں کیا معمول عبادت ہونا چاہیے؟

جواب: شعبان کی پندرھویں شب نوافل کثرت سے ادا کریں۔

- شب دو بجے سے لے کر فجر تک تلاوتِ کلام پاک کثرت سے کریں۔
- شعبان کی خاص عبادات میں صلوٰۃ الخیر شامل ہے۔ یہ 100 رکعت نفل نماز ہے جس کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد 10 بار سورۂ اخلاص پڑھ لی جائے اور نوافل کے اختتام پر اللہ کے حضور دعا مانگ لی جائے۔

شب برأت میں آپ ﷺ نصف شب کے قریب عبادت کے لیے کھڑے ہو جاتے اور کثرت سے نوافل ادا کرتے۔ ان نوافل میں قیام مختصر اور سجدہ طویل ہوتا۔

طویل سجدہ دُنیاوی لحاظ سے بھی دو طریقوں سے فائدہ مند ہوتا ہے:

1۔ طویل سجدہ کرنے والا عقلی لحاظ اور ذہانت کے اعتبار سے بلند ہو گا۔

2۔ اُس کی یادداشت تیز ہو گی۔

رُوحانی لحاظ سے اس کا فائدہ یہ ہے کہ سجدہ چونکہ رب تعالیٰ کو بے حد پسند ہے اس لیے سجدہ میں گر کر کی گئی دُعائیں بہت جلد قبول ہوتی ہیں۔ سجدہ عاجزی کے اظہار کا بہت اعلیٰ ذریعہ ہے کہ انسان اپنا سر رب کے قدموں میں رکھ دیتا ہے۔ جو شخص شب برأت میں اپنا سر رب کے قدموں میں رکھ دیتا ہے اور عاجزی کا اظہار کرتا ہے، وہ یقیناً فلاح پاتا ہے۔

اگر انسان نماز اکیلا پڑھ رہا ہو جس طرح ہم فرض نماز کے علاوہ نوافل وسنت اکیلے میں پڑھتے ہیں۔ ان میں ہم سجدہ طویل کر سکتے ہیں اور جسمانی و رُوحانی فوائد سمیٹ سکتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان ہے:

''نماز تیزی سے ادا کرنے والے کا رزق کم کر دیا جاتا ہے۔''

لہٰذا نماز تسلی سے ادا کیجیے۔ باجماعت نماز میں امام صاحب کی پیروی کرنا ہوتی ہے لیکن جب اکیلے نماز پڑھیں تو اس میں جلدی کا عنصر شامل نہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ یوں ہم رزق میں کمی سے بھی بچے رہیں گے۔ دوسری کوشش ہم یہ کریں کہ ہمارے رکوع و سجود طویل ہوں۔ اس کے ہمیں بہت زیادہ فوائد حاصل ہوں گے۔

سوال: درود شریف کی حقیقت اور اہمیت و فضیلت کیا ہے؟ کیا یہ بھی ذکر ہے؟

جواب: آپ ﷺ فرشتوں سے بھی زیادہ معصوم ہیں اور وہاں گناہ کا کوئی گزر نہیں ہے۔ پھر آپ ﷺ اللہ کے محبوب ہیں اور محبوب ﷺ بھی کیسے کہ رب تعالیٰ جو خود کوئی کام نہیں کرتا محض احکامات جاری کرتا اور ایک ہلکا اشارہ کرتا ہے تو کام ہو جاتا ہے۔ بس ایک کام ذاتی طور پر کرتا ہے اور وہ ہے آپ ﷺ پر درود بھیجنا۔

جہاں تک درود پاک کی حقیقت کا تعلق ہے تو درود پاک ایک دعا ہے۔ آپ ﷺ جس مقام پر ہیں وہاں آپ ﷺ کو کسی دُعا کی ضرورت نہیں لیکن آپ ﷺ نے جو احسان ہم پر کیا کہ اللہ کا پیغام نہ صرف ہم تک پہنچایا بلکہ عملی طور پر وہ پیغام ہم تک پہنچانے کے لیے آپ ﷺ نے سخت ترین زندگی گزاری۔ یہ بہت بڑا احسان ہے آپ ﷺ کا ہم پر۔ ہم اس احسان کا اظہار درود شریف پڑھ کر کرتے ہیں۔ یہی درود پاک کی اصل حقیقت ہے۔

احسان مندی کا اجر بہت ہے اور احسان ناشناسی کرنے والے کو رسوائی ملتی ہے۔ اللہ نے خود فرمایا کہ جو شخص میرے بندوں کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ میرا شکر گزار کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جو شخص ہم پر احسان کرے ہمیں اُس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ آپ ﷺ نے تو ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اللہ کے پیغام کو عملی طور پر ہم تک پہنچانے کے لیے، محض ہمارے لیے تکالیف اور اذیتیں برداشت کیں تاکہ ہم کڑے حالات میں اُن تکالیف اور مصائب کو مدنظر رکھتے ہوئے صبر و تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کر سکیں۔ آپ ﷺ کے اس احسان عظیم کو ہم درود شریف پڑھ کر Acknowledge کر سکتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا درود پاک ذکر ہے؟

کوئی دُعا قبول نہیں ہوتی جب تک اُس کے اوّل و آخر درود پاک نہ پڑھا جائے۔ جب دُعا کی قبولیت درود کے ساتھ مشروط ہے تو اُس کے ذکر ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

ایک اور بات کہ ہمیں درود پاک آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں بطور اظہار تشکر پیش کرنا چاہیے۔ یہ ایسا اظہار تشکر ہے کہ جسے فرشتے ہر جمعہ اور سوموار کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے ہدیۂ عقیدت آپ ﷺ کے لیے بھیجا ہے۔ جس شخص کا ذکر آپ ﷺ کی محفل میں ہونے لگے تو اس کی خوش بختی میں کیا شک ہے۔ علاوہ ازیں درود شریف بھیجنے والے کو آپ ﷺ کی شفاعت نصیب ہوگی۔

ایک روایت کے مطابق درود شریف پڑھنے والوں کے چہرے بروزِ قیامت بہت روشن ہوں گے۔

لہٰذا اگر ہم روزِ محشر شفاعت کے خواہش مند ہیں اور چاہتے ہیں کہ قیامت کے دن ہمارے چہرے روشن ہوں تو ہمیں درود شریف کثرت سے پڑھنا چاہیے۔

سوال: (الف) محبت کیا ہے؟

(ب) کیا مجازی محبت جائز ہے؟

(ج) کیا عشقِ مجازی حقیقی عشق تک لے جاتا ہے؟

جواب: محبت، پسندیدگی کی ایک ایڈوانس فارم (Advance Form) یعنی ابتدائی شکل ہے۔ جب ہم اپنے دل میں کسی شخص کے علم، ذہانت، گفتگو، عادات، Manners (طور طریقے) اور ادب آداب کے باعث پسندیدگی کا جذبہ محسوس کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ اُس سے زیادہ سے زیادہ ملیں۔ جب زیادہ ملتے ہیں اور اُسے Moral Values (اخلاقی اقدار) کا پابند پاتے ہیں تو یہ پسندیدگی چاہت میں بدلنے لگتی ہے۔ تب ہم چاہتے ہیں کہ اُس کی باتیں سنیں اور بار بار اُس سے ملیں۔

اس سے اگلا درجہ Infatuation (لگاؤ) کا ہے۔ جس میں یوں لگتا ہے کہ ہم اس شخص کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن بسا اوقات ہوتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے وہ شخص ہم سے دُور ہو جائے اور کچھ عرصے بعد ہمیں اُسی جیسا یا اُس سے بہتر شخص مل جائے تو ہم اُس کے قریب ہو جاتے ہیں۔

Infatuation (لگاؤ) سے اگلا مقام محبت کا ہے۔ یہ انتہا سے بڑھی ہوئی عقیدت اور پسندیدگی کا مقام ہے اس مقام پر جب ہم جاتے ہیں تو جس شخص کے ساتھ ہمیں اتنا گہرا لگاؤ ہوتا ہے اُس کی ہر خواہش پوری کرنا ہمارے لیے عین سعادت اور باعثِ مسرت ہوتا ہے۔ اُس کی زبان سے نکلا ہر حرف ہمارے لیے حرفِ آخر ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو خوش کرنے کے لیے ہم کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔

محبت سے اگلا مقام عشق ہے۔ جہاں انسان اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ اُسے ہر طرف بس وہی ایک شخص دکھائی دیتا ہے اور کوئی نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(ب) کیا مجازی محبت جائز ہے؟

جی ہاں! کسی کے ساتھ رشتہ محبت رکھنا بشرطیکہ وہ جائز ہو اور اُس میں گناہ شامل نہ ہو جائز ہے کیوں کہ خود ربِ تعالیٰ نے بھی تو آپ ﷺ سے محبت کی ہے۔

(ج) کیا عشقِ مجازی انسان کو حقیقی عشق تک لے جاتا ہے؟

اولیائے کرام کی اکثریت کی Destiny (منزل) یہ تھی کہ وہ رب کا بندہ بننا چاہتے تھے لیکن جب دُنیاوی

جبر اور تقاضوں کے تحت وہ اس مقام کو نہ پہنچ پائے تو رب تعالیٰ نے انھیں عشقِ مجازی میں مبتلا کر دیا۔ جب وہ وہاں دل گرفتہ ہوئے اور انھوں نے عشقِ مجازی میں چوٹ کھائی تو رب تعالیٰ نے انھیں ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور وہ ولایت کے بہت اعلیٰ درجے پر پہنچے۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم عشقِ حقیقی کے حصول کے لیے دانستہ طور پر عشقِ مجازی میں مبتلا ہو جائیں۔

سوال: ذکر میں توجہ کا نسخہ اور اہمیت کیا ہے؟ یہ کیسے پتا چلے کہ ذکر اذکار کے بعد ہم کہیں پہنچ بھی رہے ہیں یا نہیں؟

جواب: ہر چیز کو ماپنے کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ کپڑے کو ہم گز یا میٹر سے ناپتے ہیں۔ فاصلوں کو ہم میل یا کلومیٹر سے اور جہاز کی رفتار کو Mach سے ناپتے ہیں اور ایک Mach آواز کی رفتار کے برابر ہوتا ہے۔ جب ہم کار یا ٹرین میں سفر کرتے ہیں تو اپنے دونوں اطراف پر موجود درخت اور Poles (کھمبے) دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری سواری حرکت کر رہی ہے اور جس تیزی سے منظر تبدیل ہوتے ہیں اُن سے سواری کی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح راستے میں Landmarks سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اتنا سفر طے ہو گیا اور اتنا ابھی باقی ہے۔ اس کے برعکس جب ہم ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں تو جہاز ایک جگہ ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے حالانکہ اس کی رفتار کار یا ٹرین کی رفتار سے تقریباً آٹھ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ایسا کیوں؟ دراصل ہوائی جہاز کی رفتار کا اندازہ اس لیے نہیں ہوتا کیوں کہ اس کے دونوں اطراف پر کوئی Reference نہیں ہوتا کسی منظر، درخت، Pole یا Landmark کی صورت میں۔

اسی طرح دورانِ تعلیم جب ہم ایف اے کر لیتے ہیں تو گویا یہ Yardstick (پیمانہ) ہے کہ ہم نے بارہ سال لگا لیے اور مزید چار سال پڑھنے کے بعد ہماری ڈگری مکمل ہو جائے گی۔ یوں ہم درجہ بدرجہ آگے بڑھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اتنا علم ہم نے حاصل کر لیا ہے۔ لیکن رُوحانی علم میں ایسا کوئی نسخہ، کوئی Yardstick یا پیمانہ نہیں جس سے پتا چلے کہ ہم کتنا علم حاصل کر چکے اور کتنا باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پریشان ہو جاتے ہیں کہ اتنا عرصہ ریاضت اور ذکر کرنے کے باوجود ہمیں ملا تو کچھ بھی نہیں۔ دراصل اس کی وجہ وہ کتابیں ہیں جن میں ہم پڑھتے ہیں کہ فلاں ولی اللہ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ اور کوئی یہاں بیٹھا Atlantic Ocean میں ڈوبتے جہاز کو بچا رہا ہے۔ لاشعور میں اس سے ملتی جلتی کہانیاں اور قصے ہونے کے باعث ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی ذکر اذکار کے بعد ہوا میں اُڑنے لگیں اور جب ایسا نہیں ہوتا تو ہم مایوس ہو کر سوچتے ہیں کہ شاید ہم تو کہیں پہنچ ہی نہیں پا رہے۔

ایک طریقہ ہے یہ جانچنے کا کہ عبادت سے ہمیں کچھ مل رہا ہے یا ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ جب عبادت کے نتیجے میں انسان کی فطرت اور سوچ میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگتی ہیں تو سمجھ لیجیے کہ اُسے کچھ حاصل ہو رہا ہے۔ کیوں کہ جب انسان اخلاص کے ساتھ ذکر کرتا ہے تو وہ یہ انتظار نہیں کرتا کہ مجھے کیا ملا اور کیا رہ گیا۔ وہ تو بس مدہوش ہے اللہ کی یاد میں۔ انسان میں تبدیلی یوں بھی آتی ہے کہ ایک کنجوس شخص رفتہ رفتہ

بدلتا چلا جاتا ہے اور پھر وہ وقت آتا ہے کہ وہ کھلے دل سے خرچ کر رہا ہوتا ہے اور دوسروں کو دے کر خوش ہوتا ہے۔ پہلے وہ چھوٹے چھوٹے مسائل سے پریشان ہو جاتا تھا لیکن ذکر کرنے کے بعد بڑے بڑے مسائل سے بھی وہ گھبراتا نہیں۔ بلکہ حیرت انگیز طور پر پلک جھپکنے میں اُن مسائل کا حل اُس کے ذہن میں آجاتا ہے اور وہ اُس حل کو Apply کر کے مسائل سے باہر نکل آتا ہے۔ پہلے دُنیا کی محبت میں چھوٹا سا نقصان ہمیں پریشان کر دیتا تھا لیکن صدقِ دل سے ذکر کرنے کے بعد ہم بڑے سے بڑے نقصان کے بعد بھی اطمینان سے بیٹھے رہتے ہیں۔

ایک اور تبدیلی جو اگلی اسٹیج پر آتی ہے کہ جب کوئی ہم سے سوال پوچھتا ہے تو ہمیں جواب معلوم نہیں ہوتا لیکن اِس سوال کے پوچھے جانے کے بعد within seconds (لمحوں میں) ہم اُس کا جواب دینے لگتے ہیں اور خود حیران ہوتے ہیں کہ یہ جواب میں نے کیسے دے دیا۔ یوں انسان اپنی باتوں سے خود سیکھنے لگتا ہے۔ لیکن یہ بہت آگے کا مقام ہے اور یہی Yardstick (پیمانہ) ہے جس سے اندازہ ہو جاتا کہ اللہ ہمیں انعامات دے رہا ہے۔ کوشش کیجیے کہ کسی طور ہمارے دل سے یہ بات نکل جائے کہ ہمیں ذکر اور عبادت کا کوئی معاوضہ مل جائے۔ اس کی بجائے ہمارے دل میں اظہارِ تشکر کا جذبہ پیدا ہو جانا چاہیے اپنے رب تعالیٰ کے لیے اس لیے نہیں کہ وہ ہمیں پال رہا ہے بلکہ اس لیے کہ اتنے عظیم ترین رب تعالیٰ نے ہمیں یہ اعزاز بخشا کہ ہمیں اپنا بندہ بنالیا۔ اگر صرف یہی ایک احساسِ تشکر پیدا ہو گیا کہ اگرچہ میں اس لائق نہیں تھا، میں Qualify نہیں کرتا تھا پھر بھی رب نے مجھے اپنی رحمت کے صدقے اپنا بندہ بنالیا تو یہی کافی ہو جائے گا۔

ایک مثال...... گلی میں پھرتا ہوا آوارہ کتا خواہ کتنا ہی Ferocious (خونخوار) کیوں نہ ہو۔ اگر وہ بھوکا اور پیاسا ہو اور کوئی اُسے روٹی اور پانی دے دے تو وہ کتا اظہارِ تشکر کے طور پر اُس شخص پر کبھی بھونکتا ہے نہ اُسے کاٹتا ہے۔ بلکہ اُس کے دروازے پر بیٹھ کر کسی کو اندر نہیں جانے دیتا۔ یہ ایک نجس جانور کا ردِعمل ہے۔ ہم تو پھر اشرف المخلوقات ہیں۔ تو کیا ہم رب کے حضور سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتے۔ یہ سوچ کر اُس کی عبادت نہیں کر سکتے کہ صرف وہی لائق عبادت ہے اور وہ ہمارا رب ہے۔

سوال: ذکر کے دوران توجہ و دھیان مرکوز کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟

جواب: ذکر کرتے ہوئے کوشش کریں کہ آنکھیں بند کر کے سوچیں کہ میں اپنے رب کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ مجھے نظر آرہا ہے۔ یوں توجہ رب کی طرف چلی جائے گی اور ذکر میں انہماک پیدا ہو جائے گا۔

رب سے وابستگی

سوال: اسلام میں تعویذات کا کیا تصور ہے؟ کیا یہ شرک ہے؟ تعویذ دینے والوں کو وسیلہ بنانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: تعویذ دو طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ جن میں سے ایک طریقہ وہ ہے جس میں کلامِ الٰہی کو بنیاد بنا کر تعویذ لکھے جاتے ہیں۔ Words (الفاظ) یا Figures (ہندسوں) کی صورت۔ ان کا تعلق براہ راست کلامِ الٰہی سے ہوتا ہے۔

Strictly speaking ان تعویذات کو حاصل کرنے میں کوئی شرعی رُکاوٹ نہیں ہے۔ لیکن عقیدہ کے لحاظ سے اس کی Implication خاصی شدید ہو جائے گی۔ سیدھی سی بات ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ رب تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ تمام قوتوں کا مالک ہے۔ اسی کے حکم سے کام ہوتے اور رُکتے ہیں۔ مشکل کشا بھی وہی ہے۔ حافظ بھی وہی ہے۔ کارساز بھی وہی اور مسبب الاسباب بھی وہی ہے۔ جب ہمارا عقیدہ یہ ہے تو پھر ہم بجائے رب تعالیٰ کو Approach کرنے کے تعویذات جیسی چیزوں کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں۔ ہم ایسی چیزوں کے پیچھے صرف اُس صورت میں بھاگیں گے جب ہمارا ایمان کمزور ہو جائے گا۔ جب ان تعویذات کے ذریعے کام ہونے لگے گا تو ہمارا ایمان اور عقیدہ مزید کمزور ہو جائے گا۔ ہم رب تعالیٰ کو چھوڑ کر تعویذات کے پیچھے بھاگیں گے۔ تو بجائے اس کے کہ ہم غیر اللہ سے مسائل کے حل کے لیے توقع رکھیں اور شرک میں داخل ہو جائیں کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم وقتی تکلیف اُٹھائیں اور خود کو صرف رب تعالیٰ سے وابستہ رکھیں۔ یوں ہماری وقتی تکلیف ہمارے لیے باعثِ اطمینان ہو جائے گی اور اُس کا Reward (اجر) ہمیں ضرور ملے گا۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ تعویذ دینے والوں کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جب ہم Loudly (بآوازِ بلند) یہ کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ سب کا ہے۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کا بلکہ غیر مسلمین، مشرکین اور منکرین کی بھی سنتا ہے تو اپنے نام لیواؤں کی کیوں نہیں سنے گا۔ نماز میں ہمارا Communication (رابطہ) براہِ راست رب تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ دُعا میں ہم براہِ راست رب سے مخاطب ہوتے ہیں بغیر کسی وسیلہ کے۔ تو پھر عام حالات میں کسی دُعا یا تعویذ کرنے والے کے پیچھے کیوں

بھاگتے ہیں؟ کیوں نہ کسی بھی مشکل اور تکلیف کے وقت براہِ راست رب تعالیٰ کے حضور گڑگڑائیں۔ اُس کے در کی کنڈی کھٹکھٹائیں۔ "رب! میں تیرا بندہ ہوں۔ مشکل میں ہوں تو میری مدد فرما!"

رب تعالیٰ تو مشرکین کی بھی سنتا ہے پھر ہماری کیوں نہیں سنے گا۔ لہٰذا رب کو پکارنے کے لیے کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں۔ رب تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق ہے درحقیقت وہی معنی رکھتا ہے اور یہ ہماری ہمت ہے کہ ہم رب کے ساتھ کیسا تعلق جوڑتے ہیں۔ رب تو وہ ہے جو ہمارے ایک قدم پر دس قدم چل کر ہماری طرف آتا ہے۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ جس Level (سطح) کا چاہیں اُس کے ساتھ رابطہ قائم کر لیں۔ اُسے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔
ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو رب کا اتنا قریبی دوست سمجھتے ہیں کہ جب اُن کا کوئی کام نہیں ہوتا تو مسجد کی محراب پر ہاتھ مار کر بڑے مان سے کہتے ہیں۔

"اوئے ربا! تینوں پتا ئیں میں کسے دی مدد کرن دا وعدہ کیتا ہویا اے۔ پیسے بھیج۔"

یہ رب کے ساتھ ایک مان بھرا تعلق ہے جس کی بنا پر ہم اُس سے کہتے ہیں کہ پیسے بھیج۔ ہمیں ضرورت ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں تو کون اور میں کون؟ ایک ہی تو ہیں۔ یہ بھی تعلق کا ایک Level ہے۔ رب تعالیٰ یک جائی کے اس مقام کو بڑا پسند کرتا ہے اور اس کا مان بھی رکھتا ہے۔ اس درجہ کا کہ ایسا بندہ زبان سے کوئی بات نکالے تو رب تعالیٰ اُس بات کو پورا کرتا ہے۔ لہٰذا یہ ہماری ہمت اور توفیق کی بات ہے کہ ہم اُس کے ساتھ کیسا تعلق جوڑتے ہیں۔ ہم اُس کے اور اپنے درمیان وسیلوں کی تلاش کی بجائے خود اُس کے قریب چلے جائیں اور اُس کے ساتھ عشق کا مضبوط تعلق جوڑ لیں۔ جتنا ہم رب کے قریب جائیں گے اتنا ہی وہ ہم سے قریب ہو جائے گا۔

ایک مسئلہ آتا ہے کہ جو لوگ رب تعالیٰ سے دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں رب اُس دعویٰ پر یوں ہی یقین نہیں کرتا بلکہ پہلے اُن کو چند آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ جان، مال اور اولاد سے پہلے اُنھیں آزماتا ہے تاکہ دیکھے کہ دوستی کا دعویٰ کرنے والا اپنے اس دعویٰ میں کس قدر سچا ہے۔ چکی کے پاٹوں میں ڈال کر اُسے سرمہ بنایا جاتا ہے۔ اگر وہ سُرمہ بننے پر بھی شور نہ مچائے تو رب تعالیٰ اُس پر نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے اور نعمتیں بھی کیسی..... رزق Unexpected (غیر متوقع) ذرائع سے اُسے ملنے لگتا ہے لیکن وہاں بھی رب اُس کے ساتھ کھیل کھیلتا ہے تاکہ اُسے بتائے کہ باوجود تمھارے پاس نعمتوں کی کثرت ہونے کے..... رب میں ہی تمھارا ہوں۔ مثال کے طور پر ہوتا یہ ہے کہ وہ شخص سوچتا ہے کہ Mr. A مجھے اتنے پیسے دے جائے گا لیکن وہاں سے پیسہ کبھی نہیں آئے گا۔ اور Mr. B کے بارے میں اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا لیکن وہ اچانک آتا ہے اور اچھی خاصی رقم دے جاتا ہے۔

جب ہم چکی کے پاٹوں میں پس رہے ہوتے ہیں تو شیطان ہمیں اُکساتا ہے اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ "اس سے اچھا تو میں تب تھا جب میں نے رب تعالیٰ سے دوستی نہیں کی تھی۔ تب میں بیمار نہیں رہتا تھا۔ صحت بھی تھی اور پیسہ بھی۔" ایک صاحب جو حالیہ سروے کے مطابق امیر ترین لوگوں کی لسٹ میں ساتویں نمبر پر

ہیں، ایک جگہ بیعت بھی ہیں اور نیکی کی باتیں بھی بہت کرتے ہیں۔ اللہ نے انھیں ہلکی سی آزمائش میں ڈال دیا تو اُن کی زبان لٹک کر باہر آ گئی۔ ہر وقت یہ شعر پڑھتے دکھائی دینے لگے۔

کیا یہ نمرود کی خدائی تھی کہ بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

تو وہ جو ہر وقت بندگی اور نیکی کی باتیں کرتے تھے، وہ باتیں اُن کی آزمائش بن گئیں۔ میرے رب نے کہا ذرا دیکھوں تو سہی کہ میرا یہ بندہ اس آزمائش میں کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اُن صاحب کو معلوم نہ ہوسکا کہ یہ شعر بذاتِ خود اُن کے لیے آزمائش بن گیا۔

شعر ہے تو خوب صورت لیکن گہرائی میں اس کے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ صاحب پکڑ میں آ گئے۔ اُن کو میں نے پیغام بھیجا کہ یہ شعر پڑھنا بند کر دو۔ جب انھوں نے اس ہدایت پر عمل کیا تو وہ کم از کم چلنے کے لائق تو ہو گئے۔

پرانے زمانے میں چار دوست اکٹھے سفر کو نکلے۔ شام کو راستے میں جو پہلا گاؤں آیا انھوں نے وہاں پڑاؤ کا ارادہ کیا اور وہاں مسجد میں عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر امام مسجد کو بتایا کہ ہم آپ کے گاؤں میں مہمان ہیں اور رات بسر کرنے کے لیے ٹھکانا چاہیے۔ امام مسجد کے اعلان کے بعد تین مہمانوں کو بستی کے صاحبانِ ثروت نے رضا کارانہ طور پر اپنا مہمان بنا لیا۔ چوتھے مہمان کے لیے ناچار امام صاحب کو ذمہ داری لینا پڑی۔ انھوں نے کہا آپ یہاں ٹھہریے میں گھر جا کر آپ کے لیے کھانا اور بستر بھیجتا ہوں۔ گھر پہنچ کر امام صاحب بھول گئے۔ ادھر مہمان نے کافی دیر تک انتظار کے بعد بالآخر مایوس ہو کر سردی سے بچنے کے لیے صف میں اپنے آپ کو Roll کر لیا۔ صبح باقی تینوں دوست آئے اور پُرلطف مہمان داری کے قصے سنانے کے بعد اپنے اُس چوتھے دوست سے پوچھا کہ تمھاری رات کیسی گزری؟ وہ بولا "دوستو! میرے ساتھ وہی ہوا جو اللہ کے مہمان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ساری رات کا بھوکا ہوں اور جسم بھی سردی سے اکڑا ہوا ہے۔"

تو اللہ کے دوست کے ساتھ شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن اس کے بعد جو کچھ عطا ہوتا ہے اُسے نہ تو تولا جا سکتا ہے اور نہ اُس کی قیمت لگائی جا سکتی ہے اور نہ ہی قدر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سوال: اگر کوئی صاحب کسی شخص کو اپنا مرشد بنانا چاہیں اور مرشد صاحب خاموش رہیں تو اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا نیک شخص کو بھی بیعت کی ضرورت ہوتی ہے؟ اگر مرشد کسی شخص کو بیعت نہ کریں تو کیا اس کا مطلب ہے کہ اس شخص میں کوئی خامی یا کمی ہے؟

جواب: جب کسی صاحبِ علم سے آپ سوال کرتے ہیں تو چونکہ وہ بھی انسان ہے اُس کے اپنے کچھ عقائد اور Concepts ہیں اور یہ چیزیں مل کر اُس کے رویے کو تشکیل دیتی ہیں۔ لہٰذا وہ آپ کے سوال کے جواب میں دو طریقے اختیار کرے گا۔

1۔ آپ کے سوال کی حقیقت شریعت اور علم کی رُو سے کیا ہے؟

2۔ میرے ذاتی خیال میں کیا ہے؟

مرید ہونا نہ تو کوئی شرعی فرض ہے اور نہ ہی علمی فرض۔ مرشد اور مرید کا سلسلہ کہاں سے چلا تھا؟ اس کا آغاز خانقاہی نظام سے ہوا۔ ہمارے ہاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزوں میں رُسوم و رواج اور روایات شامل ہونے کے باعث چیزیں اپنی اصل کھو بیٹھیں۔ پیری مریدی اس کی ایک مثال ہے۔

مرید ہونے کا Concept (تصور) اس لیے سامنے آیا تا کہ ایک شخص اپنے آپ کو Committed (پابند) محسوس کرے کہ میں ایک خاص طریقہ کار کے ذریعے ایک خاص عمل سے گزرنے کے لیے پابند ہوں۔ کوئی بھی خالص انسان اپنی Commitment سے باہر آنے کی کوشش نہیں کرتا۔

مرید ہونے کے پیچھے دوسرا Concept یہ ہے کہ مرید یہ محسوس کرے کہ میں اس شخص (مرشد) کی بات ماننے کا پابند ہوں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مرید ایک خاص راہ پر چل نکلے گا۔

اگلے وقتوں میں اسی طرح مرشد جب کسی کو اپنا مرید بناتا تو وہ یہ ذمہ داری محسوس کرتا کہ اس شخص (مرید) کی دینی، رُوحانی اور اخلاقی تربیت اب میرے ذمہ ہے۔ یوں مرشد اپنی دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ یہ ڈیوٹی بھی سرانجام دیتا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا پیری مریدی ایک رسمی سی چیز بن کر رہ گی جس کی نہ تو مرشد اور نہ ہی مرید کے لیے زیادہ اہمیت رہی۔

موجودہ دور میں صورت حال یہ ہے کہ مرید پر تو فرض ہے کہ وہ مرشد کی بات مانے اور اُن کی خدمت کرے۔ خود محنت سے کمائے اور مرشد کے حضور نذرانہ پیش کردے۔ لیکن مرشد پر کوئی فرض نہیں۔ ایسے میں کسی کا مرید ہو جانے سے آپ کو کیا فائدہ ملے گا؟ دراصل روایات اور قصے کہانیاں پڑھتے پڑھتے ہم یہ سمجھنے لگے کہ مرشد سے بیعت ہونے کی صورت میں وہ ہم پر نظر رکھیں گے اور ہماری حفاظت کریں گے۔ یہ سب غلط فہمی اور جھوٹ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی کسی کی حفاظت نہیں کرسکتا۔

آپ کسی شخص سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ آپ کو مرید کرے۔ اگر وہ شخص مخلص اور Dutiful (فرض شناس) ہے تو وہ سوچے گا کہ مرشد اور شاگرد کے رشتہ کی اصل ذمہ داری دینی، اخلاقی اور رُوحانی تربیت ہے۔ پھر وہ اپنے آپ سے پوچھے گا کہ کیا میرے اندر ایسی گنجائش موجود ہے۔ اگر جواب مثبت آئے گا تو وہ خاموشی سے آپ کو بیعت کرلے گا۔

اگرچہ روایتی طریقہ بیعت تو ہاتھ والا ہے لیکن کچھ لوگوں کا طریقہ وہ بھی ہے جو میرے مرشد صاحب کا تھا کہ اُن کے پاس کوئی آیا تو کہا "میاں! سامان وہاں رکھو اور آجایا کرو جب ہم گفتگو کرتے ہیں۔" یوں وہ شخص گویا بیعت ہو جایا کرتا اور اُس کی تربیت کی ذمہ داری مرشد صاحب قبول کر لیتے۔ خدانخواستہ یہاں غیر مسلم کو مسلمان کرنے والی تو بات ہے نہیں۔ اگر مرشد صاحب نے آپ کو اپنا شاگرد تسلیم کرلیا تو سمجھ لیجیے کہ تربیت کا آغاز ہوگیا۔ لیکن اگر انھوں نے آپ کی بیعت کی درخواست یا سوال پر ایسا نہیں کیا بلکہ مندرجہ ذیل دو طریقوں میں سے کوئی طریقہ یا انداز اپنایا تو آپ کو بُرا نہیں ماننا چاہیے۔

1۔ اگر تو مرشد صاحب بامروّت ہیں تو آپ کے اس سوال کے جواب میں وہ خاموش رہیں گے یا مسکرا دیں گے۔

2۔ اگر وہ Rough (خشک مزاج) آدمی ہیں تو سیدھے دوٹوک الفاظ میں کہیں گے کہ میں آپ کو اپنا مرید نہیں کرسکتا۔

اب جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا نیک شخص کو بھی مرشد کی ضرورت ہوتی ہے؟ تو عرض ہے کہ بہت سے ایسے اولیائے کرام ہیں جو پہلے سے صاحب بیعت تھے لیکن علم کے حصول کے لیے انھیں کسی دوسرے اُستاد کے پاس بھیج دیا جاتا کیوں کہ علم کی حد تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ حضرت بایزید بسطامی ؒ نے ایک سو سے زائد اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ علم کی ضرورت تو ہر شخص کو ہمیشہ رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کو بیعت نہیں کرتا تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آپ میں کوئی خرابی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ آپ کا حصہ اُس سلسلے میں نہ ہو بلکہ کسی دوسرے سلسلہ میں ہو۔

جب میری پشاور میں Posting تھی تو اکثر راستے میں اسلام آباد آتے ہوئے میری خواہش ہوتی کہ پیر مہر علی شاہ کی خدمت میں گولڑہ شریف جا کر سلام عرض کروں۔ لیکن حیرت انگیز طور پر جب بھی میں نے ایسا ارادہ کیا اور گولڑہ شریف کی طرف Turn لینا چاہا تو ناقابلِ یقین انداز میں میرا رُخ موڑ دیا جاتا۔ چار بار ایسا ہونے کے بعد بالآخر میں نے گولڑہ شریف جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ایک بار اپنے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب کے ساتھ جب میں اُسی راستے پر سفر کر رہا تھا تو اُن سے میں نے یہ سارا قصہ بیان کیا کہ پہلی بار جیسے ہی میں نے گولڑہ شریف کی طرف ٹرن (Turn) لینا چاہا تو بالکل اچانک ایک گاڑی آئی اور اُس نے میری گاڑی کا Front left side fender رگڑ دیا۔ حیرت در پریشانی میں ڈوبے اُس گاڑی کے ڈرائیور کا کہنا تھا کہ آپ کی گاڑی تو سڑک پر کہیں تھی ہی نہیں۔

مہینہ دو مہینہ بعد بالکل نئی گاڑی میں پشاور گیا۔ راستہ میں گولڑہ شریف جانے کا ارادہ کیا۔ اُسی موڑ پر پہنچ کر میری نئی گاڑی کا اگلا دروازہ بالکل اچانک اُتر کر سڑک پر جا گرا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دروازے پر کہیں معمولی سی خراش تک نہ تھی۔ یوں میں گولڑہ شریف جانے کی بجائے راولپنڈی روانہ ہو گیا تاکہ کسی ورکشاپ سے گاڑی Repair کروا سکوں۔ اسی طرح کے واقعات دو بار مزید پیش آئے۔ مرشد صاحب نے یہ سارا قصہ سننے کے بعد فرمایا کہ اصل میں آپ کا حصہ ہے تو سلسلہ چشتیہ میں لیکن اس کی دو branches (شاخیں) ہیں۔ سلسلہ چشتیہ کے بانی حضرت خواجہ غریب نواز صاحب کے دو خلیفہ ہیں۔ اوّل حضرت قطب الدین بختیار کاکی ؒ اور خلیفہ دوم حضرت پیر مہر علی شاہ ؒ۔ چونکہ آپ کا حصہ خلیفہ اوّل حضرت قطب الدین بختیار کاکی ؒ صاحب کے پاس تھا اس لیے اگر آپ سلام کرنے خلیفۂ دوم پیر مہر علی شاہ صاحب کے پاس گولڑہ شریف پہنچ جاتے تو آپ کے لیے وہاں کشش بڑھ جاتی اور آپ وہیں کے ہو کر رہ جاتے۔ اس لیے پیر مہر علی شاہ صاحب نے ازراہِ مہربانی آپ کو اُس وقت تک اپنے پاس نہیں آنے دیا جب تک کہ خلیفۂ اوّل قطب الدین بختیار کاکی ؒ سے آپ کو آپ کا حصہ نہیں مل گیا۔

جب اگر میں یہ سوچتا کہ جانے مجھ میں کیا خامی اور کمی ہے کہ ہر بار مجھے حاضری اور سلام کرنے سے روک دیا جاتا ہے تو یہ مناسب نہ ہوتا کیونکہ اصل بات تو کچھ اور تھی۔ لہٰذا آپ بھی جب ان باتوں کو سمجھ جائیں گے تو دل مطمئن ہو جائے گا۔

سوال: صدقہ کی اہمیت اور حقیقت کیا ہے؟ کیا آپ ﷺ کے نام پر بھی صدقہ دیا جا سکتا ہے؟

جواب: صدقہ خیرات ہی کی ایک شکل ہے۔ صدقہ ردِ بلا کہلاتا ہے۔ اس سے مصیبتیں اور بلائیں دُور ہوتی ہیں۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے "غربت اور مصیبت کا مقابلہ صدقہ وخیرات سے کرو۔" صدقہ وخیرات کرنے سے نہ صرف بلائیں اور مصیبتیں ٹلتی ہیں بلکہ غربت بھی دُور ہوتی ہے۔ یہ تو صدقہ کی اہمیت اور حقیقت ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا آپ ﷺ کا صدقہ دیا جا سکتا ہے؟ اگر ہم اس نیت سے کوئی چیز خیرات کر دیں کہ یہ آپ ﷺ کا صدقہ ہے تو یہ درست۔ لیکن اس سلسلے میں بس احتیاط رکھیے کہ زکوٰۃ، صدقات، خیرات کسی سیّد کو نہ دیجیے۔

سوال: مزار پر جانے کے آداب کیا ہیں؟ کیا صاحبِ مزار زائرین کے بارے میں جانتا ہے؟ مزار پر جا کر کس طرح دُعا مانگیں؟

جواب: مزار پر جانے کے آداب یہ ہیں کہ وہاں باوضو جائیں۔ خاموش رہیں۔ باادب رہیں۔ مسنون طریقے سے فاتحہ پڑھیں۔ ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب صاحبِ مزار کی رُوح کو بخش دیجیے۔ اگر جگہ بنی ہو تو خانہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے قرآن پاک کی تلاوت کیجیے اور بعد میں دُعا مانگیں کہ یا اللہ پاک اس تلاوت کلام پاک کا ثواب ان صاحبِ مزار کی رُوح کو بخش دے۔ رہ گئی بات کہ دُعا کس طرح مانگنی چاہیے۔

"یا باری تعالیٰ! تو اپنے رحیم وکریم ہونے کے صدقے، اپنے نبی کریم ﷺ اور دیگر پیغمبروں کے صدقے اور ان صاحبِ مزار جو تیرے نیک بندے تھے، کے صدقے، ہم پر رحم فرما۔"

جو کلام پاک آپ وہاں تلاوت کریں۔ اس کے بعد دعا کریں:

> "یا اللہ! میں نے ابھی تیرا جو کلام تلاوت کیا، وہ میں تیرے اور تیرے حبیب ﷺ کے حضور بطور نذرانہ پیش کرتا ہوں تو اسے قبول فرما کر اس کا ثواب آپ ﷺ کی روحِ مبارک کو پہنچا دے اور تو اس کا ثواب تمام وفات پا جانے والی رُوحوں کو اور بالخصوص اس صاحبِ مزار کی رُوح کو بخش دے۔"

رب تعالیٰ بہت سخی اور فیاض ہے۔ وہ اپنی تلاوت کے صدقہ، جس جس کا ہم نے نام لیا ہے سب کی رُوحوں کے نامۂ اعمال میں ثواب لکھ دیتا ہے۔ اللہ ثواب کو تقسیم نہیں کرتا بلکہ سب رُوحوں کو اس کلام پاک کا

برابر ثواب عطا کرتا ہے۔ نامۂ اعمال میں ثواب کے اس اضافے کے ساتھ ہی متعلقہ رُوح کو بتا دیا جاتا ہے کہ فلاں صاحب کی وجہ سے تمھارے نامۂ اعمال میں یہ ثواب لکھا گیا ہے۔ تب وہ رُوح خوش ہو جاتی ہے کیوں کہ وفات کے بعد وہ اپنے نامۂ اعمال میں ثواب میں اضافہ پر قادر نہیں رہی۔ لہٰذا خوش ہو کر جواباً وہ ہمارے لیے دعا کرتی ہے "یا اللہ! جس شخص نے میرے نامۂ اعمال میں یہ ثواب لکھوایا ہے تو بھی اُس پر رحم فرما۔"

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا صاحب قبر زائر کے بارے میں جانتا ہے؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ صاحب قبر کی رُوح کا تعلق اپنی قبر سے قائم رہتا ہے لیکن یہ تعلق ہر وقت قائم نہیں رہتا۔ اسی لیے ہمیں حکم ہے کہ جب قبرستان کے قریب سے گزرو تو سلام کے ساتھ وعلیکم السلام بھی خود ہی کہو۔ لہٰذا اگر رُوح اُس وقت مزار میں موجود ہوئی تو اُسے زائرین کے بارے میں پتا چل جائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہ کیسے پتا چلے کہ رُوح وہاں موجود ہے یا نہیں؟ تو یہ جاننے کے لیے آپ کو کشف القبور حاصل ہونا ضروری ہے جس کے حصول کے لیے لمبا راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ وہ راستہ جو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان سے ہو کے آتا ہے اور چکی کے دو پاٹوں میں سے گزرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے۔

علم کے موتی

سوال: کیا وہ تحفہ جو کسی نے ہمیں دیا ہو، ہم اپنی پسندیدہ شخصیت کو دے سکتے ہیں؟

جواب: جب کوئی شخص ہمیں تحفہ پیش کرتا ہے تو وہ تحفہ قبول کرتے ہی ہماری ملکیت ہو جاتا ہے۔ اب ہماری مرضی کہ ہم وہ تحفہ اپنے پاس رکھیں یا آگے پیش کر دیں۔ لیکن اس سے تحفہ دینے والے کی دل آزاری کا احتمال رہتا ہے۔ لیکن آپ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ جو کچھ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا جاتا آپ ﷺ وہ سب دوسروں کو دے دیتے اور جھولی خالی کر کے اُٹھتے۔ لہٰذا میرے خیال میں سنت کی پاس داری زیادہ ضروری اور اہم ہے۔

سوال: مجھے ایک چادر دربار بی بی پاک دامن سے عطا ہوئی ہے۔ کیا یہ چادر حضرت خواجہ غریب نواز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر عقیدت ومحبت سے پیش کی جاسکتی ہے؟

جواب: یہ معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اس قسم کے تحفے تحائف جو پہلے کہیں اور استعمال ہو چکے ہوں، کسی دوسرے دربار پر نہ دیئے جائیں۔ چونکہ یہ چادر پہلے حضرت بی بی پاک دامن کے دربار پر ڈالی جاچکی ہے لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ خواجہ غریب نواز صاحب کے مزار پر وہ چادر چڑھائی جائے۔ بہتر یہی ہے کہ اس مقصد کے لیے نئی چادر خرید لی جائے۔

سوال: مزارات پر ملنے والی چادروں کے بارے میں اہلِ طریقت اور آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: وہ چادریں عموماً اُس دربار کے گدی نشین یا سجادہ نشین ازراہِ محبت دے دیتے ہیں۔ اگر یہ چادریں ہم اپنی عزیز ہستی کو بطور تحفہ دے دیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

سوال: لیلۃ القدر میں نوافل پڑھنے چاہئیں یا پہلے قضا نمازیں ادا کرنی چاہئیں؟ کس کی افادیت زیادہ ہے؟

جواب: قضا نمازیں پہلے ادا کی جانی چاہئیں۔ لہٰذا لیلۃ القدر میں قضا فرض نمازیں ہی ادا کرلیں تو اس کا کئی گنا اجر وثواب مل جائے گا۔

سوال: ایک Booklet میں بڑے شاہ صاحب کا زلزلہ پر ڈیوٹی والا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ ڈیوٹی کس طرح کی تھی؟ زلزلہ تو پھر بھی آ گیا تھا۔

جواب: ڈیوٹی تو میں پورے طریقے سے شاید بیان نہ کر سکوں۔ جو لوگ رُوحانی ڈیوٹی پر فائز ہوتے ہیں اُن کے ذمہ یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں کسی ڈیوٹی پر مامور کرے اور وہ اُس کام کو روک دیں۔ ولی اللہ تو کیا پیغمبر بھی اُس کام کو روک نہیں پائے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ہمارے سامنے ہے۔

رب تعالیٰ جو کام کر رہا ہوتا ہے ان معاملات میں Facilitate کرنے کے لیے ڈیوٹی لگا دی جاتی ہے۔ بڑے شاہ صاحب کی ڈیوٹی بھی وہی تھی۔ یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ Warning کے طور پر بھیجے گئے ایک سیلاب پر ولی اللہ کی ڈیوٹی لگائے اور وہ ولی اللہ اُس سیلاب کو روک دے۔ معاذ اللہ! یہ تو اللہ کے کاموں میں رخنہ ڈالنے والی بات ہے اور یہ کس کی مجال ہے کہ اللہ کے کاموں میں رخنہ ڈال سکے۔

سوال: ہم پاکستان کے روشن مستقبل کی باتیں اخبارات اور لیکچرز میں پڑھتے ہیں۔ یہود و ہنود بھی تو اپنی سفلی توانائیاں استعمال کرتے ہوں گے۔ آپ کی Predictions کو Counter کرنے کے لیے اقدامات اُٹھاتے ہوں گے کیوں کہ یہودی تو کالے علم میں ماہر ہیں۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان کے بارے میں جو کچھ عرض کرتا ہوں وہ پیش گوئی نہیں کیوں کہ پیش گوئی سختی سے منع ہے۔ اللہ کی رحمت پر بھروسا کرتے ہوئے کسی کو یہ دلاسا دینا کہ تم پریشان نہ ہو اللہ رحمت کرنے والا ہے۔ انشاء اللہ کچھ ہی عرصہ بعد تمھارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ یہ پیش گوئی نہیں بلکہ کسی کو اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے سے بچایا جا رہا ہے۔

یاد رکھیے! پاکستان کے حوالے سے میری گفتگو پیش گوئیاں قطعاً نہیں ہیں۔ صرف یہ ہے کہ چونکہ ہم لوگ مایوسی کے عالم میں ہیں اس لیے اگر قوم کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا یقین دلایا جائے اور اُس کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ اللہ ہمارا خالق ہے۔ وہ جانتا ہے ہم کس قدر تکلیف میں ہیں۔ وہ ہم سے آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھے گا۔ وہ ہم پر رحم فرمائے گا اور ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ یہ بات پیش گوئی کے زمرے میں نہیں آئے گی۔

رہ گئی اُن کی بات جو پاکستان کے مخالف ہیں۔ عرض یہ ہے کہ میرے خیال میں پاکستان کا کوئی بھی مخالف نہیں سوائے ہمارے اپنے۔ ہم پاکستان کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں وہ کسی دشمن سے کم نہیں ہے۔ جن لوگوں نے ساٹھ اور ستر کی دہائی کا زمانہ دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہی ملک تھا اور یہی یہود و ہنود کہ جب 99% ملکوں کے لیے پاکستانیوں پر ویزا کی ذمہ داری نہیں تھی۔ ہمارے یہاں سے جانے والے Students کو لمبے چوڑے وظائف کے حصول میں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ان ملکوں میں پاکستانیوں کو اُن کے شہریوں کے برابر سہولتیں بہت آسانی سے مل جایا کرتی تھیں۔ لیکن گزرتے وقت میں اس

قدر تبدیلی آگئی کہ دُنیا میں اب شاید ہی کوئی ملک ہوگا جو خوشی سے ہمیں ویزا دے دیتا ہو۔ اگر یہود و ہنود ہمیں شروع ہی سے بُرا سمجھتے تو اُن کا رویہ شروع میں بھی ناروا ہوتا۔

جہاں تک پاکستان کی مخالفت اور نقصان کا تعلق ہے تو جس طرح اپنے معاشرے میں ہم اُن لوگوں کو ہیرو سمجھتے ہیں جو پاکستان کے دفاع کے لیے جنگیں لڑتے ہیں اور ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جو پاکستان کے مفاد میں بہتر ہوں۔ جس طرح ایسے اقدامات کرنا ہم اپنا حق سمجھتے ہیں اسی طرح دیگر ممالک کا بھی حق ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لیے کام کریں۔ میں یہ بات یہود و ہنود کی Favour میں نہیں کہہ رہا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ مومن ہمیشہ Rational ہوتا ہے۔ اُس میں فراست اور اعتدال ہوتا ہے۔ وہ کسی پر بھی فتویٰ صادر کرنے سے پہلے Rational ہو کے سوچتا ہے کہ اُس نے میرے خلاف یہ کام آخر کیوں کیا؟ یہی وجہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرایا گیا ہے۔ اگر انسان کسی بھی شخص کی بُری حرکت پر حکم لگانے سے پہلے اُس کے Rational پر غور کرے کہ اُس شخص نے مجھے گالی کیوں دی یا میری توہین کیوں کی اور اُس کو بُرا بھلا کہنے سے پہلے اگر ہم سوچ لیں کہ اُس کے اس سلوک کا اصل سبب کیا تھا تو اس کی بنیادی وجہ جاننے کے بعد ہو سکتا ہے کہ ہمارا رویہ ہمدردانہ ہو جائے اور ہمیں اپنی غلطی اور کوتاہی کا اندازہ ہو جائے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ ایسے رویہ کا مظاہرہ کر کے اپنے مخالف کو Favour کر رہے ہوتے ہیں بلکہ درحقیقت ہم اُس فہم و فراست سے کام لے رہے ہوتے ہیں جو اللہ نے ہمیں عطا کی ہے۔ جب ہم چیزوں کو اس زاویہ نظر اور انداز سے دیکھیں گے تو ہمارے رویے درست ہو جائیں گے۔

Academically speaking جس طرح ہم اپنے ملک کی سلامتی کے لیے دُعا کرتے اور اس کی بہتری کے لیے کام کرتے ہیں اسی طرح دیگر ممالک کے لوگ جو مختلف علوم کے ماہر ہیں وہ اپنے وطن کے لیے کام کرتے ہیں (میں ذاتی طور پر خود وہ ایسے قصوں سے گزرا ہوں) اور ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم حق پر ہیں اور ہمارا رب سب سے طاقت ور ہے تو ہم کیوں اُن سفلی توانائیوں سے خوفزدہ ہوں۔ جب مجھے یقین ہے کہ میرا رب طاقت ور ہے۔ اُس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا تو پھر کوئی کالے جادو اور سفلی عملیات کا کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو میں خوفزدہ نہیں ہوں گا کیوں کہ مجھے اپنا رب سب سے زیادہ طاقت ور نظر آتا ہے۔

سوال: ستر ہزار کے قریب دوسرے عالم اور جہاں ہیں۔ آپ ﷺ رحمۃ اللعالمین ہیں۔ کیا دیگر جہانوں کے لیے بھی آپ ﷺ سراپا رحمت ہیں؟

جواب: پہلے تو تعداد درست کر دوں۔ یہ 70,000 جہاں اور 20,000 عالم ہیں۔ کچھ پر مخلوق بھی ہے۔ جہاں تک آپ ﷺ کا تعلق ہے، آپ ﷺ پوری کائنات کے لیے رحمت ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ کے نام کے ساتھ رحمتہ اللعالمین آتا ہے کیوں کہ آپ ﷺ تمام عالمین کے لیے باعث رحمت ہیں۔ آپ ﷺ صرف انسانوں کے لیے ہی رحمت نہیں بلکہ تمام جان دار و بے جان چیزوں کے لیے بھی مجسم رحمت ہیں۔

آپ ﷺ کا تصرف زمین کی گہرائیوں سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک ہے۔ آپ ﷺ کی رحمت جو اللہ کی عطا کردہ ہے وہ تمام مخلوق کا احاطہ کرتی ہے۔ خواہ وہ مخلوق کسی بھی عالم میں بستی ہے۔ آپ ﷺ کا پیغام بھی تمام عالمین کی مخلوق کے لیے ہے۔

سوال: ہم سورۂ فاتحہ و اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب تمام انبیا کرام، ازواج مطہرات، صحابہ کرام، صدیقین، شہدا اور اولیائے کرام کو بخشتے ہیں۔ کیا ثواب کی مقدار اتنی ہوتی ہے کہ تمام احباب میں برابر تقسیم ہو سکے۔ ثواب کا Measuring Unit کیا ہے؟

جواب: سورۂ فاتحہ و اخلاص ہو یا رب تعالیٰ کا کوئی بھی کلام، اس کا ثواب تو کسی کے علم میں نہیں۔ اسی طرح ثواب کا Measuring Unit بھی کسی ذی جان کے احاطۂ علم میں نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہم جانتے ہیں کہ جو کلام پاک ہم تلاوت کرتے ہیں اس کا ثواب اللہ تعالیٰ ہمیں عطا فرما دیتا ہے۔

اب رہ گئی بات ایصال ثواب کی جو ہم انبیا کرام، ازواج مطہرات، صحابہ کرام، شہدا، صدیقین اور اولیائے کرام کی ارواح کو کرتے ہیں۔ جب ہم ان سب کی رُوحوں کو ثواب بخشتے ہیں۔ رب تعالیٰ چونکہ رحمٰن و رحیم ہے لہٰذا وہ اس کا ثواب جتنا کسی ایک شخص کو دیتا ہے اُتنا ہی ثواب تمام انبیا کرام، ازواج مطہرات، صحابہ کرام، شہدا اور اولیاء کو فرداً فرداً دیتا چلا جاتا ہے۔ یہ اللہ کی رحمانیت اور شانِ کریمی ہے کہ وہ سب کو برابر ثواب دیتا ہے۔ اس لیے وہ ثواب نہ کبھی کم پڑتا ہے نہ ختم ہوتا ہے۔

سوال: روزہ رکھنے سے انسان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: جہاں اللہ تعالیٰ نے روزے کا ذکر کیا وہاں روزہ سے پیدا ہونے والے اثرات کا بھی ذکر کیا کہ جب ہم روزہ رکھتے ہیں تو اس سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

> ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلی اُمتوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔'' (سورۂ البقرہ:183)

جس طرح اللہ نے نماز کی ادائیگی کی تلقین جگہ جگہ کی ہے اُسی طرح روزہ رکھنے کا بھی حکم دیا ہے۔ جب نماز قائم کرنے کو کہا گیا تو یہ بھی بتایا کہ نماز اس لیے ضروری ہے کیوں کہ وہ بُرائیوں سے ہمیں بچالیتی ہے۔ اسی طرح روزہ کی فرضیت کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس سے ہم میں تبدیلی کیا آئے گی اور اس کا Benefit ہمیں کیا ملے گا؟

روزہ کا براہِ راست فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان متقی ہو جاتا ہے۔ تقویٰ ہے کیا؟ قرآن پاک میں تقویٰ کی تعریف یوں بیان فرمائی گئی

> ''بلاشبہ اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی اور رشتہ داروں کو دینے کا اور منع فرماتا ہے

بے حیائی اور بُری بات اور سرکشی سے۔ تمہیں نصیحت فرماتا ہے کہ دھیان کرو۔"

(سورۃ النحل:90)

یوں اللہ تعالیٰ کے فرمان کو Quote کر کے آپ ﷺ نے تقویٰ کی فضیلت بیان فرمائی۔ اب اس میں عدل واحسان اور قرابت داروں کو دینے کی تلقین کی گئی ہے۔

ہم اکثر اس چیز میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ صاحب میں تو تمام معاملات میں انصاف سے کام لیتا ہوں۔ عرض یہ ہے کہ یہ بات مسلمانوں کے لیے کچھ زیادہ باعث فخر نہیں ہے کہ ہم عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ عدل وانصاف سے کام لینا کوئی بُری بات ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ Minimum standard یا Starting point ہے مسلمان کے لیے کہ وہ انصاف سے کام لیتا ہے۔ اگر وہ انصاف کی بجائے ایثار سے کام لے اور اگر اللہ اُسے توفیق دے تو وہ اس درجہ پر پہنچ جائے کہ اپنے حقوق کی قربانی دے دے۔ یہ چیز اللہ کو بے حد پسند ہے اور اس کا بے پناہ اجر ہے۔

اگر مسلمان یہ چاہتا ہے کہ میرا رب مجھ سے راضی ہو جائے تو پھر اُسے اس Minimum standard سے اُوپر اُٹھنا ہوگا اور وہ یہی ہے کہ وہ انصاف سے بلند ہو کر ایثار و قربانی سے کام لینے لگے۔ وہ دوسروں کے لیے اپنے آرام اور ضروریات کو پس پشت ڈال دے۔ ایسا شخص رب تعالیٰ کو راضی کر لے گا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق تقویٰ یہی ہے کہ ہم عدل واحسان سے کام لیں اور قرابت داروں کو دیں۔ قرابت داروں کو دینے کا معاملہ عموماً ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ قرابت دار لفظ "قرب" سے نکلا ہے۔ اور قرب "قریب" سے ہے۔ قریب تو ہمارے بہت سے لوگ ہو جائیں گے جس میں ہمارے رشتہ دار، عزیز واحباب سب شامل ہیں۔ ان سب کو درجہ بدرجہ Look after کیا جانا چاہیے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو عموماً کہتے ہیں کہ صاحب میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔ میں کسی کو کیا دوں گا۔ یاد رکھیے! اگر ہم کسی کے ساتھ اپنی خوش حالی نہیں بانٹ سکتے کیوں کہ ہم خوش حال نہیں ہیں تو کم از کم اپنی بھوک تو کسی کے ساتھ بانٹ سکتے ہیں۔ اگر میری دو روٹی کی بھوک ہے اور مجھے آدھی میسر آگئی۔ تو وہ آدھی روٹی بھی میں کسی دوسرے بھوکے کے ساتھ بانٹ کر اُس کی بھوک تو Share کر سکتا ہوں۔ اللہ کو ایسا شخص بہت پسند ہے جو ہمیشہ دوسروں کو کچھ نہ کچھ دیتا رہے اور اپنے وسائل میں دوسروں کو شریک کرتا رہے۔

اس فرمان میں رب تعالیٰ نے تین چیزوں سے روکا ہے۔

1۔ بے حیائی

2۔ نامعقول باتیں کرنا

3۔ حد سے بڑھ جانا یا سرکشی

ہم میں سے اکثر لوگ قرآنی آیت کا حوالہ دینے کے بعد کہتے ہیں کہ اللہ نے بدلہ لینے کی اجازت دی ہے

لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ اسی آیت کے اگلے الفاظ میں اللہ نے بہت Stress کے ساتھ فرمایا۔

''اگر تم معاف کر دو تو اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

''اور چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم اُسے دوست نہیں رکھتے کہ اللہ تمہاری بخشش کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔'' (سورۃ النور: 22)

''غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے نیک لوگ اللہ کے محبوب ہیں۔'' (سورۃ آل عمران: 134)

اب یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم اُس قدر بدلہ لے لیں جس قدر ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے یا پھر سوچ لیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو معاف فرما دیتا ہے اس لیے ہم بھی دوسروں کو معاف کر کے اللہ کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہو جائیں۔

تقویٰ کی تعریف حضرت ابن عمرؓ نے یوں کی۔

''تقویٰ یہ ہے کہ ہم ہر شخص کو اپنے سے بہتر جانیں۔''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

''تقویٰ کی تعریف یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس پر تمہاری نظر پڑے اُسے تم اپنے آپ سے بہتر گردانو۔''

حضرت عمرؓ نے حضرت کعب الاحبارؓ سے تقویٰ کے بارے میں دریافت فرمایا تو اُنھوں نے پوچھا ''کیا آپ کبھی خاردار جھاڑیوں والے راستے سے گزرے ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا ''جی ہاں۔'' حضرت کعبؓ نے پوچھا ''آپ ان جھاڑیوں سے کیسے گزرتے ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے فرمایا ''اپنے کپڑے سمیٹ کر تاکہ کہیں کوئی کانٹا چبھ نہ جائے۔'' تب حضرت کعب الاحبارؓ نے فرمایا ''یہی تقویٰ ہے کہ دُنیا کے پُرخار جنگل سے اس طرح گزرا جائے کہ کہیں ہمارا دامن ان کانٹوں میں اُلجھ نہ جائے۔''

ایک اور جید شخصیت اور نہایت متقی انسان حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں۔

''تقویٰ یہ نہیں کہ تم دن کو روزے رکھو اور رات کو نماز پڑھو اور ان میں کوئی گڑبڑ نہ ہونے دو بلکہ تقویٰ یہ ہے کہ جن چیزوں سے اللہ نے منع کیا ہے تم اُن سے منع ہو جاؤ۔ اور جن چیزوں کا حکم دیا ہے، وہ تم کرو۔''

اب یہاں نماز و روزہ کو Condemn نہیں کیا گیا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب ہم اللہ کے حکم کردہ تمام کام کرتے ہیں اور منع کردہ تمام باتوں سے رُک جاتے ہیں تو نماز، روزہ، شب بیداری سب اسی حکم کے تحت آجاتے ہیں۔

طلب بن حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے تقویٰ کی بہت خوب صورت وضاحت فرمائی۔

''تقویٰ نور ہے۔ ایک روشنی ہے اللہ کی عطا کردہ۔ اللہ کی اس پھیلائی ہوئی روشنی میں ثواب کی اُمید پر اللہ

سے شرم کرتے ہوئے جب ہم زندگی گزارتے ہیں اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں تو یہ تقویٰ ہے۔''

ماہِ رمضان میں صرف روزہ نہ رکھا جائے۔ جیسا کہ میں نماز کے سلسلے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ صرف نماز پڑھنا ہی کافی نہیں بلکہ اس بات پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ کیا ہم حقیقتاً نماز قائم کر رہے ہیں۔ نماز پڑھنا اور بات ہے۔ نماز قائم کرنا آگے کی بات ہے۔ جب ہم نماز کی تمام شرائط، آداب اور سنتیں پوری کرتے ہیں اور پھر اس کے نتیجے پر بھی نظر رکھتے ہیں کہ کیا ہم اس نماز کے نتیجہ میں بُرائیوں سے بچ گئے۔ اگر ایسا ہو تو سمجھ لیجیے کہ نماز قائم ہو رہی ہے۔

اسی طرح روزہ ہم یوں رکھیں کہ وہ ہمارے اندر تقویٰ پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔ ہم ہر وہ کام کریں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ہر اُس کام سے منع ہو جائیں جس سے اللہ نے روکا ہے۔

نفس اکثر ہمیں بہکاتا ہے اور یوں ہماری ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ لہٰذا اللہ کے احکامات اور قائم کردہ معیار پر عمل پیرا ہونے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کی نقل کرنا شروع کر دیں۔ بحالت روزہ آپ ﷺ کا معمول کیا تھا۔ ہم آنکھیں بند کر کے اس یقین کے ساتھ آپ ﷺ کے اُس معمول کو اپنا لیں کہ آپ ﷺ کا کوئی عمل شریعت کے منافی نہیں اور آپ ﷺ کی زندگی عملی قرآن ہے۔

جب ہم آپ ﷺ کی سنت کو نقل کر لیں گے تو ہماری زندگی سو فی صد قرآن پاک کے مطابق ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو جائے گا۔

قناعت، توکل، تقویٰ اور روزہ ... رُوحانیت کی نظر میں

قناعت، توکل، تقویٰ اور روزہ..... یہ بہت اعلیٰ چیزیں ہیں۔ ان کا بہت ثواب اور فوائد ہیں۔ رُوحانیت میں قناعت، توکل، تقویٰ اور روزہ کو دو طریقوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک تو وہ فوائد ہیں جن کا بیان اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔ دوسرے وہ فوائد ہیں جنہیں کلی طور پر رُوحانیت کے نقطۂ نظر سے لیا جاتا ہے۔

جس طرح دوسرے علوم میں صدیوں سے رائج Practices ہیں اور ان Practices سے حاصل شدہ نتائج سے مزید نتائج حاصل کیے گئے اور اُس ریسرچ سے حاصل ہونے والے نتائج کو قواعد کی شکل دے دی گئی۔ بزنس، اکاؤنٹس، سیلز، Financial Management سب کے قواعد موجود ہیں۔ اسی طرح سائنس میں Testing of material, strength of material، Action اور Reaction وغیرہ جیسے قواعد و قوانین ہیں۔ یہ سب چیزیں صدیوں کے تجربات پر محیط ہیں اور اُن تجربات سے حاصل ہونے والے عمومی نتیجہ کو قواعد کی شکل دے دی گئی۔ اسی طرح رُوحانیت میں بھی صدیوں سے جو Practices چلی آرہی ہیں ان Practices سے ملنے والے ثمرات کو ایک اُصول اور قاعدہ کی شکل دے دی گئی ہے۔

قناعت (ہم سب جانتے ہیں) کیا ہے؟

رُوحانیت میں قناعت ایک قندیل کی مانند ہے۔ ایسی قندیل جس سے انسان کے باطن میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ قناعت ایک ایسا حربہ ہے۔ جس سے انسان کے اندر شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے وہ حرص و لالچ جیسی بُرائیوں سے بڑی آسانی سے لڑ لیتا ہے۔ رُوحانیت میں جس طرح کینہ، بغض اور حسد زہر قاتل ہیں اسی طرح حرص و طمع اور لالچ انسان کو عرش سے زمین پر لے آتے ہیں۔ رُوحانیت کبھی پھل پھول نہیں سکتی جب تک کسی بھی شخص کے دل میں حرص، طمع اور لالچ موجود ہو۔

قناعت وہ ہتھیار ہے۔ جس کے ذریعہ ہم حرص و طمع اور لالچ سے لڑ لیتے ہیں۔ یہ رُوحانی توجیہہ ہے۔ اس لیے تمام فقیر قناعت پسند ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی فقیر کسی کے ہاتھ، جیب اور محلات کی طرف نہیں دیکھتا۔ وہ اپنی ذات میں مگن ہوتا ہے۔ اُسے کوئی دُنیاوی چیز بھاتی نہیں کیوں کہ وہ اپنے اندر سے لڑ کر ایسی تمام خواہشات ختم کر چکا ہوتا ہے جن سے لالچ پیدا ہو۔ قناعت ضمیر کو روشن کر دیتی ہے۔ جس شخص نے قناعت کر لی اُسے کسی چیز

کی حاجت نہ رہی اور پھر اُسے کسی تدبیر کی بھی حاجت نہیں رہتی۔ وہ تدبیر سے دُور ہو جاتا ہے۔ جو کچھ رب تعالیٰ نے اُسے عطا کر دیا، اُسے مقدر سمجھ کرلے لیا اور اُسی میں زندہ رہا۔

ایک ''قناعت'' رُوحانیت میں کئی فائدے دے جائے گی۔ اس سے ایک تو ہمارا باطن اور ضمیر روشن ہو جاتا ہے، ہمیں کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی اور پھر ہم تدبیر حاجت سے دُور ہو جاتے ہیں۔ طمع و لالچ ہمارے دل سے جاتا رہتا ہے اور جب لالچ چلا گیا تو حسد خود بخود ختم ہو گیا۔

رُوحانیت میں تقویٰ کیا فائدہ پہنچاتا ہے اس کا عموماً کہیں ذکر نہیں ملتا۔ جس شخص نے تقویٰ کر لیا اُس کا ظاہر و باطن ڈھل گیا۔

تقویٰ کی مختصر ترین تعریف یہ ہے کہ ''انسان اُن تمام چیزوں سے دُور ہو جائے جن سے رب تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور وہ تمام کام کرے جن کو کرنے کا رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔''

جس شخص نے تقویٰ اختیار کر لیا اُس کا ظاہر و باطن صاف ہو گیا کیوں کہ تقویٰ اندر، باہر کی صفائی کرتا ہے۔ رُوحانیت میں ظاہر و باطن کی صفائی کے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ رُوحانیت کا ابتدائی قدم دل کی صفائی ہے۔

رُوحانیت کی راہ پر چلنے سے پہلے جو کام ہمیں کرنا پڑے گا وہ یہ کہ ہم اس بات کی Practice کرلیں کہ کوئی شخص خواہ ہمیں کتنا بڑا نقصان پہنچا دے، ہماری جڑیں کاٹ دے، ہمیں بُرا بھلا کہے، پراپیگنڈا کرے، گالیاں دے، ہم اُس کے خلاف دل میں کوئی کینہ، بغض یا بُرائی نہ آنے دیں۔ ہمارا دل اُس سے صاف رہے۔

یہ رُوحانیت کی راہ پر قدم رکھنے سے پہلے کی Stage ہے۔ رُوحانیت پر چلنے کے لیے ہمیں اس پر عمل کر لینا چاہیے۔ اسی طرح ہمیں رُوحانیت کی راہ پر قدم رکھنے سے پہلے ایثار و قربانی کو اپنا لینا چاہیے۔

We should be more than willing to sacrifice our needs for our brothers.

یہ جب ہم ایک بار کرلیں اور اس میں ہم مشاق ہو جائیں تب ہمیں رُوحانیت کی راہ پر قدم رکھنا چاہیے تاکہ ہم آسانی سے آگے بڑھ سکیں۔ جب ایک بار ہم نے رُوحانیت کے راستہ پر قدم رکھ دیا تو پھر ہم تین چیزوں سے کام لیں۔

1۔ قناعت

2۔ تقویٰ

3۔ توکل

یہ تین چیزیں ہمیں اپنے اندر پیدا کرنی ہیں پہلے قدم کے طور پر۔

تقویٰ ظاہر و باطن کو دھو ڈالتا ہے۔ ہمارے باطن اور قلب پر گناہوں سے جو سیاہ داغ آتے ہیں، جس کا

ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔ قلب کے اندھیروں کے وہ داغ دھبے تقویٰ سے ڈھلتے ہیں۔ اس کے بعد توکل کی باری ہے۔

''توکل'' درحقیقت انسان کو رب پر بھروسا عطا کرتا ہے۔ ایسا بھروسا کہ جس میں انسان سوچتا اور کہتا ہے کہ میں اپنے کسی کام کے لیے پریشان کیوں رہوں جب تو میرا رب ہے۔ یہ رب تعالیٰ پر ایک بھروسا اور مان ہے۔

''بھروسا'' کہنے کو تو ایک لفظ ہے لیکن اس کے پیچھے بہت Polished ایمان ہے۔ Polished ایمان کیا ہے؟ پہلی چیز تو یہ کہ میرا کوئی پالن ہار ہے۔ میرا کوئی مالک ہے جو مجھے پالتا ہے۔ میری ضروریات کو دیکھتا ہے۔ میری حفاظت کرتا ہے۔ ایک تو یہ ایمان ہے۔ دوسری چیز جو اس لفظ ''بھروسا'' میں موجود ہے وہ یہ کہ میرا مالک ایسا ہے جو بے پناہ مہربان ہے اور ایسا مہربان کہ میری تمام تر کوتاہیوں، خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود مجھے Look after کرتا ہے۔ پھر اس کے پیچھے ایک اور چیز موجود ہے جس کے اندر تشکر بھی ہے اور اُمید بھی۔ وہ یہ ہے کہ میرا رب مجھے آج تک Look after کرتا آیا ہے، پالتا آیا ہے، میری ضروریات آج تک پوری کرتا آیا ہے۔ وہ انشاء اللہ آئندہ بھی کرتا رہے گا۔

انسان کے اندر یہ احساس تشکر پیدا کرتا ہے۔ پہلا حصہ تشکر کا ہے اور دوسرا اُمید کا۔ رب تعالیٰ نے یہ دو چیزیں بندوں سے چاہی ہیں کہ رب تعالیٰ کے شکر گزار بن جاؤ اور اُس سے نااُمید نہ ہو۔ یہ دونوں چیزیں لفظ ''بھروسا'' میں چھپی ہیں۔ جب تک بھروسا پیدا نہیں ہوگا تب تک توکل نہیں آئے گا اور توکل کے بغیر رُوحانیت نہیں آئے گی۔ یہ رب تعالیٰ پر توکل ہی تھا کہ درویشوں نے کبھی کچھ بچا کر نہیں رکھا اور جو بھی تحفے تحائف یا فتوحات تھیں، عقیدت مندوں نے جو کچھ پیش کیا سب لوگوں میں بانٹ کر جھولی جھاڑ کر اُٹھے اور سونے سے پہلے یہ یقین کر لیا کہ کوئی چیز موجود تو نہیں۔ وہ کچن اور سٹور خالی کر کے سوتے تھے۔

جب رب تعالیٰ پر یہ توکل پیدا ہوتا ہے تو انسان رب تعالیٰ کے قریب ہونے لگتا ہے اور رب تعالیٰ پر پیار آنے لگتا ہے۔ جو کچھ موجود تھا پاس نہ رکھا۔ رب کے بندوں میں تقسیم کر دیا۔ اگلے دن فاقہ آ گیا۔ دل یہ کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ مجھے میرا رب بھوکا رکھے۔ وہ تو میرا پالن ہار ہے۔ لیکن ظاہراً فاقہ ہے۔ اچانک کھانے پینے کی اشیا آتی ہیں تو انسان رب تعالیٰ کی قدرت پر عش عش کرتا ہے کہ میرے رب نے وہاں سے مجھے رزق عطا فرمایا جہاں سے توقع نہیں تھی۔ یوں بندہ رب تعالیٰ کی شکر گزاری کرنے لگتا ہے اور شکر کا جذبہ بہت شدت سے جنم لیتا ہے۔ تو یہ چیزیں بہت تیزی سے ہمیں رب تعالیٰ کے قریب لے جائیں گی۔

روزہ...... جس کی فضیلت ماہِ رمضان میں جگہ جگہ بیان ہوتی ہے رُوحانیت میں اُس کے کئی Angles ہیں جو بیان نہیں ہوتے۔

جس طرح توکل سے بھروسا پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھروسا دراصل Synonymous ہے روزہ کے لیے۔ روزہ سے رب پر بہت شدت کا بھروسا پیدا ہوتا ہے۔ دُنیا کے تمام الہامی و غیر الہامی مذاہب میں روزہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ہندوازم میں روزے کو بہت بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوازم میں کہا جاتا ہے کہ اندر

کی تطہیر کے لیے روزہ ضروری ہے۔ وہ روزہ کو "برت" کہتے ہیں۔ اُن کے مطابق "برت" اندر کی صفائی کرتا ہے۔ اس لیے سادھو جب رُوحانیت میں قدم رکھتے ہیں تو کثرت سے روزے رکھتے ہیں۔ بدھ ازم میں بھی روزہ کو اہمیت حاصل ہے۔ گوتم بدھ نے کثرت سے روزے رکھے۔

عیسائیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی 30 روزے فرض کیے گئے تھے اور وہ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ پادری اور عیسائی لیڈر روزوں کی اس تعداد کو Modify کرنے لگے۔ چونکہ فلسطین اور ارد گرد کے علاقوں میں گرمی بہت پڑتی ہے لہٰذا عیسائی مذہبی راہنماؤں نے سوچا کہ گرمی کے باعث روزے رکھنا دشوار ہے اس لیے اُنھوں نے روزے گرمیوں سے سردیوں میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس تبدیلی کے باعث روزے 30 کی بجائے 40 کر دیے۔ بعد ازاں اُن کے ایک بادشاہ کا کوئی دُنیاوی کام تھا جس کے لیے اُس نے منت مانی کہ کام ہو جانے کی صورت میں وہ اور اُس کی رعایا سات روزے رکھے گی۔ یوں روزے 40 سے بڑھ کر 47 ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اور بادشاہ نے اپنے کسی کام کے لیے تین روزوں کی منت مانی اور کام ہو جانے کے بعد یہ تین روزے بھی اُن 47 روزوں میں شامل کر دیے۔ یوں عیسائیت میں 50 روزے ہو گئے۔

2005ء میں کرسمس اور عید دونوں 25 دسمبر کو آ گئے۔ پاپائے روم ہر کرسمس پر ایک پیغام دیتے ہیں جو دُنیا بھر کے تمام گرجا گھروں میں پڑھا جاتا ہے۔ 2005 میں پاپائے روم نے جو پیغام دیا وہ یہ تھا کہ عیسائی اگر صحیح معنوں میں روزے رکھنا چاہتے ہیں تو اُس طریقے سے رکھیں جس طرح مسلمان رکھتے ہیں۔ اس پر ہر عیسائی ملک میں خاصی شدت کی Resentment ہوئی اور وہ پیغام پڑھتے پر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا گیا۔ لیکن بالآخر کرسمس کی سروس میں پڑھنا ہی پڑا۔ یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔

یہودیوں اور دیگر تمام مذاہب میں بھی روزوں کا تصور موجود ہے کیوں کہ توکل کے ضمن میں جس بھروسے کا ذکر ہوا ہے وہ روزہ ہی سے آتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا بلند پایہ ولی اللہ تھے۔ آپ ہر روز نفلی روزہ رکھتے تھے ماسوائے عید کے ایام کے۔ ایک بار اُنھیں محسوس ہوا کہ میرا جسم و نفس مسلسل روزے کا عادی ہونے کے باعث اب روزہ میں بھی بے آرامی محسوس نہیں کرتا۔ جونہی اُنھیں یہ محسوس ہوا اُنھوں نے Alternate days (ایک دن کے ناغہ کے ساتھ) میں روزہ رکھنا شروع کر دیا تا کہ ناغہ کے بعد وہ روزہ رکھیں تو اُن کا نفس کھانے پینے کو کچھ مانگے اور وہ اس پر جبر کر کے رُوحانی ترقی حاصل کر لیں۔ حضرت نظام الدین اولیا نے Alternate days کے یہ روزے آخری ایام عمر تک رکھے۔

چند دیگر اولیائے کرام کا بھی روزوں کے حوالے سے یہی معمول رہا کہ جہاں مسلسل روزوں سے اُنھیں اپنا نفس و جسم عادی محسوس ہوا وہ Alternate days کے روزوں پر چلے گئے۔

رُوحانیت میں روزوں کو باطنی عبادت کہا جاتا ہے۔ یہ ظاہری عبادت نہیں کیوں کہ اس کے تمام فوائد باطنی ہیں۔

حدیث قدسی ہے "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔" (صحیح بخاری: حدیث نمبر 1904، صحیح مسلم: حدیث نمبر 2700)

یہ اس لیے کہا کیوں کہ اس کے رُوحانی اور باطنی فوائد وہی شخص جان سکتا ہے جو روزہ دار ہے۔

روزہ سے باطنی اور رُوحانی بالیدگی آتی ہے۔ انسان اپنے نفس کو کنٹرول کر لیتا ہے۔ کسی کی غیبت نہیں کرتا۔ گالی نہیں دیتا۔ غصہ کو دبا لیتا ہے۔ یہ سب روزے کے آداب ہیں جن سے نفس کا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ اصلی روزہ وہ ہے جس میں آنکھ کا روزہ بھی ہے۔ کانوں کا روزہ بھی۔ زبان، منہ، ہاتھوں اور پاؤں کا روزہ بھی ہے۔ انسان اپنی زبان روک لیتا ہے فحش گوئی، بدگوئی اور غیبت سے۔ انسان کسی بُرائی کو ہوتے نہیں دیکھتا۔ کسی کو بُرائی کرتا دیکھ کر وہ منہ موڑ لیتا ہے تا کہ وہ گواہ نہ بنے۔ وہ کسی کی غیبت نہیں سنتا بلکہ وہاں سے اُٹھ کر چل دیتا ہے۔ وہ گناہ کے لیے چل کر نہیں جاتا۔ وہ ہاتھ سے کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا۔ چوری نہیں کرتا۔ ڈاکا نہیں ڈالتا۔ یوں روزہ مشتمل ہے انسان کی آنکھ، زبان، کان، منہ اور ہاتھ پاؤں کے روزہ پر۔

روزہ میں انسان ہر طریقہ سے اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ جب وہ نفس کو کنٹرول میں رکھتا اور رب تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو رُوحانیت کی راہ خود ہی طے ہونے لگتی ہے۔ یہی تو رُوحانیت ہے کہ انسان نفس کو کچلتا جائے اور رب کو یاد کرتا جائے۔ اِسی لیے رُوحانیت میں روزہ کو آدھی طریقت کہا جاتا ہے۔

ہر عبادت کے کچھ فرائض، سنت اور واجب ہیں۔ اسی طرح اس کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ کسی بھی مذہب میں عبادات اپنی تکمیل کو نہیں پہنچتیں جب تک روزہ اس کا حصہ نہ ہو جائے۔ ہر عبادت کی تکمیل ہوتی ہی روزہ سے ہے۔

سلسلۂ چشتیہ میں ہر شاگرد کو اُس کا مرشد تین روزے رکھواتا ہے۔ وہ تین روزے اس قسم کے ہوتے ہیں کہ پہلے دن وہ افطار پانی سے کرتا ہے اور اگلے دن پانی ہی سے سحری کرتا ہے۔ اس کے بعد افطار اور سحری میں وہ صرف پانی کا ایک گھونٹ پی سکتا ہے۔ تیسرے دن کا روزہ مکمل ہو جانے کے بعد انسان کچھ کھا پی سکتا ہے۔ یہ روزہ تربیت کا حصہ ہے۔ ورنہ کوئی بھی اُستاد شاگرد کو مصیبت یا تکلیف میں ڈال کر خوش نہیں ہوتا۔ رُوحانیت میں روزہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ایک طرف تو اسے آدھی طریقت کہا گیا اور دوسری طرف روزہ ہر عبادت کی تکمیل کہلایا۔

رُوحانیت میں روزہ کے بہت سے فوائد ہیں لیکن تین Major فوائد ہیں جن سے رُوحانیت آگے بڑھتی اور ترقی کی منازل طے کرتی ہے۔

1۔ پہلے فائدہ کا تعلق اخلاقِ صمدیت سے ہے۔ اسے اخلاقِ رب بھی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن رب تو نام ہے تمام صفات کا۔ اگرچہ رب بھی صفت ہے لیکن یہ تمام صفات کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا رب کی ایک صفت ہے صمد ہونا۔ وہ بے نیاز ہے۔

روزہ کا تعلق اللہ کی صفتِ صمدیت سے ہے۔ کیوں کہ رب تو وہ ہے جو نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ نہ اُسے

اُونگھ آتی ہے۔ وہ تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔ جب انسان روزہ رکھتا ہے تو اُس کے اندر یہ کیفیت آتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو بہت سی چیزوں سے روک لیتا ہے۔ اُس کی راتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اُس کی پشت بستر سے نہیں لگتی۔ کھانے پینے اور نفسانی خواہشات سے وہ خود کو روکے رکھتا ہے۔ اُس کی زبان ہر قسم کی یاوہ گوئی سے رُکی رہتی ہے۔ مسلسل روزے رکھنے سے یہ چیزیں اُس کی عادت میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ روزے کا تعلق رب تعالیٰ کے ''اخلاقِ صمدیت'' سے ہے۔

2۔ روزہ کا دوسرا رُوحانی فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان میں رُجوع الی اللہ کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ رُجوع کی صفت کیا ہے؟ انسان اپنے رب کے احکامات کی طرف رُجوع کرتا ہے۔ اُس کے حکم کردہ اُمور کو بجا لاتا اور منع کردہ باتوں سے اجتناب کرنے لگتا ہے۔ روزہ میں انسان کے تمام اعضا ایسے کاموں سے رُک جاتے ہیں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے اور وہ اُن اعضا سے وہ کام لینے لگتا ہے جس کا رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ یوں وہ رب کی طرف رُجوع کرتا ہے۔ شروع میں ضبط اور جبر سے لیکن بعد میں اُسے اس رُجوع کی عادت ہو جاتی ہے اور خود بخود یہ چیزیں اُس سے سرزد ہونے لگتی ہیں۔

3۔ روزے کا تیسرا رُوحانی فائدہ یہ ہے کہ انسان عبودیت سے عبد کے مقام پر جا پہنچتا ہے۔ بندہ ہونا اعلیٰ ترین مقام ہے انسان کا کہ کوئی انسان رب کا بندہ ہو جائے۔ رب کا بندہ کون ہے؟ جو رب تعالیٰ کی بندگی کرتا ہے اُس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کی پابندی کرتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کے لیے رب تعالیٰ نے ''بندہ'' کا لفظ استعمال کیا۔ پندرھویں پارہ کا آغاز دیکھیں۔

''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندہ خاص کو...... الخ''

کیوں کہ بندہ وہ ہے جو رب تعالیٰ کی بندگی کر رہا ہے اور بندگی رب کے احکامات کو غیر مشروط طور پر ماننے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کا نام ہے۔ روزہ سے انسان میں عبودیت آتی ہے اور عبودیت سے انسان مقامِ عبد تک جا پہنچتا ہے۔

لاء آف نیچر اور ڈیزائن آف نیچر

سوال: روزِ محشر ہر انسان کو اپنی فکر ہوگی کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ جب دُنیا میں کسی دوست کے قریب رہ کر ہمیں آخرت یاد آتی ہے تو کیا یہ دوستی بھی کام نہ آئے گی؟

جواب: روزِ حساب نہ تو کسی کی کوئی رشتہ داری، حسب نسب کام آئے گا اور نہ ہی دوستی۔ وہاں کلیتہً اعمال کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔

ایک زمانہ میں ایک نوجوان نے UK میں مجھ سے ایک سوال پوچھا تھا کہ روزِ حساب رب تعالیٰ رحیم زیادہ ہوگا یا منصف؟ یعنی اُس روز رب تعالیٰ انصاف سے کام لے گا یا اپنے رحمٰن و رحیم ہونے کی صفات سے۔

روزِ محشر حساب کتاب کے وقت رب تعالیٰ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا اور ہر شخص کو اُس کے نامۂ اعمال کے مطابق سزا و جزا سنا دے گا۔ یہ اور بات ہے کہ سزا و جزا سنانے کے بعد وہ جس کو چاہے گا اپنی رحمت سے بخش دے گا۔ حساب کتاب کی بنیاد پر ہونے والا فیصلہ بہر حال مبنی بر انصاف ہوگا۔

جو لوگ اللہ کے ذکر میں مصروف رہتے ہیں اُس کے اثرات ہماری ذات پر بھی مرتب ہوتے ہیں اور ہم بھی ذکر میں مصروف اور آخرت کی فکر میں رہنے لگتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کی دوستی بہر طور آخرت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

سوال: موت کے بعد نیند ہے یا بیداری؟

جواب: دو چیزیں ہیں:۔

1۔ فنا

2۔ بقا

ہر وہ چیز جس کے اندر باقی رہنے کی صفت ہے، جس کی اصل باقی رہنا ہے وہ باقی رہے گی اور دوسری ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ انسانی جسم فانی ہے اور اس جسم کو رُوح چلائے رکھتی ہے۔ رُوح امرِ ربی ہے اور امرِ ربی دائمی اور ابدی ہے۔ وہ فنا نہیں ہوتا۔ جسم منوں مٹی کے نیچے دفن ہو جاتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ مٹی کا حصہ

ہو جاتا ہے۔لیکن رُوح عالم برزخ میں زندہ رہتی ہے۔رُوحیں چونکہ امرِ ربی اور اللہ کے نور کا حصہ ہیں اس لیے وہ اُونگھتی ہیں نہ سوتی ہیں اور ہروقت عالم بیداری میں رہتی ہیں۔

سوال: ہندوؤں اور سکھوں نے قیامِ پاکستان سے قبل رفاہِ عامہ کے بہت سے کام کیے جیسے گنگا رام ہسپتال سے لوگ اب بھی مستفید ہو رہے ہیں۔کیا غیر مسلموں کو آخرت میں اس خدمت کا اجر ملے گا؟

جواب: اللہ نے اس بات کا فیصلہ قرآن میں کر دیا کہ وہ لوگ جنھوں نے سرکشی کی اور اُس کے مبعوث کیے گئے پیغمبروں کے پیغام کو من و عن قبول نہیں کیا ایسے سرکش لوگ جب نیک کام کرتے ہیں تو رب تعالیٰ اُن کو دُنیا میں اس کا اجر عطا فرما دیتا ہے۔آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں۔

''جو دُنیا کی زندگی اور آرائش چاہتا ہو ہم اس میں اُن کا پورا پھل دیں گے اور اُس میں کمی نہ ہونے دیں گے۔یہ ہیں جن کے لیے آخرت میں کچھ نہیں مگر آگ اور اکارت گیا جو کچھ وہاں کرتے تھے اور نابود ہوئے جو اُن کے عمل تھے۔''(سورۂ ہود: 15 تا 16)

گنگا رام ہسپتال کی طرح کے صدقہ جاریہ والے کام کرنے والے لوگوں کا اجر اُن کی اولاد کو دے دیا جاتا ہے یا پھر اُن کے اپنے گناہوں میں کمی کر دی جاتی ہے۔لیکن ایسے لوگ اپنے نیک اعمال کی بنیاد پر جنت میں نہیں جائیں گے کیوں کہ اللہ کے پیغام کو قبول نہ کر کے اُنھوں نے سرکشی کی جو ناقابلِ معافی جرم ہے۔

جس طرح شیطان نے رب کے حکم کی پیروی نہ کی اور راندۂ درگاہ ٹھہرا۔جب کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی حکم عدولی ہوئی لیکن پھر بھی وہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول ٹھہرے۔کیونکہ فرق یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور توبہ کر لی جب کہ شیطان اپنی غلطی پر اڑا رہا۔اُس نے اپنی عبادت پر تکبر بھی کیا اور خود کو آدم سے بہتر جانا۔

غیر مسلموں نے چونکہ رب تعالیٰ کے آخری پیغام اور حکم سے انکار کیا اور سرکشی کا مظاہرہ کیا اس لیے وہ جنت میں داخل نہ ہو پائیں گے۔آخرت کے اجر میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

سوال: مغربی ممالک کے نوجوان اکثر یہ سوال پوچھتے ہیں کہ وہ قوتیں جو اسلام کو سربلند اور مسلمانوں کو طاقت ور نہیں دیکھنا چاہتیں وہ طاقتیں مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں اور پراپیگنڈا میں مصروف رہتی ہیں۔

جواب: پراپیگنڈا کئی طرح کا ہوتا ہے۔ایک ڈائریکٹ پراپیگنڈا (Direct Propaganda) بھی ہے کہ غیر مسلم مسلمانوں کی خامیاں دیکھ کر ان کو Highlight کرنا شروع کر دیں۔

Indirect Propaganda یہ ہے کہ بظاہر تو غیر مسلم مسلمانوں کے خیر خواہ دکھائی دیں، اُن کی تعریف کریں اور اس تعریف کے دوران کوئی نہ کوئی ایسی بات کر جائیں جس سے مسلمانوں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہوں۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں اتحادی قوتیں جرمنی کے

سورانی کو توڑنا چاہتی تھیں کیوں کہ باوجود شکست کے جرمن فوجوں کے حوصلے بلند تھے۔ چرچل نے یہ طریقہ ڈھونڈا کہ فرانس کا وہ حصہ جو دوبارہ اتحادی قوتوں کے زیر اثر آ گیا تھا اُس کی آخری لائن کے قریب فوج کے High Power Transmitter کو کھڑا کر دیا اور انگریزوں میں جو لوگ جرمن نژاد تھے اُن کو ڈھونڈ اور اُن کی Training کر کے اُس ریڈیو کو جرمن ریڈیو کا نام دیا۔ اُس جرمن ریڈیو سے ٹرانسمشن کا آغاز کر دیا۔ وہ ریڈیو چینل دن بھر جرمن زبان میں جرمن فتوحات کی کہانیاں سناتا حالانکہ وہاں شکست ہو رہی تھی۔ جب جرمن قوم یہ دیکھتی کہ ریڈیو سارا دن جرمن فتوحات کے قصے سناتا ہے لیکن شام کو وہ علاقہ اتحادی فوجیں فتح کر لیتی ہیں تو یہ صورت حال دیکھ کر جرمن قوم اپنی لیڈر شپ (Leadership) کو گالیاں دیتی۔ یوں اتحادیوں نے بالواسطہ پراپیگنڈا کر کے جرمن قوم اور فوج کے حوصلے پست کیے۔

پراپیگنڈا کی کئی اقسام ہیں۔ جیسے Black , Blue Propaganda, White Propaganda اور Propaganda Yellow۔ یہ باقاعدہ ایک سائنس ہے جس سے دُنیا میں بہت سے کام لیے جا رہے ہیں۔

اسلام کے بارے میں بھی Indirect Propaganda سے کام لیا جا رہا ہے۔ بظاہر تعریف کی جاتی ہے کہ اسلام بہت اچھا مذہب ہے۔ اس کی خصوصیات سے متاثر ہو کر ہی ہم مسلمان ہوئے۔ لیکن تعریف ہی تعریف میں وہ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں جو ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے لگتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی طاقت نہیں گناہوں سے بچنے کی قوت اور نیک کام کرنے کی طاقت اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر یہ جزا اور سزا کیوں؟ معصوم مسلمان نوجوانوں تک جب یہ سوال پہنچتے ہیں تو وہ Upset ہو جاتے ہیں اور اس کا جواب ڈھونڈتے ہیں۔ اس سوال کا جواب ہم یوں ڈھونڈ سکتے ہیں کہ آپ جس ادارے میں کام کرتے ہیں اُس کے Head of Department یا Chief Executive کے پاس فیصلہ سازی اور ہر قسم کے اقدامات کرنے کی اتھارٹی اور قوت ہوتی ہے لیکن نظام چلانے کے لیے وہ اپنے ماتحت آفیسرز کو کچھ اختیارات دے دیتا ہے تاکہ وہ ماتحت آفیسرز ایک Certain Amount تک اخراجات کی منظوری دے سکیں۔ ملازمین کی Transfer and Posting کر سکیں۔ ماتحت افسران اپنے اختیارات سے کام لیتے ہوئے مختلف فیصلے کرتے رہتے ہیں اور یوں ادارے کا کام چلتا رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی افسر اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز کر کے فیصلے کرنے لگے تو Big boss اُس سے فوراً اختیارات واپس لے لیتا ہے اور اُسے سزا بھی دیتا ہے۔

اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا نائب اور نمبر 2 بنا کر بھیجا۔ رب تعالیٰ بہت انصاف پسند ہے۔ جب اُس کا تخلیق کردہ انسان تمام اختیارات ہونے کے باوجود اپنے ماتحت افسروں کو کچھ اختیارات ضرور تقسیم کر دیتا ہے۔ رب تعالیٰ تو پھر رب تعالیٰ ہے۔ وہ اپنے خلیفہ کو مجبور محض کیسے بنا سکتا ہے۔ اُس نے انسان کو تین آزادیاں اور قوتیں دے کر زمین پر اُتارا۔

1۔ Freedom of Thought۔ انسان جو چاہے دماغ میں سوچے.... چاہے گناہ کے بارے میں سوچے یا نیکی کے بارے میں۔ کوئی فرشتہ آکر اُسے اس سوچ سے نہیں روکے گا۔

2۔ Freedom of Decision۔ ہم آزاد ہیں کہ کوئی بھی فیصلہ کریں..... نیکی کی راہ پر چلنے کا فیصلہ کریں یا بدی کے راستہ پر جانے کا۔ فرشتہ ہمیں ہاتھ پکڑ کر روکے گا نہیں۔

3۔ Freedom of Action۔ میں آزاد ہوں کہ گناہ کا کام کروں یا نیکی کی راہ اپناؤں۔

انسان کو یہ تین آزادیاں اور اختیارات دینے کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ نے اس کے Certain parameters بھی Set کر دیے کہ دُنیاوی زندگی میں ان حدود سے تجاوز نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے Do's اور Do nots کی بھی فہرست دے دی اور ساتھ بتا دیا کہ Do's کے مطابق زندگی بسر کرنے کی صورت میں دُنیا و آخرت میں اجر و انعام ہے۔ لیکن Choice اور آزادی بہر حال انسان کو دے دی گئی ہے۔ یہ تمام آزادی دینے کے بعد رب فرماتا ہے کہ تمام اختیارات میرے ہی پاس ہیں۔ گویا ویٹو پاور اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اُس کے Design of Nature میں دخل اندازی کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو رب تعالیٰ ویٹو پاور استعمال کر کے اُسے روک دیتا ہے۔ اس لیے ہماری کچھ کوششیں اکثر بار آور نہیں ہوتیں۔ اور ہماری محنتیں انجام تک نہیں پہنچتیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اللہ کی Greater Scheme of Affairs میں ہمارا وہ قدم کہیں Fit نہیں ہو رہا ہوتا۔ اس لیے وہ ہماری کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا اور وہیں Cut out کر دیتا ہے۔

ایک وجہ اور بھی ہوتی ہے کہ بعض اوقات ہماری خواہشات اور سوچیں ہمیں وہاں لے جاتی ہیں جہاں ہم اپنی کم علمی کی وجہ سے اللہ سے کوئی ایسی چیز مانگتے ہیں جو ہمارے مفاد میں نہیں ہوتی تو رب تعالیٰ جو بندہ کا سب سے بڑھ کر خیر خواہ ہے ہماری وہ خواہش پوری نہیں ہونے دیتا۔ جیسے بچہ آگ کا شعلہ کو پکڑنا چاہے تو محبت کرنے والی ماں جو ہمیشہ بچے کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے بے تاب رہتی ہے، وہ شعلہ بچہ کو نہیں پکڑنے دے گی چاہے وہ جتنا شور مچائے، روئے۔ کیوں کہ ماں جانتی ہے شعلہ چھونے یا پکڑنے سے بچہ اپنا ہاتھ جلا بیٹھے گا۔ بالکل اسی طرح رب تعالیٰ ہمیں ہماری اُن خواہشات سے بچاتا ہے جو ہمارے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ رب تعالیٰ اپنی ویٹو پاور استعمال کرتا ہے اور ہماری ایسی خواہشات کو پورا ہونے سے روک دیتا ہے۔ یہ اُس کی قدرت کاملہ کی نشانی ہے کہ انسان بعض اوقات اپنی تمام تر کوششوں اور دُعاؤں کے باوجود اپنی تمناؤں کی تکمیل سے محروم رہتا ہے۔ اسی لیے رب فرماتا ہے کہ سب قوتیں اور اختیارات میرے پاس ہیں۔ نفع و نقصان کی سب طاقت میرے پاس ہے۔ ہاں البتہ رب تعالیٰ نے اپنے اختیارات میں سے کچھ اختیارات انسان کو تفویض کر دیے ہیں کیوں کہ انسان رب کا نائب ہے۔

سوال: حضرت بابا فرید ؒ کے دربار پر بہشتی دروازہ کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: بہشتی دروازہ کے بارے میں بہت سی روایات ہیں کہ بابا صاحب نے جلال میں آ کر اپنے ہم عصر ولی اللہ کے مقابلے میں فرمایا تھا کہ جو شخص اس دروازہ سے گزرے گا وہ جنت میں جائے گا۔

ہمارے ہاں ایک عجیب دستور یہ ہے کہ جب ہم اپنے مرشد صاحب کے بارے میں ذکر کرتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ انھیں بڑھا چڑھا کر بیان کریں۔ اس لیے عقیدت کی وجہ سے ایسی باتیں بھی کر دیتے ہیں جن کو Logic اور ذہن تسلیم کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ جب بھی کسی ولی اللہ کے بارے میں کوئی کتاب پڑھیں تو کرامات پر مبنی حصہ Ignore (نظر انداز) کر دیں۔ تاکہ انسان اُن سے متاثر ہو کر اُن کرامات کی تلاش میں اُٹھ نہ کھڑا ہو۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہم ولی اللہ کو مافوق الفطرت قوتوں کا مالک سمجھنے لگتے ہیں اور جب ہم حقیقت میں کسی ولی اللہ سے ملتے ہیں اور اُسے اپنے جیسا عام انسان پاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہوا میں نہیں بلکہ زمین پر چل رہا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہوتا کہ وہ آسمان کی طرف دیکھے تو بارش برسنے لگے۔ سگنل کی خلاف ورزی پر اُس کا بھی چالان ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ سب دیکھ کر ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ یہاں قصور اُس ولی اللہ کا نہیں بلکہ سراسر ہمارا اپنا ہوتا ہے۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ ولی اللہ بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ علم لدنی اُس کو عطا ہو جانے کے بعد اُس کو نہ تو پَر لگ جاتے ہیں اور نہ ہی اُس کے سینگ نکل آتے ہیں۔ ایک عام انسان اور ولی اللہ میں بس ایک فرق ہوتا ہے جو باریکی سے مشاہدہ کرنے پر نظر آتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ ولی اللہ کے زندگی کے حوالے سے رویے اور افعال عموماً سنت کے مطابق ہوتے ہیں۔ ولی اللہ کی اصل کرامت یہی ہے۔ کتابوں میں مذکور کرامات عموماً انسان کو بہکا دیتی ہیں۔ ہمارا Criteria کسی بھی ولی اللہ کے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ صاحب اُن کی دُعا رد نہیں ہوتی۔ حالانکہ کسی پیغمبر کے لیے بھی یہ گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔ کیوں کہ یہ صرف رب ہے جو جس دُعا کو چاہے قبول یا رد کر دے۔ ولی اللہ بھی اللہ کا محتاج معمولی بندہ ہے۔ وہ صرف رب کے حضور گڑگڑا سکتا ہے۔ دُعا کا قبول ہونا یا نا قبول ٹھہرنا کلیتہً رب کی مرضی پر منحصر ہے۔ ذرا سوچیے کہ جب ولی اللہ اس قدر رب کا محتاج ہے تو پھر یہ کرامات و حکایات کیسی؟ کچھ ایسا ہی معاملہ بہشتی دروازہ کا ہے۔ میرے خیال میں بابا صاحب کے اس فرمان کہ جو اس دروازہ سے گزرے گا جنتی ہے، کا مطلب غالباً یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ نے چونکہ حضرت بابا فرید گنج شکر صاحب کو ایسی کشش عطا فرمائی تھی کہ جو شخص اُن کے پاس آنے لگا وہ گناہوں سے پاک ہوتا چلا گیا۔ جہاں بابا صاحب اب آرام فرما ہیں یہ جگہ دراصل اُن کا حجرہ تھی اور یہی حجرہ اُن کی عبادت گاہ تھا۔ جہاں وہ شب بھر عبادت میں مصروف رہتے۔ بابا صاحب کی غالباً مراد یہ ہوگی کہ جو شخص مجھ سے ملاقات کی غرض سے اس حجرہ میں داخل ہو گیا اُس کی تالیف قلب یوں ہوگی کہ وہ گناہوں سے دُور ہو جائے گا۔ اور جو شخص گناہوں سے دُور ہو جاتا ہے وہ جنت سے قریب ہو جاتا ہے۔ اس روایت کا میرے خیال میں تو یہی مطلب ہے۔ کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بابا صاحب جیسی عظیم ہستی کرامات کا اظہار نہیں کرے گی۔ وہ بہت اعلیٰ پائے کے ولی اللہ ہیں۔ اُن کے تو تربیت یافتہ

شاگردوں نے بھی کبھی کرامت کے اظہار جیسی حرکت نہیں کی۔ حضرت نظام الدین اولیا نے ایک طویل عرصہ تک بابا فرید صاحب کی خدمت کی۔ وہ وضو کے لیے پانی اور کھانا فراہم کرتے۔ اسی خدمت کے نتیجہ میں اللہ نے انھیں بہت بلند مرتبہ عطا فرمایا۔ لیکن اُنھوں نے بھی کبھی ایسی کرامت کا اظہار نہیں فرمایا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر تو اُن سے بھی کہیں بلند مقام پر ہیں لہٰذا اُن کے اس فرمان کا مطلب یہی ہوگا کہ جو میرے پاس ایک بار آ گیا وہ اس طرح بدل جائے گا کہ گناہوں سے ہمیشہ کے لیے دُور ہو جائے گا۔

سوال: آپ نے فرمایا تھا کہ کل جہان ستر ہزار اور کل عالم بیس ہزار ہیں۔ جہاں اور عالم میں کیا فرق ہے؟

جواب: جہان دراصل Galaxy ہے۔ جو ایک جھرمٹ ہے ستاروں کا جس میں سیارے ہیں۔ رفتہ رفتہ مزید Galaxies (کہکشائیں) دریافت ہو رہی ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ انسان جلد ہی دریافت کر لے گا کہ ان کی کل تعداد ستر ہزار ہے۔

عالم Universe کا نام ہے جس کا ایک سورج، چاند، زمین یا کوئی اور سیارہ ہے۔ جو ایک دوسرے کے گرد گھوم رہے ہیں۔ جیسے ہمارا یہ عالم ہے۔ اسی طرح اور بہت سے عالم ہیں جن کی تعداد بیس ہزار ہے۔

سوال: نعمت اور رحمت میں کیا فرق ہے؟ جیسے بارش اور بیٹی کو رحمت کہا جاتا ہے۔

جواب: نعمت سے مراد ہے وہ چیزیں جو رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقہ ہمیں عطا فرماتا ہے جن سے ہم براہ راست استفادہ کرتے ہیں۔ رحمت وہ ہے جو کوئی مادی وجود تو نہیں رکھتی لیکن اللہ اگر ہمیں کسی اچھے کام کی توفیق دے تو یہ رحمت ہے۔ اسی طرح جو چیزیں Directly ہمارے استعمال میں نہیں آتیں لیکن ہمارے فائدہ کا سبب بنتی ہیں وہ رحمت کہلاتی ہیں۔

بیٹی کا آنا انسان کے لیے بظاہر خرچ کا موجب بن جاتا ہے کیوں کہ اُس کی پرورش، تعلیم و تربیت، شادی اور اسی قسم کی دیگر اُلجھنوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن درحقیقت بیٹی کی آمد ہمارے لیے رحمت و برکت کا باعث بنتی ہے۔ باریکی سے اپنے حالات دیکھیں تو بیٹی کی پیدائش کے بعد عموماً مالی خوش حالی آ جاتی ہے۔ اکثر آپ نے سنا ہوگا کہ میری بیٹی میرے لیے بہت مبارک تھی۔ اُس کی شادی کے بعد میں تنگ دستی میں چلا گیا ہوں۔

آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ بیٹوں کی نسبت بیٹیاں ماں باپ کی زیادہ ہمدرد ہوتی ہیں۔ اُن کا زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ اُن کا والدین کو Look after کرنا والدین کے لیے باعث رحمت بنا رہتا ہے۔

اسی طرح بارش براہ راست ہمارے کام نہیں آتی۔ لیکن بارش کے نتیجہ میں موسم اور زمین میں جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ تبدیلیاں ہمارے لیے رحمت ہوتی ہیں۔ موسم بہتر ہو جاتا ہے۔ پینے کا صاف پانی Minerals کے ساتھ دستیاب ہوتا ہے۔ یوں بارش بھی باعث رحمت ہے۔

سوال: جھوٹی نبوت کے دعویٰ دار مرزا غلام احمد قادیانی کو لوگ مختلف دلائل سے امام مہدی مانتے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: قادیانیوں کے مذہبی لیڈر مرزا غلام احمد ابتدا میں مسلمان ہی تھے۔ اللہ نے انھیں بلا کی ذہانت عطا فرمائی تھی۔ اُن کا رُجحان مذہب کی طرف تھا۔ قرآن وفقہ کی تعلیم حاصل کی۔ قرآن پاک کا ترجمہ بھی لکھا۔ چونکہ ذہین تھے اس لیے قرآن پاک کی تفسیر میں فقہ کے باریک نکتے اس انداز میں بیان کیے کہ لوگوں کی طرف سے بہت تحسین وتعریف ملی۔ ابتدا دین کی خدمت کے باعث اُن پر اللہ کی رحمتیں ہوئیں۔ لیکن علم کی زیادتی اور گائیڈ کا نہ ہونا اُن کے لیے عذاب بن گیا۔ القا اور عالم رؤیا میں نظر آنے والی چیزوں کو یہ آہستہ آہستہ الہام سمجھنے لگے۔ چونکہ اللہ نے انھیں علم عطا فرمایا تھا اس لیے اُن کے عقیدت مند بھی تھے جن کے درمیان بیٹھ کر انھوں نے دعویٰ کیا کہ مجھے الہام ہوتا ہے۔ وہ لوگ متاثر ہوگئے۔ مرزا غلام احمد کو اپنے بارے میں خوش فہمی ہوئی اور وہ القا اور الہام کو وحی سمجھ بیٹھے۔ یہیں سے اُن کی بدبختی کا آغاز ہوا اور وہ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے۔ اس وقت اُن کے پیروکاروں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ قادیانیوں میں تین فرقے ہیں۔

1۔ ایک فرقہ تو معاذ اللہ مرزا غلام احمد کو نبی مانتا ہے۔

2۔ دوسرا فرقہ اپنے اس لیڈر کو امام مہدی کا درجہ دیتا ہے۔

3۔ تیسرا فرقہ انھیں مسیح موعود یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام مانتا ہے۔

یہ تینوں دعوے درست نہیں۔ مرزا غلام احمد کا نبی ہونا تو Out of question ہے کیوں کہ آپ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا لہٰذا نبوت کا دعویٰ سراسر جھوٹ ہے۔

مسیح موعود کی جہاں تک بات ہے تو احادیث کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بطور اُمتی ظہور کچھ مخصوص حالات وواقعات کے ساتھ مشروط ہے جو تا حال وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ اس لیے یہ دعویٰ بھی سراسر غلط ہے۔ اسی طرح امام مہدی کا ظہور بھی کچھ حالات کے ساتھ مشروط ہے اور وہ حالات ابھی تک رُونما نہیں ہوئے۔ اس لیے مرزا غلام احمد کی تینوں حیثیتیں ممکن نہیں۔ قادیانیوں کی یہی History ہے کیوں کہ اس فتنہ کو وجود میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔

پاکیزگیٔ خیال۔ حصولِ کشف کی شرطِ اوّل

سوال: کسی بزرگ کے مزار پر جا کر صاحب مزار سے کس طرح ملاقات کی جا سکتی ہے؟ کیا سوچ عمل پر اثر انداز ہوتی ہے؟ کشف کے حصول کی بنیادی شرط کیا ہے نیز کشف القبور کے حصول کے لیے مزار پر جا کر کون سی Activity کرنا ہوگی؟

جواب: جو لوگ اس دُنیا سے چلے گئے ہیں اُن کے مزاروں پر جا کر فاتحہ خوانی کے بعد جو ملاقات ہوتی ہے اُسے کشف القبور کہتے ہیں۔ اس میں ضروری نہیں کہ انسان کو معلوم بھی ہو کہ اس قبر میں کون ہے۔ اگر کسی کو اللہ کی رحمت سے کشف القبور حاصل ہے تو وہ اہل قبر سے ملاقات کر لیتے ہیں۔ وہ اہل قبر سے گفتگو کر سکتے ہیں اور Physical ملاقات بھی۔ لیکن یہ کشف القبور ایک لمبی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

انسان کے اعمال کی ابتدا سوچ یا خیال سے ہوتی ہے۔ انسانی ذہن کو اللہ تعالیٰ نے تین قوتیں عطا کی ہیں۔

1۔ قوتِ خیال یا تخیل

2۔ قوتِ ادراک

3۔ قوتِ حافظہ

ان میں سب سے اہم قوت تخیل ہے۔ سائنس میں بھی آج جتنی چیزوں سے ہم استفادہ کر رہے ہیں اُن تمام ایجادات کے وقوع پذیر ہونے کے پیچھے ایک تخیل یا خیال ہی ہے۔ سب سے پہلے کسی سائنس دان نے ایک تخیل پیش کیا کہ ایسی مشین متعارف ہونی چاہیے۔ تب لوگوں نے اُس خیال کا مذاق اُڑایا لیکن چند دہائیوں کے بعد اسی تخیل کی بنیاد پر کوئی تھیوری اور اس تھیوری کی بنیاد پر کوئی ایجاد سامنے آگئی۔ یوں انسان کی قوت تخیل سب سے اہم ہے۔

اسی طرح انسان سب سے پہلے سوچتا ہے۔ مثلاً جب وہ نماز پڑھنے کا سوچتا ہے تو پھر وہ ارادہ کرتا ہے کہ پانچ منٹ میں اُٹھ کر نماز ادا کرتا ہوں۔ پھر یہ ارادہ عمل میں ڈھلتا ہے اور وہ وضو کر کے جانماز پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

سوچ کے بغیر عمل ناممکن ہے۔ نیکی کی راہ پر چلنے کے خواہش مند انسان پر لازم ہے کہ اُس کا خیال اور سوچ پاکیزہ ہو جائے۔ جب کسی انسان کا ذہن پاکیزہ ہو جائے گا تو اُس کے اعمال بھی خود بخود پاکیزہ ہو

جائیں گے۔

مثلاً بددیانتی دو طرح کی ہوتی ہے۔

1- Physical Dishonesty

2- Intellectual Dishonesty

چوری کرنا، جھوٹ بولنا، غلط بیانی کرنا...... یہ سب Physical Dishonesty میں آتا ہے۔

Intellectual Dishonesty یہ ہے کہ ہماری سوچوں میں دھوکا دہی اور بددیانتی کا عنصر شامل ہو جائے۔ عمرانیات اور انسانی نفسیات کے ماہرین کے مطابق "جو Intellectual Dishonesty ہے وہ Physical Dishonesty سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے۔" وجہ یہ ہے کہ جب تک انسان غلط کام کا سوچے گا نہیں وہ غلط عمل بھی نہیں کرے گا۔

ایک انسان رشوت لینے یا چوری کرنے کا سوچے گا نہیں تو ایسا کرے گا بھی نہیں۔ سوچ قوت ادراک سے زیادہ اہم ہے۔ رُوحانیت میں بھی پاکیزہ اعمال کے لیے پاکیزہ سوچ کی شرط ہے۔ جب انسان کسی کے بارے میں اچھا سوچتا ہے اور اُس کا یہ خیال پریکٹیکل شکل میں ڈھل کر نیک کام کی صورت سامنے آتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک خاص کیمیکل پیدا ہوتا ہے جو انسانی جلد کو چمک عطا کرتا ہے۔ جسے ہم نور کے طور پر جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں انسان کے چہرے پر نور ہے۔ جب خیال، سوچ اور عملی نیکی اکٹھی ہوگی تو ہماری رُوح بہت لطیف ہوگی اور اس کی پرواز بہت اُونچی ہوگی۔ جب رُوح بالیدگی کے اِس مقام پر پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ انسان پر رحمت کرتا ہے اور انعام کے طور پر اُسے اپنے کارخانہ قدرت کی جھلک دیکھنے کی اجازت مرحمت فرماتا ہے۔ اِس کا بہترین طریقہ کشف ہے۔

اگرچہ نیکی کے قدرے کم درجے پر فائز کچھ لوگوں کو وہ خواب میں بھی اپنے کارخانہ قدرت کی جھلک دکھاتا ہے۔ اُس کے کارخانہ قدرت کا ایک ارب واں حصہ بھی اگر ہم دیکھنا چاہتے ہیں تو کئی خوابوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی صاحب فلکِ اوّل کی سیر کرتے ہیں تو وہاں وہ ایک Entrance دیکھتے ہیں جس پر چند سیڑھیاں ہیں۔ اس Entrance سے آگے ایک بلڈنگ کے پیچھے ایک پردہ سا دکھائی دیتا ہے۔ اس پردہ کے پار کچھ چیزیں دکھائی دیتی ہیں تو مقامِ یحییٰ نظر آتا ہے۔ اس سے بھی Beyond جب اُن صاحب کی نظر پڑتی ہے تو وہاں ایک پہاڑی دکھائی دیتی ہے جو دراصل ملائکہ ہیں۔ جن کے وہاں انچارج حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ اس سے بھی Beyond جب انسان دیکھتا ہے تو ایک اور پہاڑی نظر آتی ہے جو مقام عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ اس کے بعد ایک اور مقام ہے جسے بہت کم اولیا دیکھ پائے ہیں وہ مقام ابراہیم علیہ السلام ہے۔ یہ ایک جھلک ہے فلکِ اوّل کی۔ ایک شخص جانماز پر بیٹھا ہوتا ہے لیکن اُس کی رُوح کارخانہ قدرت کی سیر کر رہی ہوتی ہے۔ یہ کشف ہے۔ جس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو کشف الشخصی عطا فرماتا ہے۔ کشف الشخصی رکھنے والا شخص جب کسی کو دیکھتا ہے تو اس کی سوچ اور احوال سے

واقف ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کشفِ قلبی عطا کرتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کی قلبی کیفیات جان لیتے ہیں۔ لیکن رب تعالیٰ کسی کو بھی کشف عطا کرنے سے پہلے اتنا بڑا ظرف عطا فرماتا ہے کہ سب کچھ جاننے کے باوجود صاحبان کشف تمام چیزوں اور رازوں کو خاموشی سے Absorb (جذب) کر لیتے ہیں۔ زبان سے ایک لفظ تک نہیں کہتے۔ مزہ تو تب آتا ہے کہ باہر کھڑا ایک شخص گالیاں دے رہا ہو اور اندر آ کر گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر تعریفوں کے پل باندھنے لگے۔ تب بھی صاحب کشف اُسے کبھی اُس کے رویے کے تضاد کے بارے میں محسوس نہیں ہونے دیں گے۔

بات کشف القبور کی ہو رہی تھی تو کشف القبور بھی کشف ہی کی ایک قسم ہے جو چند دن کے اوراد و وظائف سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ Never Ending Process ہے۔ جو راہ ہدایت پانے کے بعد سے شروع ہو کر آخری سانسوں تک جاری رہتا ہے۔

آپ کی دل چسپی کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ چودہ حروف مقطعات تمام کائنات کا Control اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ یہ حروف مقطعات کائنات کے Controlling words ہیں۔ ان میں سے ایک ایسا حرف ہے جس میں بیماریوں کا علاج پوشیدہ ہے۔ اس کا ورد اگر انسان شروع کر دے تو رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے انسان کو ایسی صلاحیت عطا فرما دیتا ہے کہ شروع میں وہ جس آدمی کو دم کرتا ہے وہ صحت مند ہو جاتا ہے۔ پھر نوبت یہاں تک آ جاتی ہے کہ وہ بیمار سے محض یہ پوچھ لے کہ آپ کیسے ہیں تو اُس کی بیماری چلی جاتی ہے۔ اس سے اگلا درجہ اللہ اُسے یہ عطا فرماتا ہے کہ جس کمرہ میں وہ بیٹھا ہوتا ہے اُس کمرہ میں داخل ہونے والے لوگوں کے عام امراض اور چھوٹے موٹے درد خود بخود ٹھیک ہونے لگتے ہیں۔ اُسے کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔ اُس کے جسم سے نکلنے والی Vibrations اتنی Strong ہوتی ہیں کہ لوگ چھوٹی موٹی بیماریوں سے نجات پا جاتے ہیں۔

چودہ حروف مقطعات میں سے ایک ایسا حرف بھی ہے جس سے وسیع رزق عطا ہوتا ہے۔ اس حرف کا مخصوص دن اور مخصوص وقت پر ورد کرنے سے اللہ اُس شخص پر وسیع رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔

انہی حروف مقطعات میں سے ایک حرف کا ورد کرنے سے کشف حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک طرف یہ حروف تکالیف کا مداوا ہیں تو دوسری طرف یہی حروف اگر مرشد اپنے مرید کو دے تو اس کے مسلسل ورد سے مرید ولایت کے بلند مقام تک پہنچ جائے گا۔ لیکن ان تمام حروف کو پڑھنے کے لیے Prerequisites پورا کرنا شرط ہے اور یہ Prerequisite خیال اور سوچ کی پاکیزگی ہے۔ اس میں بدلہ لینا تو درکنار بدلہ وانتقام کا سوچنا بھی زہر قاتل ہے۔ اس سوچ کو جڑ سے اُکھاڑنا پڑتا ہے تاکہ کسی بھی صورت دل میں انتقام یا بدلہ کا خیال نہ آنے پائے۔ دوسری نقصان دہ چیز جو اپنی ذات سے ختم کرنا پڑتی ہے وہ دشمنوں کا بُرا سوچنا ہے۔ بُرا کرنا تو دور کی بات ہے۔

تیسری چیز جو دل سے اُکھاڑنا پڑتی ہے وہ ہے اپنے حقوق کو Forego کرنا۔ باپ ترکہ چھوڑے، بہن

بھائی حصہ نہ دیں تو فقیر عدالت کا در کھٹکھٹانے کی بجائے خندہ پیشانی سے کہتا ہے "بھائی! کون سا حصہ؟ یہ سب تو آپ ہی کا ہے۔ میرا تو کچھ نہیں۔ میرے لیے تو میرا اللہ ہی کافی ہے۔" پھر ایسے انسان کے لیے رب تعالیٰ اپنے خزانے کھول دیتا ہے۔

جب انسان ان سب باتوں پر عمل کرنے لگتا ہے تو اُس کے خیالات، سوچ اور عمل میں پاکیزگی آ جائے گی۔ یہ پاکیزگی نیکی کی طرف لے جائے گی اور نیکی اختیار کرنے کے بعد جب انسان ان حروفِ مقطعات کا ورد کرے گا تو اُسے کشف حاصل ہو جائے گا۔ لیکن کشف کے حصول کی بنیادی شرط پاکیزگی خیال ہے۔

رہ گیا آپ کا سوال کہ کون سی Activity کرنے سے کشف القبور حاصل ہو جائے گا۔ بابا بلھے شاہ نے تو رقص کر کے رب کو منا لیا تھا۔ میں تو کسی بھی ایسے ہنر سے ابھی نا آشنا ہوں۔ میں تو خود کسی نیک آدمی کی تلاش میں ہوں جس سے فیض حاصل کر کے میں بھی نیک ہو جاؤں۔

سوال: "فلسفہ وحدت الوجود" اور "فلسفہ وحدت الشہود" کیا ہے؟ کیا ابن عربی سے پہلے بھی اس فلسفہ کا وجود تھا؟ کیا علامہ اقبال بھی اس فلسفہ کے قائل رہے؟ کیا اولیا کرام بھی ان فلسفوں پر کاربند تھے؟

جواب: اصل میں رب تعالیٰ نے انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ اس غور و فکر سے بہت سی چیزیں ہم پر عیاں ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات وہ چیزیں اتنی بلند ہوتی ہیں کہ جب ہماری عقل اُن کا احاطہ نہیں کر پاتی تو ہم بھٹکنے لگتے ہیں۔ حالانکہ نکتہ بھی درست ہوتا ہے اور ہم صحیح نتیجہ پر بھی پہنچے ہوتے ہیں۔ لیکن محدود عقل کے باعث ہم بھٹک جاتے ہیں۔

فلسفہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود یوں وجود میں آئے کہ لوگوں نے توحید پر غور و فکر شروع کیا۔ کچھ لوگ اپنے خیالات پر اس قدر مضبوطی سے آگے بڑھے کہ یہاں تک کہنے لگے "اللہ ایک ہے۔ ہر شے اُسی سے ہے اور ہر چیز میں رب بستا ہے۔ ہر چیز اُسی رب کا حصہ ہے۔ اُسی کل کا جزو ہے۔" اُنھوں نے ہر چیز کو رب کا مظہر مان لیا۔ یہ نظریہ وحدت الوجود تھا۔

ایک دوسرے مکتبۂ فکر نے توحید کو یوں سمجھا کہ رب تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں واحد ہے۔ چونکہ تمام تخلیق اُس کی ہے اس لیے اس کی تمام تخلیقات میں اُس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظریہ وحدت الشہود کہلایا۔

محمد ابن عربی کے دُنیا میں آنے سے کافی پہلے یہ فلسفہ وجود میں آ چکا تھا اور اس پر خاصی بحث شروع ہو چکی تھی۔ ابن عربی جب دُنیا میں آئے اور اُنھوں نے اپنی کتاب میں فلسفہ وحدت الوجود پر بحث کی اور اسے ایک تھیوری کا نام دیا تو یہ فلسفہ ابن عربی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ بعد ازاں اس فلسفہ وحدت الوجود پر مسلمانوں میں اختلافات نے جنم لیا اور ان میں بہت زیادہ قتل و غارت گری ہوئی۔

اولیاء کرام خواہ اُن کا تعلق کسی بھی مسلک یا سلسلہ سے ہو کبھی بھی کسی کا خون بہانے پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ صرف سلامتی کے لیے کام کرتے ہیں بغیر اس تفریق کے کہ کوئی ہندو، عیسائی، کافر، یہودی یا مسلمان ہے۔ وہ

سب کے لیے آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے محبت کا سرچشمہ بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ولی اللہ اگر فلسفۂ وحدت الوجود یا وحدت الشہود کو مانتا بھی تھا تو اس نے عموماً اس کا اظہار نہیں کیا۔

اصل میں جب انسان نے اس زمین پر اپنی زندگی کا آغاز کیا تو حضرت آدم علیہ السلام کے اس دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اُس کے اندر حیوانی صفات غلبہ پا گئیں۔ رہا تو وہ انسان ہی لیکن اُس کا مقصدِ حیات صرف اور صرف اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنا رہ گیا جو حیوانی جبلت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد دوسرے پیغمبر تشریف لائے اور اللہ کا پیغام مسلسل آتا رہا۔ یوں انسانی ذہن ترقی کرتا چلا گیا اور کچھ لوگوں نے روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل سے آگے سوچنا شروع کر دیا تاکہ وہ دوسروں سے بہتر نظر آئیں اور Intellectual level کو چھو لیں۔ انسانی ذہنی ارتقا کا یہ عمل یہیں پر رُک نہیں گیا بلکہ زندگی مابعد الموت کا جو تصور اللہ نے دیا تھا، انسان اُس تصور پر کام کرنے لگا۔ یوں انسان کی Requirements تین سانچوں میں ڈھل گئیں۔

1۔ Physical requirement (جسمانی ضرورت)

2۔ Intellectual requirement (ذہنی ضرورت)

3۔ Spiritual requirement (روحانی ضرورت)

ان تینوں Requirements کو ایک ساتھ لے کر چلنے والا شخص ہی مسلمان ہے۔ Intellectual Level میں داخل ہونے کے بعد انسان کو اپنی صلاحیتوں کا ادراک ہوا اور اُس میں حرص پیدا ہو گئی۔ حرص کی دو بڑی اقسام ہیں۔

1۔ مادی حرص

2۔ Intellectual حرص

انسان میں Intellectual حرص مادی حرص کی نسبت زیادہ ہے۔ اس حرص کی وجہ سے انسان نے چاہا کہ وہ دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرے۔ جوں جوں انسان اپنی Intellectual حرص میں آگے بڑھا اُس کی زندگی کا انداز بدلتا چلا گیا۔ اللہ کے پیغمبر کے ذریعے انسان کی ذہنی سطح کے مطابق مختلف Parameters انسانوں تک پہنچتے رہے حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ انسان Intellectual virtues کی طرف راغب ہوا۔ اُس کے اندر یہ احساس جاگا کہ مجھے سچ بولنا ہے۔ کسی کو دغا نہیں دینا۔ لوگوں کے کام آنا ہے۔ دھوکا دہی، چوری، بددیانتی سے بچنا ہے۔ یہ سب Virtues ہیں Systems نہیں ہیں۔ انسان جب ان Virtues کی طرف گیا تو اُس میں Sense of righteousness پیدا ہوئی۔ جس نے انسان میں احساسِ برتری کو جنم دیا اور یہ احساسِ برتری بعد ازاں Arrogance میں بدل گیا۔ اس Arrogance نے انسان کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا۔

اولیائے کرام نے اس تباہی سے سبق سیکھا اور اللہ کے حکم اور اپنے تجربہ کی روشنی میں وہ تکبر سے دور ہو گئے۔ جونہی وہ تکبر سے دُور ہوئے تو اُنھوں نے اللہ کے بارے میں ایک نیا تصور دریافت کیا کہ رب تعالیٰ محتاج نہیں کہ ہم پر رحمتیں نازل فرمائے۔ بلکہ یہ اُس کی شان رحیمی و کریمی ہے کہ وہ جس پر جس قدر چاہے رحمتیں نازل فرمادے۔ تب انسان کو یہ بات سمجھ آئی کہ یہ جو میں Righteousness کے چکر میں پڑا ہوں یہ چیز تو مجھے تباہی کی طرف لے جائے گی۔ اس ادراک کے بعد انسان نے گناہ و ثواب سے بالاتر ہو کر رب کی اطاعت اور عبادت کا آغاز کیا۔ جن لوگوں نے محض اس سوچ کے تحت رب کی عبادت کی کہ میرا رب لائق عبادت ہے اور اُنھوں نے اللہ کے مقرر کردہ Dos اور Do nots پر عمل کیا۔ اُن پر جب اللہ کی رحمتیں ہوئیں تو عام آدمی ورطہ حیرت میں پڑ گیا اور ایسے لوگوں کو اولیاء اللہ کہنے لگا۔

اولیاء اللہ انسانوں کا وہ گروہ ہیں جو اجر و ثواب سے بالاتر ہو کر رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ یوں وہ فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود سے دُور رہتے ہیں۔ کوئی ولی اللہ ایسا نہیں جو اس فلسفہ سے Govern ہوتا ہے۔

رُوحانیت میں مردِ کامل وہ ہے جو ہمہ وقت علم کی تلاش میں رہتا ہے۔ ان اولیاء اللہ نے ان فلسفوں کو علم کی حد تک تو ضرور جانا لیکن وہ اس سے Govern نہیں ہوئے۔ اُن کا مذہب تو رب تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت تھا۔ آج بھی اولیا کا مسلک اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت اور Absolute submission ہی ہے۔ اس لیے کسی بھی ولی اللہ کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ان فلسفوں میں سے کسی پرکار بند رہے۔

علامہ اقبال ابتدا میں فلسفہ وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن بعد ازاں جوں جوں اُن کی ذہنی گرہیں کھلتی چلی گئیں وہ ان مسلکوں اور فلسفوں سے بالاتر ہوتے چلے گئے۔

سوال: کیا قربِ الٰہی کا حصول 'فلسفہ وحدت الوجود' یا 'فلسفہ وحدت الشہود' کی بنیاد پر ممکن ہے؟

جواب: قربِ الٰہی تو اللہ کی غیر مشروط اطاعت سے ہی ممکن ہے۔ اللہ کی غیر مشروط اطاعت اور اُس کے بندوں کی بھلائی کا خیال اور اس کے لیے کوشش...... یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو جائیں تو قربِ الٰہی یقینی طور پر انسان کو مل جاتا ہے۔

سوال: سکھوں میں کیا فریدی سکھ بھی ہوتے ہیں؟

جواب: سکھوں کے گرو بابا نانک آپ ﷺ کے عاشق تھے اور اُنھوں نے اپنے انداز میں حج بھی کیا تھا۔ بابا صاحب کے ماننے والوں کی اکثریت حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دیتی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بابا فرید صاحب کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ فریدی لگاتے ہیں۔ ورنہ یہ کوئی فرقہ یا سلسلہ نہیں ہے بلکہ محض بابا صاحب سے عقیدت کی وجہ سے وہ فریدی سکھ کہلاتے ہیں۔

سوال: تنگ دستی اور مشکل میں مبتلا لوگوں کو آپ ﷺ نے عقیق، نیلم یا کوئی دوسرا پتھر پہننے کا حکم دیا۔ کیا قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ذکر ہے؟

جواب: ہمارے اسلاف خصوصاً صحابہ کرامؓ اپنے عقیدہ اور مذہب و مسلک میں اتنے مضبوط تھے کہ انھوں نے کبھی ایسی چیزوں کا سہارا نہیں لیا۔ شاید دو یا تین مثالیں ایسی ہیں پوری مکی و مدنی زندگی میں جہاں دو یا تین صحابہؓ نے آپ ﷺ سے اپنی تنگ دستی کا ذکر فرمایا۔ ورنہ صحابہ کرامؓ کبھی زبان پر یہ بات نہ لائے کہ وہ فاقہ زدہ یا تنگ دست ہیں۔ حالانکہ یہ وہی صحابہ تھے جو کئی کئی دن تک کھانا نہ کھا پاتے تھے۔ غزوہ خندق کے موقع پر خود آپ ﷺ نے اپنے پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے تھے۔ آپ ﷺ یا صحابہ کرام نے کبھی کسی کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ فاقہ سے ہیں کیوں کہ اُن کے نزدیک یہ رویہ ناشکر گزاری کے مترادف تھا۔ یہ تو ہم کم ظرف لوگ ہیں جو ذرا سی مشکل میں چلا اُٹھتے ہیں اور جگہ جگہ دُعا کے لیے جاتے اور منتیں مانتے ہیں۔ ذرا سوچیں کیا ہم صحابہؓ کرام سے زیادہ افلاس زدہ ہیں؟ کیا ہمارے حالات اُن سے زیادہ دشوار ہیں؟ کیا ہماری زندگی صحابہ کرام کی زندگی سے زیادہ تلخ ہے؟

آپ ﷺ نے عقیق بہت شوق سے پہنا ہے۔ حضرت علیؓ بھی عقیق پہنتے تھے۔ لیکن اس کے پیچھے رزق، عزت یا تخت کے حصول کا خیال نہ تھا۔ کیوں کہ اس نظریہ سے پتھر پہننا شرک ہے۔

اگر کسی چیز کو صحابہ کرام نے بابرکت کہا بھی ہے تو اس سے مراد رزق کی کشادگی نہ تھی کیوں کہ رازق اور مشکل کشا تو صرف رب تعالیٰ ہے۔ پتھر بے جان چیز ہے۔ کسی ولی یا اوتار کی بھی یہ مجال نہیں کہ رب کی مرضی کے بغیر وہ کسی کی سفارش کر دیں۔ یہ رب ہی ہے جو کسی کو کچھ عطا کرنا چاہے تو کسی میں طاقت نہیں کہ اُسے روک دے اور اگر اللہ کسی کو کچھ عطا نہ کرنا چاہے تو کسی کی مجال نہیں کہ اُسے مجبور کر سکے۔

البتہ ان پتھروں کو پہننے اور بابرکت سمجھنے کی سائنسی توجیہہ ضرور موجود ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل رنگوں سے علاج کا طریقہ موجود تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہندوؤں کے گھروں کے لاؤنج یا لونگ روم میں رنگین شیشے لگے ہوتے تھے۔ ہوتا یہ ہے کہ سورج کی شعاعیں جب ان رنگین شیشوں سے گزرتی ہیں (یہ تو آپ جانتے ہیں کہ سورج کی شعاعیں سپیکٹرم ہیں اور اس سپیکٹرم میں سات رنگ ہیں) جب ایک رنگ سے وہ شعاعیں گزرتی ہیں تو اس مخصوص رنگ کے علاوہ باقی شعاعیں Absorb ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص روزانہ ان شیشوں کے سامنے بیٹھے گا تو ایک مخصوص رنگ کی شعاعیں اُس پر پڑیں گی جس سے انسانی جسم کی Anatomy پر اثر پڑتا ہے اور انسانی کیمسٹری بدلنے لگتی ہے۔

ہندو ویدوں اور حکیموں نے رنگوں سے علاج کا یہ طریقہ متعارف کرایا تھا۔ جیسے کینسر کے مریض کو نیلے رنگ کے شیشوں والے کمرہ میں روزانہ تین گھنٹے بٹھایا جاتا تو وہ ٹھیک ہو جاتا تھا (لیکن خدارا! کہیں آپ اس پر عمل نہ کیجیے گا کیوں کہ اس کے لیے مکمل معلومات اور علم کا ہونا ضروری ہے۔)

علم لدنی تمام علوم کی ماں ہے اور یہ تمام علوم کا احاطہ کرتا ہے۔ علم لدنی جاننے والا شخص دیگر تمام علوم سے بھی Gradually واقف ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہمارے ایک عزیز Staunch قسم کے اہل حدیث ہیں۔ حیرت تو مجھے اُس روز ہوئی جب اُنھوں نے میرے پاس آ کر بڑے شاہ صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بڑے شاہ صاحب سے اجازت لینے کے بعد میں اُنھیں وہاں لے گیا۔ اور اُنھیں وہاں بٹھا کر مخل ہونے کے ڈر سے وہاں سے چلا آیا۔ مرشد صاحب سے بھی اس موضوع پر بات نہ ہوئی۔ مرشد صاحب کے وصال کے بعد جب میں اُن کی جگہ پر بیٹھنے لگا تو میرے وہی عزیز میرے پاس آ کر کہنے لگے کہ آپ کے مرشد صاحب بہت اچھے انسان تھے۔ بہت سے اولیائے کرام نے کہا ہے کہ وہ جاتے ہوئے کچھ ساتھ لے کر نہیں گئے بلکہ سب کچھ آپ کو عطا کر گئے ہیں۔ میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ وصال سے تین ساڑھے تین ماہ قبل ہی اُنھوں نے سب کچھ مجھے عطا کر دیا تھا۔" تب اُنھوں نے Disclose کیا کہ وہ کافی مہینے بڑے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے تھے اور اُن سے اصرار کرتے رہے تھے کہ وہ اُنھیں سونا بنانے کا طریقہ بتا دیں۔ اُن کے اصرار پر آخر کار بڑے شاہ صاحب نے اُنھیں ایک رات سونا بنانے کا طریقہ سکھانے کے لیے بلا لیا۔ اگلی رات جب یہ صاحب گئے تو بڑے شاہ صاحب مختلف چیزیں اُٹھا اُٹھا کر ہیٹر (Heater) پر موجود سٹیل کے Bowl میں ڈالتے رہے۔ کچھ دیر بعد اس میں سونا تیار ہو چکا تھا۔ مرشد صاحب نے اُن سے کہا کہ چیک کرلو۔ سونا اصلی ہے یا نقلی۔

جب اُنھوں نے دیکھا تو وہ اصلی سونا تھا۔ تب مرشد صاحب نے سٹیل کا وہ برتن دوبارہ Heater پر رکھ دیا۔ جب اُس میں موجود سونا مائع میں تبدیل ہو گیا تو اُنھوں نے اُٹھا کر اُسے نالی میں بہا دیا۔ یہ صاحب سر پیٹنے لگے کہ یہ کیا کیا آپ نے۔ تب مرشد صاحب نے فرمایا "میاں! اس کی اہمیت بس اتنی ہے کہ یہ نالی میں بہہ جائے۔"

یہ سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد میرے اُن عزیز نے کہا کہ بڑے شاہ صاحب اپنا سارا علم آپ کو عطا کر گئے ہیں اب آپ مجھے سونا بنانے کا نسخہ بتا دیجیے۔ میں نے جواب دیا "جو کام میرے مرشد صاحب نے نہیں کیا وہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔"

بات یہ ہے کہ علم لدنی تمام علوم کی ماں ہے اور اسی علم لدنی کے حصول کی راہ میں بہت سے مقامات پر انسان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ تو پیسے کمانے کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اہل فقر دُنیا سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

شعور و لاشعور کے انسانی رویّوں پر اثرات

سوال: انسان کے اندر شعور اور لاشعور کیا کردار ادا کرتے ہیں؟ اس کے اثرات ہماری سوچ پر کیا مرتب ہوتے ہیں؟ جب ہماری سوچ شعور اور لاشعور سے متاثر ہوتی ہے تو اس کے ہمارے عمل پر کیا اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے انسانی ذہن کو بے پناہ قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ انسانی ذہن تین جہتوں میں تقسیم ہے۔

1۔ قوت تخیل

2۔ قوت ادراک

3۔ قوت حافظہ

شعور اور لاشعور دونوں دراصل نفسیات کی اصطلاحات ہیں۔ قوت ادراک کو نفسیات نے شعور کا نام دیا ہے اور قوت حافظہ کے ایک حصہ کو لاشعور کہا ہے۔

قوت حافظہ دو حصوں میں منقسم ہے۔

1۔ مختصر المیعاد یادداشت (Short-term Memory)

2۔ طویل المیعاد یادداشت (Long-term Memory)

طویل المیعاد یادداشت کے آگے ایک Process ہے۔ اس Process میں جو یادیں، غیر آسودہ تمنائیں یا سوچیں چلی جاتی ہیں یا ایسی خواہشات جو بہت Strong ہونے کے باوجود پوری نہ ہوسکیں اور Long-term memory کے کسی Remote حصہ میں جا بسیں تو ہم اُنھیں لاشعور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شعور قوت ادراک کا نام ہے اور قوت ادراک میں عقل، فہم، دلیل، Logic یہ سب چیزیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ ہم کسی بھی چیز کو جب پرکھتے ہیں تو اُسے Logic، دلیل، سائنس کی تھیوری یا کسی کلیہ، قانون پر پرکھتے ہیں اور پھر نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ممکن ہے، یا ناممکن ہے۔ اسے یوں کیا جائے یا اس طرح نہ کیا جائے۔ یہ سب شعور کے تحت ہوتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ دماغ کا وہ حصہ جو Knowledge سے Influenced ہو کر فیصلہ کرتا ہے، وہ شعور ہے۔ جب کہ لاشعور ہماری اُن سوچوں اور خواہشات سے Process influence draw کرتا ہے جو کسی وجہ سے ناآسودہ رہ گئیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک بچہ جس کے والدین کی مالی حالت

کچھ زیادہ قابلِ رشک نہیں ہے وہ اپنے ساتھی بچوں کو کھلونوں سے کھیلتے دیکھتا ہے۔ اُس کے والدین اُسے کھلونے خرید کر دینے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ لہٰذا وہ اُسے صبر کی تلقین کرتے ہیں اور کسی نہ کسی بہانہ کھلونوں کی طرف سے اُس کی توجہ ہٹا دیتے ہیں۔ بچہ کے اندر کھلونوں سے کھیلنے کی یہ خواہش اس قدر شدید ہے کہ وہ والدین کے کہنے پر اپنی اس خواہش کو کسی طرح Control تو کرے گا لیکن یہ خواہش اُس کے لاشعور میں قوتِ حافظہ کے کسی Remote corner میں چلی جائے گی۔ جب وہ بچہ بڑا ہو کر خود کمانے کے قابل ہوگا تو اُس کے اندر دو قسم کے Reactions جنم لیں گے۔

1۔ وسائل مہیا ہوتے ہی وہ اپنی پسند کے کھلونے خرید کر گھر میں سجائے گا۔

2۔ اگر اُس کی تعلیم و تربیت نے اُسے اس بچگانہ فعل سے روکے رکھا تو شادی کے بعد وہ اپنی پسند کے وہی کھلونے اپنے بچوں کو لا کر دے گا۔

یہ دراصل اُس کی ایک لاشعوری خواہش ہے جس نے اُس کے اعمال و افعال کو متاثر کیا ہے۔

اسی طرح اگر کسی بچے کے سکول کے ساتھی اُس سے زیادہ طاقت ور ہیں یا پھر اُس کے والدین نے اُسے حد سے زیادہ دبا کر رکھا ہے کہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ اس سختی اور بے جا پابندیوں کے باعث بچے کی شخصیت دب کر رہ گئی ہے۔ والدین کی بے جا روک ٹوک اور سختی و جبر کی وجہ سے بچے میں ڈر بیٹھ جائے گا۔ اُس کی شخصیت ختم ہو جائے گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب اُس کے ساتھی اُس کے ساتھ زبردستی کریں گے تو وہ فوراً Surrender کر دے گا۔ Submission میں چلا جائے گا۔ یہ اُس کے نزدیک بچاؤ کا ایک طریقہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ Submission دل سے نہیں ہوتی اس لیے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ٹی وی پر جب وہ کسی طاقت ور شخص کو دیکھتا ہے تو اُسے آئیڈیالائز (Idealise) کرنا شروع کر دیتا ہے۔

والدین کے جبر اور مار پیٹ کی وجہ سے جو خوف اُس بچے کے لاشعور میں بیٹھ چکا ہے اس کی وجہ سے وہ بڑا ہو کر لوگوں کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے گا۔ خواہ اُس کے خیالات کتنے ہی اچھے اور بلند کیوں نہ ہوں Meetings میں وہ اُن کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچائے گا۔ اُس میں اتنی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ کسی کے منہ پر سچ بات کہہ سکے۔ اُس کے لاشعور میں ایک بات بیٹھی ہوئی ہے کہ کوئی ایسا طاقت ور شخص ہو جو اُس کی جگہ لوگوں سے بدلہ لے سکے۔ لہٰذا وہ طاقت ور لوگوں کو دوست بنانا چاہے گا۔ اسلحہ اور گن اُس کے پسندیدہ ہتھیار ہوں گے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ ان کے ذریعے وہ لوگوں کو Empower کرلے گا۔ یہ دراصل لاشعور ہی ہے جو اُس کی زندگی میں کھیل کھیلتا ہے۔

میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ لاشعور، شعور سے زیادہ اہم ہے۔ کیوں کہ لاشعور کے اثرات انسانی زندگی پر دیکھے اور Predict کیے جا سکتے ہیں۔ ایک سائنس دان کا شعور اُس سے کیا حرکت کرائے گا۔ ہم اس کی پیش گوئی کر سکیں گے۔ لیکن لاشعور کو ہم Study نہیں کر سکتے کہ کسی شخص کا بچپن کیسا تھا۔ جب اُس کے دل میں کیا خواہشات پیدا ہوتی تھیں جن کو وہ پورا نہیں کر پایا۔ یہ خواہشات اُس کی زندگی کا رُخ متعین کرتی ہیں۔ کچھ

لوگ اذیت پسند ہوتے ہیں۔ دوسروں کو ذہنی اور جسمانی تکلیف دے کر اور انہیں دُکھ میں دیکھ کر وہ حظ اٹھاتے ہیں۔ انسان کے اس رویہ کے ڈانڈے بھی اُس کے لاشعور سے جا ملتے ہیں۔ بچپن میں ہونے والے جبر کی وجہ سے اُس میں یہ رویہ پیدا ہوتا ہے کہ اب میں مار نہیں کھاؤں گا۔

کچھ لوگ خود اذیتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اذیت لے کر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں Predictable نہیں ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ لاشعور شعور سے زیادہ طاقت ور ہے۔ یہ بہت غیر محسوس طریقہ پر انسانی زندگی کے رُخ موڑتا ہے اور انسانی رویوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

جہاں تک سوال کے اِس حصہ کا تعلق ہے کہ شعور اور لاشعور کے ہمارے عمل پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں تو گزارش ہے کہ انسان Govern ہی شعور اور لاشعور سے ہوتا ہے۔ انہی کے تحت وہ عمل کر رہا ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کے لاشعور کو آپ نے ٹھیک کرنا ہے تا کہ اس کی زندگی Balanced ہو جائے تو اس کے لیے آپ کو کئی ایک Sittings ایسے شخص کے ساتھ کرنا ہوں گی۔

آپ بہت صبر اور خاموشی سے ایسے شخص کو سنتے رہیے۔ اُس کے بچپن کو کریدتے رہیے۔ خصوصاً اُس کی وہ عمر جب وہ ایک سے چار سال کا بچہ تھا۔ عمر کے اس حصہ کے بارے میں اُسے بار بار کریدیئے۔ اُسے بولنے پر مجبور کیجیے۔ کہیں Interrupt نہ کیجیے۔ اُس کی گفتگو سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کون سی چیزیں اُسے Haunt کر رہی ہیں۔ بس ان چیزوں کا سراغ لگا کر انہیں Counter کر دیں۔ یہ کافی Long process (طویل مرحلہ) ہو گا۔ تقریباً چھ سات ماہ اس میں صرف ہو جائیں گے لیکن بالآخر آپ اُس کا لاشعور ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

سوال: کیا پسند کی شادی جائز ہے؟ اگر والدین نہ مانیں کیا تب بھی جائز ہے؟

جواب: اس میں دو چیزیں ہیں۔ ایک تو خالصتاً شرعی حکم ہے کہ اللہ نے انسان کو شادی کرنے کا حق دیا ہے۔ جب تک ایک مرد اور عورت گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول نہ کر لیں، شادی نہیں ہو سکتی۔ نکاح صرف اُسی صورت جائز ہے جب دُلہا دُلہن گواہوں کی موجودگی میں اپنی زبان سے ایجاب و قبول کریں یا پھر کسی کو اس مقصد کے لیے اپنا وکیل مقرر کر لیں جو اُن کی طرف سے ایجاب و قبول کر لے۔ یہ نکاح کا شرعی طریقہ ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب والدین اپنے بچوں کی شادی کرتے ہیں تو حکم یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور والدین آزادانہ اُن کی پسند معلوم کر لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے ہم کفو یا ہم پلہ رشتوں پر زور دیا ہے۔

آپ ﷺ نے ایک مرتبہ ہم پلہ نہ ہونے کے باعث ایک رشتہ ختم کروا دیا تھا۔ ہمارے لیے شریعت کے بعد سب سے زیادہ اہم چیز سنت اور حدیث ہے۔ اگر ہم شرعی احکام اور سنت و احادیث کا مطالعہ کریں تو اس

نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نہ تو لڑکا اور لڑکی والدین کو ایک طرف کر کے شادی کریں اور نہ ہی والدین اولاد کی مرضی جانے بغیر اُن کی شادی کریں۔ اس سلسلہ میں ایک درمیانی راستہ نکالنا ضروری ہے اور وہ ہے باہمی مشاورت اور باہمی رضامندی۔ اگر لڑکے اور لڑکی کی کوئی پسند ہے تو اس میں کوئی بُرائی نہیں۔

محبت جب تک پاکیزہ ہے اور اس میں گناہ کا کوئی عنصر شامل نہیں ہوا تب تک یہ پسندیدہ جذبہ ہے، کوئی جرم نہیں ہے۔ اگر اپنی کوئی پسند ہو تو والدین کو مناسب الفاظ میں بتادینا چاہیے۔ والدین کو بھی چاہیے کہ وہ اولاد کی خواہش کا خیال رکھیں۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اولاد کی یہ خواہش نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے تو طریقے سے انھیں سمجھانے کی کوشش کریں۔ اگر وہ نہ سمجھیں تو اُن کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کی شادی کردیں۔ یہ درمیانی راستہ بہرحال نکالنا پڑتا ہے۔

سوال: پاکستان اور ہندوستان کی کچھ خانقاہوں پر موجود بزرگ، بہت نیک، مستجاب الدعوات اور پاکیزہ عادات و اطوار کے مالک ہوتے ہیں لیکن عموماً وہ شریعت اور نماز کے پابند دکھائی نہیں دیتے۔ اُن سے اس بابت پوچھا جائے تو کہتے ہیں ہم جودم غافل سودم کافر کے فلسفہ پر عمل پیرا ہیں۔ کیا رُوحانیت میں ایسا کوئی مقام ہے؟ یا یہ مقامِ عشق ہے؟

جواب: میں اس سوال کے جواب میں حضرت بایزید بسطامی کو Quote کرنا چاہوں گا۔ آپ نے فرمایا:۔

''وہ شخص رُوحانیت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکتا جس نے ایک بھی سنت ترک کی۔''

نماز سے معافی سوائے فاترالعقل کے کسی کو نہیں۔ ایسا شخص جو ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا اُس کے علاوہ نماز کسی کو معاف نہیں۔

حضرت غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شیطان فرشتہ کے روپ میں آکر بولا ''رب تعالیٰ نے آپ کی عبادات سے خوش ہو کر آپ کو نماز معاف فرمادی ہے۔'' حضرت غوث اعظم نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر فوراً لاحول ولا قوۃ پڑھی اور کہا ''دفع ہو جاؤ مردود۔ جس چیز کی معافی اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دی وہ مجھے کیسے معاف ہوسکتی ہے۔'' تب شیطان نے اگلا وار کیا اور کہا ''شکر کریں آپ کے علم نے آپ کو بچالیا۔'' تب آپ نے دوبارہ لاحول ولا قوۃ پڑھی اور فرمایا ''دُور ہو جا۔ مجھے میرے علم نے نہیں، میرے رب نے بچایا ہے۔''

نماز کی معافی کسی کو نہیں۔ یہ تو سیدھا سا مسئلہ ہے۔ لیکن بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ چونکہ نمازوں کے اوقات کافی کھلے ہوتے ہیں جیسے نماز ظہر کا وقت تقریباً عصر کی اذان ہونے تک رہتا ہے اور کچھ فقرا میں مہمانوں کا احترام اس قدر ہوتا ہے کہ وہ احتراماً اپنے مہمان سے یہ نہیں کہتے کہ میں نماز ادا کرلوں لیکن وہ اپنی گھڑی پر نظر رکھتے ہیں اور مہمانوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ اُن کی نماز قضا ہو رہی ہے۔ مہمانوں کے

رخصت ہوتے ہی وہ نماز ادا کر لیتے ہیں۔ چونکہ وہ وقت کے اندر نماز ادا کر لیتے ہیں اس لیے ان کی نماز قضا نہیں ہوتی۔ اسی طرح عصر کی نماز سورج غروب ہونے سے پانچ منٹ قبل تک بھی ادا کر لی جائے تو وہ قضا نہیں بلکہ ادا تصور ہوگی۔ کچھ اہلِ فقر میں یہ رویہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اہلِ فقر اپنے پاس آنے والے مہمانوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان مہمانوں کی وجہ سے کبھی اُن کی نماز قضا بھی ہو جاتی ہے اور وہ قضا نماز ادا کرتے ہیں۔ چونکہ یہ سب وہ نہایت خاموشی سے کرتے ہیں۔ اسی لیے Distance (فاصلہ) سے دیکھنے والے اس کو جان نہیں پاتے اور غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ شاید یہ اہلِ فقر نماز ادا ہی نہیں کرتے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اُن کے بارے میں بدگمان نہ ہوں۔ اُن کے اس رویہ یا عمل کے باوجود ہم اُن سے نفرت نہیں کر سکتے۔ انھیں بُرا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ ہاں دُعا کر سکتے ہیں "یا اللہ! اپنے جس بندہ کو تُو نے اتنی خوبیاں بخشی ہیں اس کو یہ توفیق بھی بخشش دے کہ وہ نماز کا پابند ہو جائے۔"

لیکن یہ دُعا ہم تنہائی میں کریں یہ سوچ کر کہ کسی کے سامنے اس کی توہین نہ ہو۔ کیوں کہ مسلمان کسی کی توہین نہیں کرتا بلکہ وہ ہمیشہ دوسروں کی عزت کا خیال رکھتا ہے۔

سوال: رجال الغیب سے کیا مراد ہے؟ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اگر رجال الغیب کے بارے میں علم نہ ہو تو چلہ کی برکات حاصل نہیں ہوتیں۔ کچھ صاحبان سے اس بابت سوال کیا جائے تو اُن کا جواب ہوتا ہے ابھی وقت نہیں آیا۔

جواب: رجال الغیب کے بارے میں سمجھا دینا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمارے ہاں Management میں ایک چیز کہی جاتی ہے کہ اپنے سٹاف کو صرف اُتنی معلومات دیں جتنی ضروری ہیں۔ بہت زیادہ انفارمیشن انسان کو Confuse کر دیتی ہے۔ پڑھاتے وقت بھی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اپنے Students کو ہم اُتنی زیادہ معلومات فراہم نہ کر دیں کہ وہ معلومات کے جنگل میں ہی بھٹکتا رہے اور اُس کا ذہن چیزوں کے بارے میں Clear ہی نہ ہو پائے۔

ایک زمانہ میں ایک سال تک میں برمنگھم یونیورسٹی میں بطور Visiting Faculty Member لیکچر دیتا رہا۔ میں تعلیم یافتہ تو ہوں نہیں لیکن وہاں لوگوں نے مجھے پڑھا لکھا سمجھ کر لیکچر کے لیے کلاس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ میرا نفس خوش ہو گیا کہ لوگوں نے مجھے پڑھا لکھا سمجھا ہے لیکن میرا ضمیر مجھے اُکساتا رہا کہ میں انھیں بتا دوں کہ میں تعلیم یافتہ نہیں ہوں۔ لیکن میں اس کے باوجود لیکچر دیتا رہا اور تب وہاں ایک لطیفہ ہوا کرتا تھا Management پر لیکچر دیتے ہوئے۔ Foreigners، انڈینز (Indians)، پاکستانی ہر قسم کے طالب علم کلاس میں ہوتے۔ اب Management کی تو مجھے الف ب بھی نہیں آتی تھی نہ اس کی سوجھ بوجھ تھی۔ لہٰذا کرتا میں یہ تھا کہ جب Management پر عبور رکھنے والے کسی شخص کے پاس میں بیٹھتا تو ذرا سی سوئی چبھوتا اور یوں بات اس موضوع پر چل نکلتی اور میں اس طریقے سے حاصل ہونے والا علم اور معلومات لیکچر میں Deliver کر دیا کرتا اور اس کے بعد مختلف قصے کہانیوں کے ذریعے طالب علم کو دُنیا کی سیر کرا دیتا۔ اس کا

نتیجہ حیران کن نکلا اور میں اُس یونیورسٹی کے First line Lecturers میں شمار ہونے لگا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ Grading میں میں First Line کیسے آ گیا۔ معلوم ہوا کہ میرا انداز لیکچر Students کے Clear Concepts کو Clear کرنے کا سبب بنا تھا۔

مثال کے طور پر اگر میں نے Marketing میں Price Theory پڑھانی ہوتی یا Customer behaviour کے موضوع پر بات کرنا ہوتی تو میں لیکچر کے دوران موضوع کو انسانی نفسیات کے ساتھ Relate کر دیتا تھا کہ Customer کیسے Behave کرے گا۔ اُس کا Reaction کیا ہو گا اور ہم اُسے کیسے Counter کر سکیں گے۔ یوں Students بہت آسانی سے Customer behaviour سمجھ جاتے تھے۔ اسی طرح Product کا Life cycle پڑھاتے ہوئے میں انسانی Life cycle کی طرف چلا جاتا تھا۔ انسانی جسم کے نئے بننے والے اور مر جانے والے Cells کی مثالیں بیان کرتا۔ غصہ کے عالم میں مختلف Chemicals جو ہماری Body سے Release ہوتے ہیں۔ مختلف Toxins جو ہمارے جذبات کے نتیجہ میں جسم میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کی مثال دینے کے بعد اور ساری کہانی بیان کرنے کے بعد آخر میں ایک جملہ بول دیا کرتا کہ یہی حال Product کا ہے۔

لہٰذا معلومات کے جنگل میں ہم کسی کو نہ لے جائیں بلکہ ایک Measured dose دیں۔

وظائف کے بارے میں ہم پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ ہم وظائف کرتے کیوں ہیں؟ یہ بھی دراصل رب تعالیٰ کو یاد کرنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔ لیکن جب ہم کسی چیز کو ایک مخصوص تعداد میں مخصوص وقت میں پڑھتے ہیں تو وہ وظیفہ ہو جاتا ہے۔

قرآن کے ہر لفظ پر فرشتے مامور ہیں۔ جتنا زیادہ کسی لفظ کا وزن اور Strength ہے اس پر اُسی قدر زیادہ فرشتے مامور ہیں۔ وہ لفظ ہی ان فرشتوں کی غذا ہے۔ چونکہ وہ لفظ اُن فرشتوں سے متعلق ہے اسی لیے وہ فرشتے اس لفظ کو سن کر خوش ہوتے ہیں۔ جب کوئی انسان اس لفظ کو باقاعدگی سے پڑھنے لگتا ہے تو فرشتے باقاعدگی سے وہاں آنے لگتے ہیں۔ مثلاً فرض کیجیے کہ آپ عصر کی نماز کے بعد "اللہ الصمد" کا وظیفہ کرتے ہیں۔ یہ بہت Powerful ورد ہے۔ اور کچھ مخصوص فرشتوں کی رُوحانی غذا بھی ہے۔ وہ فرشتے وقت عصر وہاں آکر بیٹھنے لگتے ہیں۔ باقاعدگی سے وہ لفظ چند روز پڑھنے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ جیسے آپ کے اردگرد کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ اگر کسی روز ناغہ ہو جائے تب بھی فرشتے اس ورد کو سننے کے لالچ میں وہاں آ کر انتظار کریں گے۔ اگر کوئی شخص طویل عرصے سے وہ ورد کر رہا ہے اور ایسے میں کسی روز وہ ناغہ کر دے تو متعلقہ فرشتے آ کر واویلا کر دیں گے کہ اُسے پڑھو۔

ایک ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ میں ایک پرائیویٹ انڈسٹریل گروپ کے لیے کام کر رہا تھا۔ دفتر کی طرف سے جو گاڑی ملی وہ جہازنما تھی بہت بڑی۔ ذاتی گاڑیاں بھی تھیں۔ (ذاتی گاڑی کا ذکر اس لیے کیا کیوں کہ اس کا واقعہ کے ساتھ تعلق ہے۔) عید قریب تھی۔ ہمارے چیف اکاؤنٹنٹ میرے پاس آئے اور

کہنے لگے کہ عید پر مجھے اپنی فیملی کے ہمراہ دوسرے شہر جانا ہے۔ میری گاڑی چھوٹی ہے اور فیملی بڑی ہے۔ آپ کے پاس ذاتی گاڑیاں بھی ہیں۔ اگر آپ اپنی دفتری گاڑی مجھے اُدھار دے دیں تو میں فیملی کو آرام سے اس میں دوسرے شہر لے جاؤں گا۔ میں نے کہا "او کے۔ فائن۔ آپ ضرور لے جایئے وہ گاڑی۔" اب یہ وہ گاڑی تھی جو گزشتہ 3,4 سال سے میرے زیرِ استعمال تھی۔ میں عموماً اسی میں سفر کرتا اور Tours پر جاتا تھا۔ راستہ میں اگر نمازِ ظہر کا وقت ہو جاتا تو میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے نماز ادا کر لیتا اور وظائف و تسبیح بھی کر لیتا۔ عید کا اگلا دن تھا۔ میں اُن دنوں عموماً دوپہر کی عبادت ڈیڑھ بجے سے تین بجے تک کیا کرتا تھا۔ عید کی وجہ سے ملاقاتوں کی آمد و رفت کے باعث میں اپنے ڈیڑھ بجے والے وظائف میں Late ہو گیا۔ چیف اکاؤنٹینٹ جو میری گاڑی لے کر گئے تھے جب واپس آئے تو کہنے لگے۔ "یہ گاڑی کیا چیز ہے؟" میرے استفسار پر بولے۔ "ہمارا تو دم نکلا ہوا ہے۔ عید کے دوسرے روز جب ہم اس میں سفر کر رہے تھے تو دو بجے کے قریب جب گاڑی فل سپیڈ (Full Speed) پر تھی 140 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی اس گاڑی کی پچھلی سیٹ کے بائیں طرف کے شیشہ پر اچانک Knocking شروع ہو گئی۔ (یاد رہے کہ میں اس گاڑی میں سفر کے دوران پچھلی سیٹ پر لیفٹ سائیڈ پر بیٹھتا تھا۔) ہم سارے لوگ حیران تھے چلتی گاڑی پر کون ایسا کر رہا ہے۔ دستک ہوتی تھی لیکن کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔" چیف اکاؤنٹینٹ کی یہ بات سن کر مجھے یاد آیا کہ دراصل وہ موکلات اور فرشتے تھے جو عید کے اگلے روز میری عبادت میں تاخیر کے باعث اُس گاڑی کا شیشہ Knock کر رہے تھے۔

میرے گھر میں بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ میں کبھی پڑھائی میں Late ہو جاؤں تو موکلات ہنگامہ کر دیتے ہیں۔ فرشتے اور موکلات اپنے مخصوص وقت پر عبادت کے لیے مخصوص جگہ پر آ بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ پڑھائی میں Late ہو جائیں تو وہ آپ کو آوازیں پیدا کر کے توجہ دلائیں گے "پڑھو، پڑھو۔" اگر آپ باقاعدگی سے کوئی وظیفہ یا ورد کرتے ہیں تو وہ آپ کو دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ جس کمرہ میں انسان مسلسل پڑھائی کرتا ہے وہاں وہ رہائش پذیر نظر آتے ہیں۔ اب آپ اُنھیں رجال الغیب، فرشتے یا موکل...... کچھ بھی کہہ لیجیے۔

بزرگانِ دین جب وظائف کیا کرتے تھے تو اس کے پیچھے اُن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اللہ کی یاد میں محو ہو جائیں اور دُنیا سے کٹ جائیں۔ جب وہ وظیفہ پڑھ رہے ہوں تو اُن کی لو صرف اللہ تعالیٰ سے لگی ہو اور وہ دُنیاوی اُمور فراموش کر دیں۔ پرانی خانقاہوں میں آپ کو زمین دوز کمرے ملیں گے۔ خانقاہوں میں تہ خانہ قدرے بڑا اور گہرا ہوتا ہے۔ اس کمرہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آنے جانے والوں کے قدموں کی چاپ اور گفتگو پریشان نہ کرے اور مکمل یک سوئی کے ساتھ رب تعالیٰ کے ساتھ لو لگی رہے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ کچھ عرصہ تو عبادات تنہائی میں بیٹھ کر اور لوگوں سے کٹ کر کرتے ہیں لیکن جب وہ عبادت میں اعلیٰ درجہ کی یک سوئی حاصل کر لیتے ہیں تو اپنی اس یک سوئی کو آزمانے کے لیے لوگوں سے کہتے ہیں کہ جب ہم وظیفہ کر رہے ہوں تو

ہمارے پاس بیٹھ کر گفتگو کرنا۔ اس طریقہ سے دراصل وہ اپنا تجزیہ کر رہے ہوتے ہیں کہ اُن کی اللہ کے ساتھ کس درجہ کی لو لگی ہے۔ یہ مشق کرنے کے بعد وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ جب میں عبادت کروں تو اُونچی آواز میں شور کرنا۔ جب یہ شور بھی اُن کی یک سوئی پر اثر انداز نہیں ہوتا تو اگلے مرحلہ میں وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ جب ہم وظیفہ کر رہے ہوں تو ہمارے پاس کھڑے ہو کر ڈھول بجانا۔ اور ہوتا یہ ہے کہ ڈھول کی آواز سے بھی اُن کی یک سوئی میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا۔ یاد رہے کہ جس قدر اعلیٰ درجہ کی یک سوئی ہو اُسی قدر جلد اللہ کی قربت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اُسی قدر انسان دُنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

جسمِ انسانی پر رُوحانی بیماریوں کے اثرات

سوال: اسم اعظم جلالی ہے یا جمالی؟

جواب: در حقیقت اسم اعظم مختلف حروف مقطعات کا مجموعہ ہے۔ یہ اللہ کا ایسا نام ہے جس میں تمام کے تمام حروف، حروفِ مقطعات میں سے ہیں۔ یہ 13 اسما ہیں جن میں سے چار حروف جلالی ہیں اور نو حروف جمالی ہیں۔ لہٰذا ہم قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے ہے کہ اسم اعظم جلالی ہے یا جمالی۔ ہم اسے معتدل کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اسم اعظم میں جلالی اور جمالی دونوں ہی صفات پائی جاتی ہیں اور دونوں صفات کے مجموعہ سے بننے والا اسم اعظم معتدل ہو جائے گا۔

سوال: روضہ اور مزار میں کیا فرق ہے؟

جواب: وہ تمام قبور جن میں اولیائے کرام آرام فرما ہیں، اُنھیں ہم عقیدتاً مزار کہتے ہیں جب کہ روضہ کا لفظ اہل بیت کی ابدی آرام گاہوں سے منسوب ہوگیا۔ جہاں وہ آرام فرما ہیں اُن مقامات کو روضہ کہا جاتا ہے۔

سوال: حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی آل پر جن رحمتوں اور برکتوں کا ذکر ہے، وہ کیا تھیں؟

جواب: اللہ کے نزدیک دُنیاوی مال و زر کی اہمیت مری ہوئی گلی سڑی بکری کے ایک بال کے برابر بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر دُنیاوی مال و زر کی کوئی حیثیت ہوتی تو وہ اپنے مقربین جن کے امام آپ ﷺ ہیں کو دُنیاوی مال و زر سے ضرور نوازتا۔ لیکن عجیب اتفاق یہ ہے کہ دُنیا میں تشریف لانے والے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے ایک فی صد کو بھی دُنیاوی مال و زر عطا نہیں ہوا۔ تقریباً سبھی دُنیاوی طور پر تہی دست رہے۔ تمام پیغمبروں میں کچھ چیزیں مشترک ہیں۔ اکثر پیغمبر پیدائش سے پہلے یتیم ہوگئے یا پیدائش کے فوراً بعد یتیم ہوگئے یا پھر By force یتیم ہوگئے۔ یوں حالتِ یتیمی میں اُن کی پرورش ہوئی۔ اکثر پیغمبروں کی والدہ اُن کے بچپن میں ہی داغِ مفارقت دے گئیں۔ اکثر انبیا دُنیاوی لحاظ سے تہی دست رہے۔ بھی پیغمبر دُنیاوی تعلیم سے آراستہ نہیں تھے۔ بھی پیغمبر خلقِ خدا کے ہاتھوں تنگ کروائے گئے۔ سب پیغمبر اعلانِ نبوت کے بعد عروج کو پہنچے۔

غور کیا جائے تو انبیاء کرام میں ان تمام Common Factors کا ہونا بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ دُنیا بہت ظالم ہے۔ ایسے بچے جن کے سر پر اُن کے والد نہیں ہوتے، اُن کے ساتھ زیادتیاں بھی بے تحاشا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اللہ کا علم، علم لدنی یا علم باطنی صرف اُس وقت عطا ہوتا ہے جب انسان کے دل میں گداز پیدا ہو جائے یہ گداز صرف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب لوگ اُس انسان پر زیادتیاں اور جبر کرتے ہیں اور ان زیادتیوں اور جبر کا یا تو وہ انسان Willingly جواب نہ دے یا پھر حالات کے جبر کے تحت جواب نہ دے سکے اور عالم بے بسی میں اندر ہی اندر کڑھتا رہے۔ جب انسان کا دل ہر لمحہ اندر ہی اندر دُکھ کے مارے پھٹتا ہے اور اس عمل سے وہ بار بار گزرتا ہے تو اُس کے اندر گداز پیدا ہو جاتا ہے اور اس گداز کے نتیجہ میں اُس کے دل میں علم باطنی جگہ لے لیتا ہے کیوں کہ گداز دل پر جب چوٹ لگتی ہے تو وہ بے اختیار رب تعالیٰ کو پکارتا ہے۔ جب دُکھے دل سے رب تعالیٰ کو بندہ پکارتا ہے تو اُس پکار میں خلوص ہوتا ہے اور اس پُر خلوص پکار کے جواب میں اللہ تعالیٰ بندہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اُسے علم باطنی اور علم لدنی کی صورت میں بہترین چیز عطا کرتا ہے۔ جوں جوں انسان کا دل زیادہ کڑھتا ہے وہ اللہ کو زیادہ شدت اور خلوص سے پکارتا ہے اور یوں اُسے علم حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس طرح زمین میں جتنا گہرا ہل چلایا جائے گا، جتنی گہرائی سے اُسے پھاڑا جائے گا اُس میں بویا گیا بیج اُتنا ہی زیادہ پھل اور فصل دے گا۔ بالکل اسی طرح دل جتنا زیادہ دُکھی ہوگا اور خود پر جبر کرے گا علم اُتنا ہی زیادہ حاصل ہوگا۔ پیغمبروں کو چونکہ ایک بہت بڑے مقصد کے لیے تیار کیا جانا مقصود ہوتا تھا اس لیے پیغمبر بچپن میں ہی بے یار و مددگار ہو جاتے، وہ دُنیا کی ٹھوکریں کھاتے، دُنیا کے ظلم و جبر اور زیادتی کی وجہ سے اُن کا دل دُکھی رہتا اور وہ رب کی طرف راغب رہتے۔ یوں علم کے حصول کی راہ ہموار ہو جاتی۔ پیغمبروں کے بالکل ابتدائی عمر میں یتیم و یسیر ہونے کے پیچھے یہی حکمت کارفرما تھی۔

دُنیاوی لحاظ سے غیر تعلیم یافتہ یا اُمی مطلق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر انبیاء کسی دُنیاوی انسان سے علم سیکھیں گے تو چونکہ انسان اپنے علم اور عقل میں بطور انسان ناقص ہوتا ہے کیوں کہ انسان خطا کا پتلا ہے اور زندگی میں انتہائی نیک و پارسا ہونے کے باوجود وہ کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کرتا ہے۔ پیغمبر کا ہر فعل چونکہ دلیل بن جاتا ہے اس لیے اُس کی غلطی بھی تمام اُمت کے لیے دلیل بن جائے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو دُنیاوی اُستادوں اور اُن کے ناقص علم سے دُور رکھتا ہے۔ وہ اُنھیں وحی کے ذریعے تعلیم دیتا ہے۔ ایک ایسا علم عطا کرتا ہے جو ہر غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ یوں اُمت اس دلیل سے محفوظ رہتی ہے کہ یہ غلطی تو ہمارے پیغمبر نے بھی کی تھی اس لیے یہ غلطی نہیں بلکہ سنت ہوگئی۔ اُمت کو اس دلیل سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے انبیا کو اُمی رکھتا ہے۔ لیکن اُمی ہونے کے باوجود وہ فہم و فراست میں سب سے بڑھ کر ہوتے ہیں کیوں کہ اُنھیں براہ راست اللہ تعالیٰ سے علم حاصل ہوا ہوتا ہے۔

رب تعالیٰ کے نزدیک دُنیاوی مال و زر کی کوئی وقعت نہیں۔ چونکہ وہ دُنیا کو حقارت سے دیکھتا ہے اس لیے وہ اپنے پیغمبروں کو دُنیا عطا نہیں فرماتا۔ وہ دُنیاوی لحاظ سے عموماً اُنھیں تہی دست رکھتا ہے۔

درودِ ابراہیمی میں جن رحمتوں کا ذکر ہے اُن رحمتوں سے مراد ہے عقل و فراست، علم اور دُنیا میں عزت۔ دُنیاوی مال و زر اس میں شامل نہیں۔ اگر آپ آلِ ابراہیم علیہ السلام کو دیکھیں تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے جو آل چلی اُس میں صرف ایک پیغمبر آپ ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ کو وہ بلند مرتبہ ملا کہ آپ ﷺ امام الانبیا کہلائے۔ یہ بذاتِ خود ایک رحمت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آپ ﷺ کے نسبی دادا ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنا ایک بلند مقام ہے۔ وہ اعلیٰ مرتبت نبی ہیں۔ لیکن اُن کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ وہ آپ ﷺ کے نسبی دادا ہیں۔

سوال: نورانی مخلوق یعنی رُوحیں وغیرہ بدبودار جگہ پر نہیں آتیں۔ قبر میں جب جسم گل سڑ رہا ہوتا ہے تو کیا تب رُوح موجود نہیں ہوتی؟

جواب: رُوح کا قبر کے ساتھ رابطہ یا تعلق رب تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ مشروط ہے۔ بہت سی رُوحوں کو اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جائے مدفن پر لوٹ سکیں۔

آپ نے روایات سن رکھی ہوں گی کہ کسی وجہ سے کسی نیک شخص کی قبر کھل گئی تو اُن کا جسم کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود بالکل تازہ تھا یا حال ہی میں اُن کا انتقال ہوا ہے۔ ایسی ہی ایک بات خود میرے اپنے مشاہدے میں بھی آئی۔ میرے مرشد صاحب کے خادم جنھیں ہم مجید بھائی کہا کرتے تھے، نے ایک بار اس خواہش کا اظہار کیا ''مجھے شاہ صاحب سے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے نہ تو اُن سے کوئی دُعا کروانا ہے اور نہ ہی اُن سے رُوحانی علم درکار ہے۔ مجھے تو بس اُن سے پیار ہے۔'' تب مجید بھائی نے مجھ سے کہا ''میرے لیے آپ بس یہ دُعا کر دیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بڑے شاہ صاحب کے انتقال سے پہلے اُٹھا لے کیوں کہ میں اُن کی جدائی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔'' رب کی رحمت سے مجید بھائی کی خواہش پوری ہوئی اور وہ مرشد صاحب کے وصال سے ایک مہینہ 10 روز قبل انتقال کر گئے۔ مرشد صاحب کے وصال کے بعد میں اُس تخت پر بیٹھا کرتا تھا جہاں پہلے وہ تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ ایک روز میں وہاں بیٹھا اپنی ڈیوٹی نبھا رہا تھا کہ ایک صاحب آئے اور بتایا کہ مجید بھائی کی قبر والی جگہ پر بہت سا پانی جمع ہو گیا ہے اور قبر کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے۔ میں نے مرمت کے لیے دو تین لوگوں کو بھجوا دیا۔ جب مزدور کام ختم کر کے میرے پاس آئے تو کہنے لگے ''قبر تو ہم نے مرمت کر دی ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ قبر میں سے کفن نظر آ رہا تھا جو بالکل سفید تھا اور اہلِ قبر کا جسم بھی بالکل نرم تھا۔'' قصہ یہ کہ نیک لوگوں کا جسم گلتا سڑتا نہیں اور اُن کی قبروں سے عموماً خوشبو اُٹھتی محسوس ہوتی ہے۔

سوال: Spiritual problem (رُوحانی مسئلہ) کو Medical problem (طبی مسئلہ) سے Differentiate کیسے کیا جا سکتا ہے؟

جواب: رُوحانی بیماریاں انسان کو عموماً اُس وقت لاحق ہوتی ہیں جب اُس کا جسم بہت توانا ہوتا ہے۔ جو شخص رُوحانی طور پر بیمار ہوا سے حرام و حلال کی پرواہ نہیں رہتی۔ وہ جھوٹ بولتا اور چوری کرتا ہے۔ اخلاقی جرائم میں

بلا جھجک مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ساری علامات ظاہر کرتی ہیں کہ اُس کی رُوح بیمار ہو چکی ہے۔

جسمانی بیماری کی طرح رُوحانی بیماری کی بھی علامات ہوتی ہیں اور اس کی سب سے بڑی علامت (Symptom) یہ ہوتی ہے کہ انسان خود غرض ہو جاتا ہے۔ اُسے اپنے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر تین طرح کے انسان تخلیق کیے۔

1۔ جو اس دُنیا اور اس کے مال و متاع کو حاصل زندگی سمجھتا ہے خواہ وہ کسی بھی طریقے سے حاصل ہو۔ وہ کہتا ہے آخرت کو آخرت کے وقت سمجھ لیں گے۔ ایسے شخص کو رُوحانی اصطلاح میں Primitive human being اور عام فہم اصطلاح میں مادیت پسند انسان کہا جاتا ہے۔

2۔ دوسری قسم کا انسان وہ ہے جو مادی چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہے اور اُن کو اپنی زندگی سمجھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ ذہنی لحاظ سے لوگوں سے بالاتر اور بلندتر ہو کر اُن پر حکومت کرے۔ ایسا شخص اپنی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے بعد اُن کے ذریعے لوگوں پر حکومت کرتا ہے لیکن اس سے آگے کی وہ نہیں سوچتا۔ رُوحانی اصطلاح میں ہم ایسے شخص کو Intellectual human being کہیں گے۔

3۔ تیسری قسم کا انسان وہ ہے جو دُنیاوی مال و زر تو حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس جذبے کے ساتھ کہ اُسے اپنی ضروریات کے لیے کسی شخص کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑیں اور وہ اتنا مال و زر حاصل کرے جس سے نہ صرف اُس کی ذاتی ضروریات پوری ہو جایا کریں بلکہ وہ اس میں سے اللہ کے دوسرے بندوں کی خدمت بھی کر سکے۔

اب دُنیاوی مال و زر کا حصول اس شخص کی بھی خواہش ہے لیکن جو بات اسے دوسرے لوگوں سے بلندتر کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی دُنیاوی ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہتا کیوں کہ پھیلا ہوا ہاتھ رب تعالیٰ کو پسند نہیں۔ پھر اس انسان کا دوسرا مقصد اپنے پاس موجود وسائل سے مخلوق خدا کی خدمت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی Intellectual صلاحیتوں کو یہ سوچ کر پالش کرتا ہے کہ ان کے ذریعے وہ انسانیت کی بھلائی کا کام کر سکے اور اُن کی مشکلوں کو حل کر سکے۔ مزید یہ کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے اسرار کائنات پر غور کرنا اور رب تعالیٰ کو پہچاننا چاہتا ہے۔ ایسے شخص کا ایک اور مقصد حیات یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی ایک طالب علم کی مانند بسر کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح ایک Student امتحان میں پاس ہونے کے لیے سارا سال محنت کرتا ہے۔ اپنی ساری تفریح اور غیر نصابی سرگرمیوں کو ترک کر دیتا ہے تاکہ وہ امتحان میں اوّل آ سکے۔ اسی طرح تیسری قسم کا انسان اپنی زندگی اس انداز میں گزارتا ہے کہ وہ آخرت کے امتحان میں سرخرو ٹھہرے۔ جو شخص ان Objectives (مقاصد) کے تحت زندگی گزارتا ہے اُسے ہم رُوحانی اصطلاح میں Spiritual man اور روزمرہ زبان میں مسلمان کہیں گے۔

ان تینوں Objectives (مقاصد) کے تحت زندگی گزارنے والا شخص رُوحانی طور پر صحت مند رہتا ہے۔

رُوحانی بیماریوں کی علامات، طریقہ تشخیص اور علاج جسمانی بیماریوں کی علامت، تشخیص اور علاج سے مختلف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب ہم رُوحانی بیماریوں میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں اور اُن کے علاج کی طرف توجہ نہیں دیتے تو نتیجتاً ہم جسمانی طور پر بھی بیمار رہنے لگتے ہیں۔

جب ہم بدی کرتے ہیں تو ہمارے اندر احساس جرم (Guilt) پیدا ہوتا ہے۔ جب Guilt کا یہ احساس بہت بڑھتا ہے اور ہم اُسے نظر انداز کرتے ہوئے بدستور بدی کرتے رہتے ہیں تو یہ احساس جرم بڑھتے بڑھتے ڈپریشن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گناہ گار شخص اکثر آپ کو یہ شکایت کرتا دکھائی دے گا" صاحب! نہ جانے مجھے عجیب سا ڈپریشن (Depression) محسوس ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاؤں۔ دُنیا سے کنارہ کرلوں۔" یہ دراصل علامت (Symptom) ہے کہ رُوحانی بیماری جسمانی بیماری میں تبدیل ہو رہی ہے جو ڈپریشن پر جا کر ختم ہوگی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ گہرے (Acute) ڈپریشن کے مریض عموماً خود کشی کر لیتے ہیں۔ ایسے مریض اختلاج قلب کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اُن کے جسم میں اکثر و بیشتر درد رہنے لگتا ہے۔ یہ صورت حال رُوحانی بیماریوں کے جسمانی بیماریوں میں تبدیل ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اگر ڈاکٹر سمجھدار نہیں ہے تو وہ ایسے مریض کو Sedation میں رکھ کر مزید مریض بنا دے گا۔ لیکن اگر ڈاکٹر سمجھدار ہے تو وہ مریض کو Anti-depression میڈیسن نہیں دے گا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ یہ مریض کے لیے ضرر رساں ہے۔ ایک اچھا معالج ایسے مریض کی بیماری کا تفصیل اور گہرائی سے جائزہ لے گا اور دیکھے گا کہ ڈپریشن کی Root causes کیا ہیں؟ اختلاج قلب کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہیں۔ یوں تشخیص کرتے کرتے وہ وہاں پہنچ جائے گا کہ جہاں ڈپریشن کی سرحدیں احساس جرم سے جا ملتی ہیں۔ اب اس مریض کی تسلی کے لیے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر محض پانی کے انجکشن اُسے لگانا شروع کر دے اور ساتھ یہ ہدایت کرے کہ مہینہ میں ایک بار کچھ وقت آپ یتیموں کے ساتھ گزارا کریں۔ کسی یتیم خانہ میں Lunch لے جایا کریں۔ دراصل یہ عمل مریض کے اندر احساس تفاخر پیدا کرے گا کہ اُس نے یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ یہ احساس تفاخر اُس کے احساس گناہ کے لیے Counterweight کا کام کرے گا۔ اسی طرح ڈاکٹر مریض سے کہتا ہے کہ آپ کے خاندان میں اگر کوئی بیوہ خاتون ہیں تو اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اُس پر خرچ کیا کریں۔ ڈاکٹر اس نصیحت کے ذریعے درحقیقت اُسے خدمت خلق کی طرف لے جا رہا ہوتا ہے۔ خدمت خلق کا یہ جذبہ اُس کے اندر احساس تفاخر کو اُبھارے گا جو اُس کے ڈپریشن اور احساس جرم کو Counter کرے گا۔ جس کے نتیجہ میں وہ انسان گناہ کی طرف سے ہٹنا شروع ہو جائے گا۔

اگر رُوحانی بیماریوں پر قابو نہ پایا جائے اور اُن کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو رفتہ رفتہ انسان جسمانی لحاظ سے بیمار ہو جاتا ہے۔ رُوحانی طور پر صحت مند لوگ بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ اپنی Willpower کے ذریعے جسمانی بیماریوں کو Overcome کر لیتے ہیں اور باوجود بیمار ہونے کے طویل عرصہ تک زندہ رہتے ہیں۔

سوال: میرے مشاہدے کے مطابق بعض رُوحانی شخصیات باوجود اعلیٰ کردار کی حامل اور نہایت متقی ہونے کے باوجود پانچ وقت نماز کی پابندی نہیں کرتیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ ہے نہ شرمندگی کہ اس سوال کا جواب میں خود بھی ایک عرصے سے تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن میں اس طرف زیادہ توجہ یہ سوچ کر نہیں دیتا کہ مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں نظر رکھوں کہ کوئی شخص نماز پڑھتا ہے یا نہیں۔ روزہ رکھتا ہے یا نہیں۔ تاوقتیکہ میں خود نیک نہ ہو جاؤں۔ لیکن بدقسمتی سے دُنیا میں اتنا لمبا عرصہ گزارنے اور کوشش کے باوجود میں ابھی تک نیکی کے ہجے تک نہیں سیکھ سکا۔ اس لیے کسی کے گناہوں اور کوتاہیوں کی طرف میری نظر نہیں اُٹھتی۔

میرے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب کے ولی اللہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کے بہت سے ثبوت میں نے اُن کی زندگی میں دیکھ لیے تھے اور بہت سی باتیں اُن کے وصال کے بعد رُوحانی طور پر مختلف طریقوں سے بھی مجھے معلوم ہوئیں۔ بہت سے اولیاء اللہ نے بھی مجھے بتایا کہ آپ کے مرشد ولی اللہ تھے۔ قبلہ مرشد صاحب کے وصال سے کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینہ قبل بہت سے اولیائے کرام نے Individually مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ کے مرشد بہت ہی اچھے انسان اور ولی اللہ ہیں۔ اُن کا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ جو کچھ اُن کے پاس تھا اُنھوں نے سب کچھ آپ کو سونپ دیا ہے۔ اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔

بہت سے اولیائے کرام سے یہ جاننے کے بعد مجھے اپنے مرشد صاحب کے ولی اللہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ میں نے اُنھیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ البتہ دو چیزوں میں میں نے اُنھیں بہت Particular پایا..... ایک جمعہ کی نماز اور دوسرا روزہ۔ ایک بار بہت بیمار تھے اس قدر کہ ہل جُل نہ سکتے تھے۔ تب جمعہ کی نماز نہ پڑھ سکے۔ لیکن میں نے اُنھیں ہفتہ بھر روتے دیکھا۔ ہر دو منٹ بعد رونے لگتے کہ میری جمعہ کی نماز رہ گئی۔ لیکن میں نے اُنھیں کبھی نماز پنجگانہ ادا کرتے نہیں دیکھا۔ حیرت تو مجھے اُس روز ہوئی جب ایک مرتبہ اسلام آباد منسٹری میں کانفرنس سے فارغ ہو کر میں آ رہا تھا۔ مرشد صاحب بھی ہمراہ تھے۔ راستہ میں مغرب کی اذان ہوئی تو وہاں موجود ایک دوست کی فیکٹری میں ٹھہر کر نماز ادا کرنے کا ارادہ کیا۔ دوست نے کہا ''شاہ صاحب! آپ امامت کرائیے۔'' میں نے جواب دیا'' آپ ایک گناہ گار کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتے ہیں تو بسم اللہ۔'' جب جماعت کھڑی ہونے لگی تو وہ صاحب بولے'' آپ کے مرشد صاحب گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ اُنھیں بھی لے آؤں۔'' میں نے کہا'' لے آیئے۔'' وہ صاحب واپس آئے اور بولے'' بڑے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے تو نماز پڑھ لی ہے۔'' اب یہ تو ممکن نہ تھا کہ اُنھوں نے نماز نہ پڑھی ہو اور فرمائیں کہ میں نے تو نماز پڑھ لی ہے کیوں کہ اُن میں اتنی Moral courage (اخلاقی جرأت) تو تھی کہ نماز نہ پڑھی ہو تو اس کا اعتراف کر سکیں۔

مرشد صاحب کا یہ کہنا ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی ہے یہ وہ عقدہ ہے جو آج تک میں خود بھی حل نہیں کر سکا۔ ایک میرے مرشد صاحب ہی نہیں بلکہ بہت سے اولیاء اللہ ہیں جو زندگی میں ہمیشہ نماز کے پابند رہے

لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ نماز پڑھتے دکھائی نہ دیئے۔ میں خود یہ عقدہ حل کرنے کی کوشش میں ہوں کہ آخر یہ کون سا مقام ہے جہاں پہنچ کر اولیاء اللہ نماز پڑھتے دکھائی نہیں دیتے۔ میں تو بس اس قدر جانتا ہوں کہ نماز تو خود آپ ﷺ نے ترک نہیں کی تو پھر آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرنے والے اولیاء اللہ نماز ترک یا موخر کیسے کر سکتے ہیں۔

سوال: کیا نماز میں رفع یدین کرنا درست ہے؟

جواب: As a matter of policy میں کبھی فروعی مسائل پر بات نہیں کرتا لیکن اس سوال کا جواب اس لیے دے رہا ہوں کہ شاید اس سے کوئی فروعی مسئلہ حل ہو جائے۔ قرآن پاک Symbolic ہے۔ اس میں بہت سے احکامات ایسے ہیں جن کی وضاحت موجود نہیں اور یہ وضاحت ہم سنت یا حدیث سے معلوم کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن پاک میں نماز کی بہت تاکید ہے۔ لیکن نماز کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہے۔ اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھ کہاں تک اُٹھائیں۔ رفع یدین کریں یا نہ کریں۔ ہاتھ کہاں باندھیں۔ یہ سب باریک نکات قرآن پاک میں بیان نہیں کیے گئے۔ ان سب کے لیے ہم آپ ﷺ کی ذات مبارکہ سے رہنمائی لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے رفع یدین بھی کیا ہے۔ ہاتھ کھول کر بھی نماز پڑھی ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ہاتھ باندھ کر بھی نماز پڑھی ہے اور رفع یدین نہیں بھی کیا۔ یہ سب سنت ہے اور آپ ﷺ کی حیات مبارکہ سے ثابت ہے۔ میرے نزدیک جس طریقہ سے بھی آپ ﷺ نے نماز ادا کی ہے ان میں سے کوئی بھی طریقہ اپنا لیا جائے تو وہ جائز ہے۔ اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اگر اس معاملہ میں مزید احتیاط کرنا مقصود ہو تو یہ دیکھا جائے کہ آخری ایام عمر میں آپ ﷺ نے کیا انداز اپنایا۔ بہر حال رفع یدین کرتے ہوئے نماز پڑھنا جائز اور درست ہے۔

بہتر ہے کہ ہم ان فروعی مسائل پر توجہ نہ دیں بلکہ اُن اُمور کی فکر کریں جن کی پرسش قیامت کے روز ہم سے ہوگی۔ ان میں سے سب سے خوف ناک اور خطرناک چیز دوسروں کی حق تلفی ہے جو ہمیں بروز قیامت مشکل میں ڈال دے گی۔ حق مارنا محض یہ ہی نہیں کہ ہم نے کسی کے پیسوں یا مکان پر قبضہ کر لیا بلکہ اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں جن کا ہم احساس ہی نہیں کر پاتے۔ ایک شخص قطار میں کھڑا ہے۔ ہم بعد میں آ کر بغیر قطار میں کھڑے اپنا کام کروا کر چلے جاتے ہیں تو یہ ہم نے قطار میں کھڑے لوگوں کا حق مارا ہے۔ ایک شخص ڈائننگ ٹیبل پر ایک ڈش کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے لیکن ہم نے وہ ڈش پہلے اُٹھا کر اس میں سے اپنے لیے کھانا نکال لیا۔ یہ بھی حق تلفی ہے۔ ہم اپنی Muscle power سے دوسرے شخص کو Intimidate کر دیتے ہیں۔ یہ بھی گویا حق مارنا ہے۔ ان سب باتوں کا اگر ہم خیال رکھ لیں تو شاید ہماری نجات ہو جائے اور ہم جواب دہی سے بچ جائیں۔

سوال: کیا چاروں ائمہ کرام میں سے کسی ایک کی پیروی ضروری ہے؟

جواب: بات Compulsion (مجبوری) کی نہیں ہے۔ بات معاملات کو سمجھنے کی ہے۔ جو ائمہ کرام گزرے

ہیں وہ علم میں ہم سے کہیں آگے تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کے مختلف احکامات اور ان سے متعلقہ مسائل کی جستجو میں وقف کردی۔ انھوں نے دقیق ریسرچ ورک (Research work) کے ذریعے اسلام کے احکامات کو عام فہم بنایا۔ جب تک ہم بھی اس Dedication کے ساتھ حصول علم نہ کرلیں ہم ان احکامات کی باریکیوں کو سمجھ نہ پائیں گے اور ہم سے غلطیاں ہوں گی۔ اگر ہم ائمہ کرام کی تعلیمات وتحقیقات کو Follow کرلیں تو وہ کام جو ہمیں بہت مشکل دکھائی دیتا ہے ائمہ کرام کی تحقیقات کی پیروی کے بعد آسان ہو جائے گا۔ میرے نزدیک کسی بھی امام کو Follow کرنے کی وجہ یہی ہے۔ لیکن یہ Compulsory نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ وہ قرآنی احکامات اور احادیث کو تمام تر باریکیوں کے ساتھ سمجھ سکتا ہے تو وہ چاہے ائمہ کرام کو Follow نہ کرے۔ ہم دراصل اپنی سہولت کے پیش نظر چاروں میں سے کسی ایک امام کی پیروی کرتے ہیں۔

مرشد سے اکتساب فیض کا طریقہ اور اولیأ اللہ کی پہچان

سوال: جس کے مرشد حیات نہ ہوں اور جس نے نہ ہی مرشد کو دیکھا ہو وہ کس طرح راہ نمائی حاصل کرے؟

جواب: اکتساب فیض اور اکتساب علم مرشد کی موجودگی کا محتاج نہیں۔ اگر مرشد حیات یا موجود نہیں تو بھی اکتساب فیض ممکن ہے اور اکتساب علم ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ سارا کھیل مرشد کی توجہ کا ہے۔ اس لیے سمجھ دار لوگ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح مرشد کا دل جیت لیں اور اُس کے دل میں جگہ بنالیں۔ کیوں کہ اگر مرشد نے کسی کو پیار کرنا شروع کر دیا تو اُس کی توجہ فطرتاً اُس شخص کی طرف مرکوز رہے گی۔ یہ تو اکتساب علم و فیض کا ایک طریقہ ہے۔

ایسے بہت سے لوگ دُنیا میں گزرے ہیں جو کبھی مرشد سے ملے نہ اُنھیں دیکھا نہ ہی اُن کی محفل میں بیٹھے اور نہ ہی اُن کی بیعت کی۔ لیکن اُنھیں پھر بھی اُن سے فیض حاصل ہوا۔ اِسے طریقہ اویسہ کہا جاتا ہے۔ (اکثر لوگ اَن جانے میں اسے سلسلہ اویسہ کا نام دیتے ہیں جو درست نہیں۔) طریقہ اویسہ میں مرید کی مرشد سے ملاقات نہیں ہوتی لیکن فیض جاری ہو جاتا ہے۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ آپ کو مرشد کا پیار حاصل ہو جائے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے مرشد سے پیار کریں کیوں کہ جب آپ اپنے مرشد سے پیار کرتے ہیں تو وہ بھی آپ سے پیار کرے گا اور اُس کی توجہ آپ کی طرف مبذول ہو جائے گی۔

انسان ہو یا جانور سب اُس سے پیار کرتے ہیں جس کے عادات و اطوار خوشگوار ہوں۔ ہم میں سے ہر انسان کو دھیمی آواز اور لہجہ میں گفتگو کرنے والا اور بحث و تکرار میں نہ اُلجھنے والا شخص پسند آئے گا۔ کیا ایسے شخص کو ہم پسند کریں گے جو آداب کا خیال نہ رکھے، باتونی ہو اور بلند لب و لہجہ کا مالک ہو؟ یہ انسانی فطرت ہے کہ خوش گوار عادات و اطوار کا حامل انسان سب کو پسند آتا ہے۔

مرشد کے پاس جس قدر آپ مؤدب ہوں گے، Patient listener ہوں گے، زبان کو تالا لگائے رکھیں گے اُسی قدر آپ مرشد کے دل میں اُتر جائیں گے۔ اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ آپ کے مرشد زندہ ہیں یا پھر آپ نے مرشد کو دیکھ رکھا ہے یا نہیں۔ بس آپ اُن کی طرف متوجہ رہیے۔ اُن سے پیار کرتے جایئے۔ فیض اور علم دونوں آپ کو مل جائیں گے۔

سوال: بعض اوقات مرشد کے Attitudes اور Moods مرید پر بہت شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یہ بات صرف مرشد پر ہی موقوف نہیں ہے۔ اگر ماحول سوگوار ہوگا تو ہمارے مزاج میں سوگواری آجائے گی۔ ماحول خوش گوار ہوگا تو ہمارے مزاج میں بھی خوش گواریت اور شگفتگی آجائے گی۔ کوئی شخص بشاش بشاش لہجہ میں ہم سے مخاطب ہوتا ہے تو قدرتی طور پر ہماری آواز اور طبیعت میں بھی بشاشت پیدا ہو جائے گی اور اگر کوئی شخص آپ سے تلخ گفتگو کرتا ہے تو آپ کی طبیعت میں تلخی پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح جب ہم مرشد کے پاس جاتے ہیں تو چونکہ اُس کے ساتھ ہمارا رُوحانی تعلق ہوتا ہے اس لیے اُس کے رویوں کا اثر ہم پر بہت تیزی سے مرتب ہوتا ہے۔

پہلے بھی گفتگو میں ذکر ہو چکا کہ آپ اپنے مرشد کو انسان سمجھیں۔ یہ نہ سوچیے کہ وہ انسان سے ماورا کوئی چیز ہے۔ دراصل تو وہ انسان ہی ہیں۔ اُن کے حالاتِ زندگی، گھریلو ماحول، ملنے ملانے والوں کے طور طریقے، Attitudes اور Behaviour ...... یہ سب مرشد پر بھی ویسے ہی اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح ایک عام انسان پر۔ فرق صرف یہ ہے کہ مرشد چونکہ سنت پر زیادہ عمل کرتا ہے اس لیے اُس میں برداشت اور عفوودرگزر کی صفات ایک عام انسان کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ اتباعِ سنت میں ناپسندیدہ رویوں کو بھی خاموشی سے برداشت کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب عوامل بہرحال اُس پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ غصہ اُسے بھی آتا ہے۔ لہٰذا اُس کے Moods اور Attitudes اُس کی اندرونی اور ذہنی کیفیت کی وجہ سے تبدیل ہوتے رہیں گے۔ چونکہ ہمارا مرشد سے رُوحانی تعلق ہوتا ہے اس لیے ہم پر بھی اُن کے رویے بہت شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اُنھیں مافوق الفطرت ہستی نہیں بلکہ ایک انسان سمجھیں تو اُن کے Moods اور Attitudes میں آنے والی تبدیلی کی وجہ سے ہم اُن سے بدظن نہیں ہوں گے۔ اگر مرشد زیادہ گفتگو کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں تو ہم اُن کے اس رویہ سے بددل نہیں ہوں گے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میرے مرشد قبلہ سید یعقوب علی شاہ صاحب اچھے موڈ میں نہیں ہوتے تھے تو بلاوجہ جوتے پڑ جاتے۔ لیکن میں چونکہ اُنھیں ایک انسان ہی سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ اُن کا علمی مرتبہ کس قدر بلند ہے اور وہ توکل و پرہیزگاری کے کس بلند مرتبہ پر فائز ہیں اس لیے سمجھتا تھا کہ اُن کی ہر حال میں Utmost respect کی جانی چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں مرشد صاحب کے لیے بے حد پیار بھی تھا اور بے پناہ احترام بھی۔ جو آج بھی ہے۔ چونکہ اُن سے پیار تھا اس لیے بلاوجہ جوتے پڑ جانے پر بھی کبھی اُن سے بدظن اور بددل نہیں ہوا۔ اگر کسی نے اس جانب توجہ بھی دلائی کہ آج تو شاہ صاحب بہت غصہ میں تھے یا اُن کی طبیعت میں جلال تھا۔ آپ کو خواہ مخواہ جوتے پڑ گئے۔ ''He was really harsh on you'' تب بھی میں ایک جملہ میں قصہ نمٹا دیا کرتا کہ صاحب کیا ہوا جو دو چار جوتے پڑ گئے۔ یہاں تو سو جوتوں سے کم کا میں مستحق نہ تھا۔

انسان جس سے پیار کرتا ہے اُس کی ہر بات اور ہر رویہ بخوشی برداشت کرتا ہے۔ مرشد کے ساتھ محبت کا

رشتہ جڑ جانے کے بعد نفع و نقصان کی پرواہ نہیں رہتی۔ پھر تو نہ ہارنے کا کوئی غم نہ جیت کا کوئی ارمان۔ مرشد کے ساتھ پیار میں تو انسان جان بوجھ کر ہارتا ہے کیوں کہ مرشد کو جیتتے دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے اُس کا بیان ناممکن ہے۔ انسان جس سے پیار کرتا ہے اُس کی چھوٹی سے چھوٹی خوشی کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اپنی عزیز چیز قربان کر کے بھی مرشد کو خوش رکھا جا سکتا ہے۔ اُس کی خاطر سولی چڑھ جانا بھی باعث مسرت محسوس ہوتا ہے۔ جب آپ مرشد سے اتنا پیار کریں گے تو گھر بیٹھے بھی مرشد کے Moods کی تبدیلیاں محسوس کر لیں گے۔

میں ایک بار مرشد صاحب سے ملاقات کے بعد حسب معمول رات دس بجے گھر واپس آیا۔ گھر میں عبادت کے معمولات سے فارغ ہو کر جب جانماز سے اُٹھنے لگا تو محسوس ہوا کہ مرشد صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ گاڑی لے کر فوراً اُن کے پاس پہنچا۔ دیکھا تو واقعی اُن کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ ''لو میاں! میرا تو جانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں تو رُخصت ہو رہا ہوں۔'' اُن کی یہ بات سن کر میں نے زندگی میں پہلی بار گستاخی کی۔ اُن کی Back پر بیٹھ گیا۔ اُن کی فرمائش پر سورہ یٰسین انھیں پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد وہ کہنے لگے۔ ''میں نے تم سے بھی ایک وعدہ کیا تھا جس کو پورا کرنے کا وقت اب آ گیا ہے۔ تم کاغذ پنسل اُٹھا لاؤ تا کہ میں تمھیں ایک خاص ترکیب بتا دوں اور تم وہ کر لینا۔'' اب اُس وقت تو مجھے کسی اور چیز کی طلب تھی نہ خواہش۔ محض یہ فکر اور پریشانی تھی کہ مرشد صاحب رُخصت ہو رہے ہیں۔ تب میں نے وہ گستاخی کی جس کا کچھ دیر پہلے ہی ذکر کیا ہے۔ مرشد صاحب کی Back پر بیٹھے بیٹھے ایک تو میں نے یہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کی ''یا باری تعالیٰ! مجھے ابھی ان کی بہت ضرورت ہے۔ تو انھیں کچھ مہلت عطا فرما دے۔ اور اگر ان کے سانس پورے ہو چکے ہیں تو میری زندگی کے کچھ سال ان کو عطا کر دے۔''

مجھے خوشی تب ہوئی جب اگلے ہی لمحے دُعا کا جواب آ گیا کہ مہلت دے دی گئی ہے۔ یوں میں دلیر ہو گیا۔ دُعا کی صورت ایک گستاخی تو کی ہی تھی۔ دوسری گستاخی بھی کر ڈالی کہ مرشد صاحب کو دم کر دیا۔ جونہی دم کیا اُن کی سانس کی رفتار صحیح ہو گئی اور انھوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور بولے ''تم باز نہیں آؤ گے اپنی حرکتوں سے۔''

بات مرشد سے پیار کی ہو رہی تھی۔ جہاں انسان پیار کرتا ہے وہاں وہ اپنی زندگی بھی ٹرانسفر کرنے کے لیے تیار رہتا ہے کہ یا اللہ تعالیٰ! میری زندگی بھی انھیں دے دے۔ جب مرشد سے اس قدر محبت ہو تو پھر مرشد کے Moods اور Attitudes تو مرید پر اثر انداز ہوں گے۔

اگر آپ کو کتے اور گھوڑے پالنے کا تجربہ ہے تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ یہ دونوں جانور مالک کے Moods کو بہت تیزی سے پہچانتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک میں بہت باقاعدگی سے گھڑ سواری کرتا تھا۔ لندن میں گھڑ سواری کی عادت پختہ ہو چکی تھی۔ ایک خاتون جسیکی جو Horse Trainer تھی ایک روز مجھے کہنے لگی کہ یہ گھوڑا تمھارے دماغ کو Read کرتا ہے۔ بجائے یہ کہ تم اسے لگام اور ایڑی سے کنٹرول کرو تم صرف دماغ سے سوچ لو کہ فلاں جگہ رُکنا ہے تو گھوڑا ٹھیک اُس جگہ پر جا کر رُک جائے گا۔ میں نے حیرت سے سوچا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے۔ تب جسیکی کہنے لگی کہ تم رکاب سے پاؤں نکال لو اور لگام چھوڑ دو اور سوچ کہ تم

نے کہاں رُکنا ہے۔ میں نے سامنے دیوار پر لکھے "K" پر رُکنے کا سوچا اور گھوڑا دوڑا دیا۔ گھوڑے نے تیزی سے دوڑتے دوڑتے "K" کے پاس Turn لیا اور رُک گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ صرف ایک Co-incident ہے۔ تب میں نے دوبارہ ایک اور Alphabet سوچا اور ایڑھ لگائی۔ حیرت انگیز طور پر گھوڑا اُسی حرف کے پاس جا کر رُک گیا۔ اور کئی بار یہ عمل دہرانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ گھوڑا واقعی اپنے مالک کے دماغ کو پڑھ لیتا ہے۔ یوں جانور تک مالک کے Moods کو پہچانتے ہیں۔ یہ رشتہ تو پھر مرشد اور مرید کا ہے۔ تو مرشد کے Moods اور Attitudes مرید پر کیسے اثر انداز نہیں ہوں گے۔

سوال: غوث، قطب، قطب الارشاد سے کیا مراد ہے؟ یہ مقام کیسے حاصل ہوتے ہیں؟

جواب: جس طرح سول سروس (Civil Service) میں بھی آفیسر ز ہوتے ہیں۔ جو آدمی گریڈ 17 میں ہے اور اُس نے ابھی جاب جوائن کی ہے وہ بھی افسر ہے اور گریڈ 22 کا سیکرٹری بھی افسر کہلاتا ہے۔ اسی طرح رُوحانیت میں سبھی ولی اللہ ہیں۔ اس میں مختلف منزلیں اور درجات ہیں اور مختلف Assignments ہیں۔ جس طرح گریڈ 22 کا افسر اگر منسٹری میں بیٹھا ہے تو وہ جوائنٹ سیکرٹری کہلاتا ہے۔ کسی ضلع میں Posted ہے تو وہ کمشنر یا ڈپٹی کمشنر کہلائے گا اور اگر کسی ادارے کا سربراہ ہے تو ڈائریکٹر جنرل کہلاتا ہے۔ بالکل اسی طرح رُوحانیت میں Assignments ہیں کہ کچھ لوگ ایک شہر کے حاکم ہیں۔ جو اُن سے بلند منزل پر فائز ہیں وہ ملک کے حاکم ہیں۔ جو اُن سے بھی بلند درجے پر ہیں کئی منزلیں طے کر آئے ہیں وہ ایک براعظم کے حاکم ہیں اور جو اُن سے بھی زیادہ منزلیں طے کر گئے وہ کرہ ارض کے حاکم ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کہلاتے کیا ہیں؟ جو ایک براعظم کا حاکم ہے وہ قطب ہے۔ یہ لفظ اس نسبت سے معروف ہوا کہ اگر ہم Compass کو دیکھیں تو اس میں چار کونے بنتے ہیں۔ جیسے اردو میں ہم قطب نما کہتے ہیں یعنی قطب یا Direction دکھانے والا۔ وہ ولی اللہ چونکہ ایک خاص سمت کے پورے کے پورے علاقہ کا حاکم ہوتا ہے اس لیے قطب کہلاتا ہے۔ جو ولی اللہ ان تمام اقطاب پر حاکم ہوا سے قطب الاقطاب یا غوث کہا جاتا ہے۔ یہ پورے کرہ ارض پر حاکم ہوتا ہے۔

اسی طرح مختلف ابدال ہیں۔ ابدال کی ایک مخصوص تعداد حضرت علیؓ کے روضہ پر حاضری دیتی ہے۔ باقی ابدال اپنے اپنے مقام پر ڈیوٹی دیتے ہیں۔ یہ وہ Assignments اور Duties ہوتی ہیں جو انھیں سونپ دی گئی ہوتی ہیں۔ Duties کے حوالے سے ایک اور مقام کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ (چونکہ یہ Duties ایک طویل مدت کے بعد Exercise ہوتی ہیں اس لیے عموماً ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔) وہ ہے مجدد۔ ہر صدی کے آخر میں ایک مجدد پیدا ہوتا ہے اور ہر Millennium کے بعد مجدد کامل آتا ہے۔ جس کی ڈیوٹی یہ ہوتی ہے کہ اس ہزار سال میں مذہب پر بدعت اور غیر اسلامی رسم و رواج کا جو گرد و غبار جم چکا ہوتا ہے اُس کو صاف ستھرا کر کے دینِ اسلام کا آئینہ دوبارہ چمکا دے۔ اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے آپ بھی

واقف ہیں۔ وہ اُس وقت تشریف لائے جب دین اکبری اپنے عروج پر تھا اور اس کو مٹا دینا کسی ولی اللہ کے بس میں نہ تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے دین اکبری کو اس خوب صورتی سے جڑ سے اکھاڑ پھینکا کہ آج اس کا نام ونشان تک موجود نہیں۔

اب آپ کا یہ سوال کہ یہ مقام اور مرتبہ کیسے مل سکتا ہے؟ مقام اور منزلیں مجاہدوں اور ریاضتوں سے حاصل نہیں ہوتیں بلکہ پرہیزگاری، پاکیزگی، توکل اور استغنا سے حاصل ہوتی ہیں۔ کسی منزل یا مقام کے حصول کے لیے ان میں سے سب سے زیادہ Effective (مؤثر) کون سی چیز ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے۔ یہ تو رب تعالیٰ کی مرضی ہے وہ جب موج میں آئے عطا کر دے۔ جب وہ عطا کرنے پر آتا ہے تو کب دیکھتا ہے کہ کون گناہ گار ہے، کون پرہیزگار ہے۔ وہ تو بے حساب عطا کرتا ہے۔ اُس کی مرضی جس کو چاہے مقام اور مرتبہ عطا فرما دے۔

محنت اور ریاضت سے انسان منزلیں طے کرتا ہے۔ یہ محنت، ریاضت اور مجاہدے صرف یہ نہیں کہ جانماز پکڑ لیا جائے اور تسبیح پھیر لی جائے۔ بلکہ ریاضتوں اور مجاہدوں میں ہمارے وہ اعمال اور رویے بھی شمار ہوں گے جن کی طرف عموماً دھیان نہیں جاتا۔ میں اکثر ایک جملہ کہا کرتا ہوں کہ آپ خلقِ خدا پر مہربان ہو جایئے رب تعالیٰ آپ پر مہربان ہو جائے گا۔ وہ بھی اس سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ ریاضت اور مجاہدہ میں بہت سے کٹھن مقامات ومراحل آتے ہیں، لوگ Undue favour لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ان مراحل میں کھو گیا وہ کسی مقام پر نہ پہنچ سکا۔

مخلوق پر مہربان ہونے سے اس بات کا عملی تجربہ ہوتا ہے جو حضرت علیؓ نے چودہ سو برس قبل فرمائی تھی ''جس سے نیکی کرو اُس کے شر سے بچو۔'' اسی طرح ساڑھے چھ سو سال پہلے مولانا روم نے فرمایا تھا ''جس سے نیکی کرو اُس سے ڈسے جانے کی توقع رکھو۔''

جب انسان خلقِ خدا پر مہربان ہوتا ہے تو خلقِ خدا کی طرف سے اُسے بہت جوتے پڑتے ہیں۔ اس پر انسان اپنے آپ کو باور کراتا رہے کہ وہ جس کے ساتھ بھی نیکی کرے گا وہ شخص اُس کا گریبان ضرور پکڑے گا۔ لیکن اس سب کے باوجود اُس کا رویّہ تلخ نہیں ہونا چاہیے۔

رب تعالیٰ کا نظام بہت زبردست ہے۔ وہ شخص جس کے ساتھ آپ نے نیکی کی ہے وہ تو نیکی سے جواب نہیں دے گا۔ لیکن رب تعالیٰ آپ کی اس نیکی کا اجر کسی اور جگہ سے کئی گنا بڑھا کر آپ کو لوٹا دے گا۔

میں نے اپنے محسوسات، مشاہدات اور تجربات کے بعد رب تعالیٰ کو بے پناہ وضع دار پایا۔ میں نے اُسے بہت زیادہ حیا والا پایا۔ ''حیا'' کو ہم بہت محدود معنوں میں لیتے ہیں۔ درحقیقت اس کے معانی بہت وسیع ہیں۔ رب تعالیٰ بلاشبہ سب کے لیے بہت زیادہ مہربان ہے۔ اُس کی ''حیاداری'' کا تو یہ عالم ہے کہ وہ جس کو دوست رکھتا ہے اُس کے دوست کا بھی رب تعالیٰ لحاظ کرتا ہے کہ یہ میرے دوست کا دوست ہے۔ رب تعالیٰ اُس پر بھی اپنی عنایات نچھاور کرتا ہے۔ یہ اُس کی حیا ہے۔ رب تعالیٰ اپنے دوست کا پردہ رکھتا ہے۔ لیکن اُسے جھکا

بھی دے دیتا ہے۔ اُسے کندھوں سے ہلا کر جگا بھی دیتا ہے تاکہ اُس کا وہ بندہ کہیں بھٹک نہ جائے۔ یہ اُس کی حیاداری ہے۔

"وضع داری" رب تعالیٰ میں میں نے اس درجہ کی پائی اس کے باوجود کہ دُنیا کا سب سے گناہ گار اور گھٹیا شخص میں ہوں (میرے اس جملہ میں مبالغہ آمیزی کا کوئی پہلو نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔) اس کے باوجود اگر میری زبان سے یہ نکل گیا کہ میرا رب یہ کام کر دے گا۔ وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ تو رب تعالیٰ نے کبھی میرے گناہوں کی طرف نہیں دیکھا بلکہ میرے گمان کی لاج رکھی۔ وہ ہمیشہ مجھ پر رحم کرتا رہا۔ کیوں کہ اس نے فرمایا کہ تم میرے بارے میں اچھے گمان رکھو میں اچھا ہی کروں گا۔ لہٰذا بندہ رب تعالیٰ کے بارے میں جیسا گمان رکھتا ہے رب ویسا ہی کر دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ فرماتا ہے۔ اے ابن آدم! جب تو مجھ سے دُعا کرتا رہے گا اور مجھ سے اُمید وابستہ رکھے گا میں تیری تمام خامیوں سمیت مغفرت کرتا رہوں گا۔" (جامع ترمذی) بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔ ذکر ہو رہا تھا کہ کیا انسان مجاہدوں، ریاضتوں اور محنت سے کوئی مقام اور درجات حاصل کر سکتا ہے؟

انسان محنت، ریاضت اور مجاہدے تو کرتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے حضور قبول بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ ان کی قبولیت صرف اور صرف رب تعالیٰ کی مرضی اور رحمت پر منحصر ہے۔ عطا بھی رحمت سے ہوتی ہے۔ رب اپنے بندہ کی کسی بات سے راضی ہو گیا تو اُس نے عطا کر دی۔ تو قبولیت ہو یا عطا، بات دونوں صورتوں میں رحمت سے مشروط ہے۔ اس لیے کبھی بھی اپنی محنت، ریاضت اور مجاہدے پر انحصار نہ کیجیے گا۔ انحصار اگر کرنا ہی ہے تو اللہ کی رحمت پر کر لیجیے۔ کبھی خطا نہیں کھائیں گے۔ جس شخص نے اپنی محنتوں، مجاہدوں اور ریاضتوں پر تکیہ کر لیا وہ خطا کھا گیا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جب بھی دیکھیں رب تعالیٰ کی رحمت کی طرف دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ بے پناہ عنایات کرے گا اور مقام و مرتبہ آپ کو عطا فرما دے گا۔

سوال: رب تعالیٰ کے دوستوں سے رابطے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اُن کی پہچان کیا ہے؟

جواب: بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ محنت رائگاں نہیں جاتی۔ اللہ کسی کی محنت اُدھار نہیں رکھتا۔ جس نے کسی چیز کی جستجو کی رب تعالیٰ نے وہ چیز اُسے عطا کر دی۔ محنت اور جستجو بنیادی شے ہے۔

اولیاء اللہ خواہ وہ اپنے زمانے کے ابدال، اخیار، عمران، قطب یا غوث ہیں اُن سب کی ایک ہی پہچان ہے۔ ولی اللہ شکل و صورت کا کیسا ہی گیا گزرا انسان کیوں نہ ہو اس سے مل کر آپ کو ایک عجیب نامعلوم کشش محسوس ہوگی۔ وہ کشش دراصل اُس شخص کی نہیں بلکہ اُس کلام کی ہے جس کا وہ ورد کرتا ہے۔ کلام الٰہی انسان کو مقناطیس کی مانند اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ولی اللہ کی دوسری پہچان یہ ہے کہ اس سے مل کر آپ کو ایک عجیب سرخوشی اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک بوجھ آپ کے کندھوں سے اُتر گیا ہے۔ اس کا سبب بھی کلام الٰہی ہی ہے جس کا وہ ولی اللہ ہر وقت ورد کرتا ہے۔ کیوں کہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ میرے

ذکر سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔

کسی بھی ولی اللہ کی سب سے Authentic پہچان یہ ہے کہ وہ آپ کو نصیحت نہیں کرتا لیکن بغیر نصیحت کیے آپ کو نیکی کی روش پر چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ کو اپنے اندر جو تبدیلی محسوس ہوگی وہ یہ ہے کہ آپ کو یوں لگنے لگے گا کہ جیسے دُنیا کی محبت آپ کے دل سے نکل گئی ہے۔ (دُنیا کی محبت سے میری مراد مال ہے۔) اُس ولی اللہ سے ملنے سے پہلے انسان کو چھوٹا سا نقصان بھی پریشان کر دیتا تھا۔ فائدہ پر اُسے بے انتہا خوشی ہوتی تھی۔ لیکن ولی اللہ سے ملاقات کے بعد نقصان ہو جانے پر انسان کہتا ہے کوئی بات نہیں اللہ پورا کر دے گا۔ اب اُسے خسارہ پر دُکھ نہیں ہوتا۔ جب کچھ ملتا ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ اب وہ یقین رکھتا ہے کہ سب اللہ کا مال ہے۔ وہ جب چاہے عطا کر دے۔ جب چاہے واپس لے لے۔ اُس کا یہ رویہ اس بات کا عکاس ہوتا ہے کہ دُنیا کی محبت اُس کے دل سے رُخصت ہو چکی ہے۔ اسی طرح لوگ اُسے تکلیفیں دیتے ہیں تو وہ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ ولی اللہ سے ملاقات کے بعد ایک اور تبدیلی بھی انسان میں آتی ہے کہ انسان کو مسائل ستاتے اور آزردہ نہیں کرتے۔ اِدھر مسئلہ آیا اور دوسرے ہی لمحے اُس کا حل بھی انسان کے ذہن میں آ گیا۔ زندگی میں جب بھی کسی شخص سے ملاقات کے بعد آپ کو اپنی ذات میں یہ تبدیلیاں محسوس ہونے لگیں تو اُس شخص کو پکڑ لیجیے۔ وہ ولی اللہ ہے۔ محض اُس کے اپنی ذات کے بارے میں ملامتی الفاظ پر کبھی مت جائیے کیوں کہ وہ الفاظ عاجزی کا اظہار ہو سکتے ہیں۔

یاد رکھیں! ولی اللہ دو قسم کے جھوٹ کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ایک جھوٹ یہ کہ میں کچھ نہیں اور دوسرا جھوٹ یہ کہ میں بہت کچھ ہوں۔ یہ دو جھوٹ ہیں جن میں لپٹا ہوا ولی اللہ آپ کو ملے گا۔ جو شخص یہ کہے کہ میں ابھی تمہارے دل پر ہاتھ رکھ کر قلب جاری کر دیتا ہوں۔ تمہارا مسئلہ چٹکی میں حل کر دیتا ہوں۔ سمجھ لیجیے کہ وہ اندر سے خالی ہے۔ ولایت سے کوسوں دُور ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو کہتا ہے کہ بھائی تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔ میں تو خود مردِ کامل کی تلاش میں ہوں تاکہ اُس سے فیض حاصل کر سکوں۔ میرے پاس کیا رکھا ہے۔ تم کسی صاحب علم کے پاس جاؤ۔ بس ایسے شخص کے قریب ہو جائیے۔ اُس کی دُعا سے آپ کا م ہو جائے گا۔ کام ہو جانے کے بعد جب آپ اُس کا شکریہ ادا کرنے جائیں اور وہ کہے "بھائی! میں نے کیا کیا ہے۔ کرنے والا تو سب رب ہے۔ جاؤ! جا کر اُس کا شکر ادا کرو۔" بس یقین کر لیجیے کہ یہی شخص ولی اللہ ہے۔ اُس کی صحبت اختیار کر لیجیے۔

عامل اور فقیر

سوال: عامل اور فقیر میں کیا فرق ہے؟

جواب: رُوحانی علوم میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ جس شخص کو یہ علم حاصل ہوتا ہے یا علم لدنی عطا ہوتا ہے وہ تمام علوم جان لیتا ہے کیوں کہ علم لدنی اپنے اندر تمام علوم کو سموئے ہوئے ہے۔ عرف عام میں اسے Mystic sciences بھی کہا جاتا ہے۔ مغرب میں علم الاعداد، آسٹرولوجی، پامسٹری جیسے تمام علوم Mystic sciences ہی میں شمار ہوتے ہیں۔ فقیر علم لدنی حاصل ہوجانے کے بعد ان تمام علوم سے واقف ہوجاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ علم لدنی کے حصول کے بعد فقیر کی نظر میں پھر کوئی اور علم نہیں جچتا۔

علم جفر ہو، علم رَمل (یہ علم الہامی ہے اور حضرت دانیال علیہ السلام پر اُتارا گیا تھا)، علم نجوم یا پھر علم الاعداد...... ان سب میں انسانی ذہن Apply ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں اندازے لگائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے Error of judgment کا امکان رہتا ہے۔ نتائج کا انحصار اس بات پر ہے کہ کسی انسان کے پاس علم کتنا ہے۔ Man to Man علم کی Degree فرق ہوگی اور یوں نتیجہ وفیصلہ بھی مختلف ہوگا۔ جس شخص کے پاس بہت وسیع علم ہے اُس کے اخذ کردہ نتائج زیادہ Accurate (صحیح) ہوں گے۔ اس سلسلے میں دوسرا اہم عنصر Concentration of Mind (ذہنی یک سوئی) ہے۔ جو شخص کسی چیز پر اپنی توجہ جتنی زیادہ مرکوز کرسکے گا اُتنے ہی درست نتائج اخذ کرسکے گا۔

ایک زمانہ میں میں سرکاری ڈیوٹی پر انڈیا گیا تھا۔ تمام سرکاری اُمور سرانجام دینے کے بعد میں اور میرا اسسٹنٹ (Assistant) بمبئی روانہ ہوگئے جہاں میں ولی اللہ حاجی علی صاحب (جن کا مزار سمندر کے بیچ میں ہے) کی خدمت میں حاضر ہوکر سلام عرض کرنا چاہتا تھا۔ ہم بمبئی پہنچے تو میرے Assistant جو Government of India سے تھے اُن کی ڈیوٹی اچانک امریکی وفد کے ساتھ لگادی گئی۔ میرے اُن Assistant نے اپنی بیگم ڈاکٹر جینا کو یہ ذمہ داری سونپی کہ شاہ صاحب کو Pick کرکے مزار پر لے کر جاتا ہے۔ دوپہر میں میری عبادت چونکہ قدرے طویل ہوتی ہے اور میں یہ بتانا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں نے اُن

خاتون سے کہا کہ میں ایک Meeting کے لیے ہوٹل جانا چاہتا ہوں۔ فی الحال آپ مجھے وہاں ڈراپ (Drop) کر دیجیے اور تین بجے Pick کر لیجیے گا۔ تین بجے ڈاکٹر نیتا مجھے Fetch کرنے آئیں تو میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی پہلا جملہ اُنھوں نے یہ کہا "مسٹر شاہ! ہم تو کسی پنڈت کے پاس نہیں جاتے کیوں کہ ہمارے ایک انکل جو By training تو ڈاکٹر ہیں لیکن By profession ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہیں، بہت Accurate علم کے مالک ہیں ہم تو انھی کے پاس جاتے ہیں۔" میں اُن خاتون کی بات سن کر ذرا سا حیران ہوا کہ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پچھلی نشست پر براجمان میرا Escort کہنے لگا۔ "سر! میں نے ہی ڈاکٹر نیتا سے کہا تھا کہ شاہ صاحب کو پنڈت حضرات سے ملنے کا بڑا شوق ہے۔ اگر وہ کسی اچھے پنڈت کو جانتی ہیں تو اُن سے آپ کو ملوا دیں۔" اب میرے Escort کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں لوگوں کے سامنے اپنے آدمی کو کبھی شرمندہ نہیں کرتا۔ لہٰذا میں چپ رہا۔ ڈاکٹر نیتا مجھے اپنے انکل کے پاس لے گئیں۔ وہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ پوچھنے لگے "کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے بتایا "پاکستان کے شہر لاہور سے آیا ہوں۔" کہنے لگے۔ "میں بھی لاہور ہی سے ہوں اور گورنمنٹ کالج سے تعلیم یافتہ ہوں۔" اس کے بعد کہنے لگے۔ آپ مجھے اپنے Particulars دے دیجیے تاکہ میں آپ کو کچھ بتا سکوں۔ میں نے کہا۔ "میں تو Interested نہیں ہوں۔ البتہ میرے ساتھی Interested ہیں اُن کو کچھ بتا دیجیے۔" جب اُنھوں نے اُن کے بارے میں بتانا شروع کیا تو میں اُن کی Expertise اور Skills پر حیران رہ گیا کیوں کہ جو کچھ وہ بتا رہے تھے میں دُعا کے ذریعے ساتھ ساتھ وہ چیک کرتا جا رہا تھا کہ اس میں کتنی Accuracy ہے۔ حیرت انگیز طور پر اُن کی باتیں Fairly accurate تھیں۔ بعد میں نیتا اور Escort نے میرا زائچہ بنوانے پر زور دیا تو میں نے کہا بنا لیجیے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اُنھوں نے زائچہ بنانے کے بعد جب بتانا شروع کیا تو پہلے ہی جملہ پر گھومنے لگے۔ پہلے کہا "یہ ایسا ہے۔" پھر کہنے لگے "میں نے شاید غلط کہا۔ یہ ایسے نہیں بلکہ ایسے ہے۔" بعد ازاں کہنے لگے "نہیں شاید پہلی بات ہی درست تھی۔" Finally کہنے لگے "شاید مجھ سے یہ زائچہ نہیں بن پائے گا۔" پنسل اور کاغذ ایک طرف رکھ کر وہ اپنی بھتیجی نیتا سے مخاطب ہوئے "نیتا! تم آج تک اپنے جتنے دوست میرے پاس لائی ہو ان میں یہ شخص سب سے زیادہ طاقت ور ہے جنات کی طرح۔" اسی دوران اُنھوں نے ایک ایسا جملہ کہا جس کی وجہ سے یہ سارا قصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ وہ جملہ میرے لیے انتہائی حیران کن تھا کیوں کہ جس بات کی طرف اس جملہ میں اشارہ تھا وہ بات میرے اور رب تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہ تھی۔ اور وہی بات اُس شخص نے Straightway میں کہہ دی۔ کہنے لگا "نیتا! دُنیا میں یہ پہلا شخص میں نے دیکھا ہے جو بھگوان (اللہ) کو اپنی Property (جائداد) سمجھتا ہے۔"

یہ سن کر میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا کہ اس شخص کو یہ راز کیسے معلوم ہو گیا۔

میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ میں گناہوں میں بے پناہ ڈوبا ہوا ہوں۔ میرے اندر سرکشی بھی ہے۔ جب میں پہلی بار عمرہ کرنے جا رہا تھا تو میں نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دُعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔ میں باب فہد سے مسجد الحرام میں داخل ہوا۔ تب میں نے کوشش کی کہ جب تک میں یہاں ہوں تب تک ہی کم از کم انسان بن جاؤں۔ اپنی طرف سے تو دل میں سوچا کہ فلاں فلاں دُعائیں پڑھنے کے بعد ایک خاص دُعا مانگوں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک دم بے ساختہ میری زبان سے نکلا:۔

> ''یا باری تعالیٰ! یہ ساری دُعائیں نہ مجھے پڑھنا آتی ہیں نہ میں پڑھوں گا۔ تو دلوں کا حال جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں سچے دل سے تجھے اپنا رب مانتا ہوں۔ اور خود کو تیرا بندہ تسلیم کرتا ہوں۔ سنا ہے کہ تیرے گھر پر پہلی نظر پڑے تو جو مانگا جائے تو وہ عطا کر دیتا ہے۔ سو آج تیرے اندر کچھ دینے کا حوصلہ ہے تو چھوڑ اس ساری دُنیا کو اور تو صرف میرا ہو جا۔''

یہ بات ایک زمانہ پہلے کی تھی جسے اُن کرنل صاحب نے نہ جانے کس طرح Work out کر کے اپنی بھتیجی کو بتایا کہ زندگی میں یہ پہلا شخص میں نے دیکھا ہے جو بھگوان کو اپنی پراپرٹی سمجھتا ہے۔

پیش گوئیوں میں Accuracy کا انحصار اس بات پر ہے کہ پیش گوئی کرنے والا انسان درحقیقت کس قدر نیک ہے۔ کرنل صاحب بہت نیک انسان تھے۔ اپنی تمام آمدنی ایک یتیم خانہ چلانے پر صرف کرتے تھے اور محض پنشن پر گھر کا گزارہ کرتے۔ چونکہ ان کی Concentration بہترین تھی اس لیے اُن کی باتوں میں Accuracy بھی آ گئی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ جہاں بھی انسانی عقل اور ذہن کا دخل ہو گا وہاں غلطی کا امکان ہمیشہ رہے گا۔ یہ تمام علوم جو Mystic sciences کا حصہ ہیں ان میں غلطی کا احتمال ممکن ہے۔ انہی علوم کی ایک شاخ ''عملیات'' بھی ہے۔ آپ نے کوئی جن قابو کرنا ہے تو مخصوص عمل کر کے جن قابو کر لیں۔ دو تین اور علم آج کل بڑے مشہور ہیں۔ اگر انھیں انسان ایک خاص مدت تک خاص وقت میں پڑھے تو وہ کہیں سے بھی تعویذ دھاگے اور سری برآمد کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگ چند دنوں میں اس عمل میں مہارت حاصل کرنے کے بعد لوگوں کو بتانے لگتے ہیں کہ تم پر تو بڑا سخت جادو ہوا ہے۔ تم اپنی استعمال شدہ قمیص یا بنیان یہاں بچھا دو۔ کچھ ہی دیر بعد روشن دان سے آ کر تعویذ نیچے گرنے لگیں گے..... یہ عمل ہے۔

اسی طرح ایک اور علم ہے جس سے میں واقف ہوں۔ عامل حضرات آپ سے کہیں گے کہ آپ کے گھر میں جو ایک گملا ہے آپ نے ایک بار اس میں پودا لگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اُگا نہیں۔ اس گملے کی مٹی باہر نکالیں اور اُسے اُلٹ دیں۔ اب آپ گھر جا کر گملے کی مٹی اُلٹیں گے تو اُس میں سے سانپ کی سری برآمد ہو گی۔ سانپ کی دائیں آنکھ میں ایک کیل لگا ہوا ہو گا۔ جو آدھا اندر گیا ہو گا اور سانپ کے منہ میں تعویذ ہو گا۔ ایک عامل سٹینڈرڈ پریکٹس سے بآسانی ایسا کر دکھاتا ہے۔

ایک صاحب یہاں تشریف لایا کرتے تھے..... نواز صاحب۔ اب اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں غریق رحمت فرمائے۔ رُوحانیت کے حصول کی راہ پر وہ بھی چلے تھے۔ انسان کو جب رُوحانیت حاصل ہوتی ہے تو اولین مسئلہ اس میں یہ درپیش ہوتا ہے کہ انسان کو جنات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اگر انسان اللہ کی راہ پر چلتا رہے تو جنات سے گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ یہ Phase کچھ عرصہ تک رہتا ہے۔

اگر انسان اللہ کی راہ پر چلتا رہے تو یہ Phase گزر جاتا ہے۔ نواز صاحب جب اس Phase پر پہنچے جہاں جنات سے گفتگو ہوتی ہے تو وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب وہ چاہتے تھوڑا سا پڑھتے اور جنات حاضر ہو جاتے۔ وہ لوگوں سے رقم لے کر اُن جنات کے ذریعے اُن کا کام کروا دیتے۔ لیکن سب سے مزے کا کام وہ یہ کرتے تھے کہ جب دیکھتے کہ اُن کے پاس Clients کی کمی ہو رہی ہے تو وہ پبلسٹی کا ایک دلچسپ انداز اپناتے۔ گکھڑ سے لاہور آنا ہوتا تو خود بیچارو کی پچھلی نشست پر بیٹھ جاتے اور جن سے کہتے کہ گاڑی ڈرائیو کرو۔ یوں گاڑی بغیر ڈرائیور کے چلتی جاتی اور اُن کی شہرت ہوتی جاتی۔ یہ بھی ایک عمل ہے جس سے جنات کو بلا لیا جاتا ہے۔

مختلف قسم کے عملیات کرنے والے حضرات عامل کہلاتے ہیں۔ ان عامل حضرات کے برعکس فقیر ان سب چیزوں سے دُور بھاگتا ہے۔ اُسے چاہت ہوتی ہے تو صرف رب کی۔ وہ تو اُس کی ملاقات کے تصور میں کھویا ہوا عبادت کرتا چلا جاتا ہے کہ کبھی تو مجھے میرا رب ملے گا۔ وہ جب رُوحانی علم میں ترقی کر رہا ہوتا ہے تو پہلے جنکشن میں اُسے جنات دکھائی دینے لگتے ہیں اور اُن سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور سیر و تفریح کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بزرگانِ دین جو دُنیا سے گزر چکے ہیں اُن سے ملاقاتیں ہونے لگتی ہیں۔ یہ مرحلہ بھی گزر جانے کے بعد وہ آسمانوں کی سیر کرنے لگتا ہے اور فرشتوں سے ملاقات کرنے لگتا ہے لیکن ان تمام مراحل میں فقیر خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں کوئی چیز اُس کی راہ کو کھوٹا نہ کر دے کیوں کہ یہ سارے مشاہدات و تجربات اُس فقیر کو اُس کی اصل راہ سے Distract کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

سیر اور ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ اُس فقیر کو کرامات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ اُس کے ہاتھ سے کرامات سرزد ہوتے دیکھ کر بے تحاشا لوگ اُس کی طرف لپکتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ فقیر اپنی اصل راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ لہٰذا کوشش اُس کی یہی ہوتی ہے کہ وہ ان کرامات، مشاہدات اور ملاقاتوں کو نظر انداز کر دے۔

جب درویش یا فقیر مستجاب الدعوات اور صاحبِ امر ہو جاتا ہے تو ایک بار پھر خلقِ خدا اُس کا پیچھا کرنے لگتی ہے۔ ایک بار پھر اُس کے Distract ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ اور کچھ نہیں ہوگا تو صاحبِ امر ہونے کی صورت میں جب اُس کی زبان سے نکلی ہوئی بات پوری ہونے لگے گی تو لوگ اُس کی توجہ اس طرف مبذول کروانے لگیں گے ''واہ صاحب! آپ کی کہی ہوئی باتیں تو پوری ہو جاتی ہیں۔'' نتیجہ یہ نکلے گا کہ اُس

میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ میں گناہوں میں بے پناہ ڈوبا ہوا ہوں۔ میرے اندر سرکشی بھی ہے۔ جب میں پہلی بار عمرہ کرنے جا رہا تھا تو میں نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دُعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔ میں باب فہد سے مسجد الحرام میں داخل ہوا۔ تب میں نے کوشش کی کہ جب تک میں یہاں ہوں تب تک ہی کم از کم انسان بن جاؤں۔ اپنی طرف سے تو دل میں سوچا کہ فلاں فلاں دُعائیں پڑھنے کے بعد ایک خاص دُعا مانگوں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک دم بے ساختہ میری زبان سے نکلا:۔

> "یا باری تعالیٰ! یہ ساری دُعائیں نہ مجھے پڑھنا آتی ہیں نہ میں پڑھوں گا۔ تو دلوں کا حال جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں سچے دل سے تجھے اپنا رب مانتا ہوں۔ اور خود کو تیرا بندہ تسلیم کرتا ہوں۔ سنا ہے کہ تیرے گھر پر پہلی نظر پڑے تو جو مانگا جائے تو وہ عطا کر دیتا ہے۔ سو آج تیرے اندر کچھ دینے کا حوصلہ ہے تو چھوڑ اس ساری دُنیا کو اور تو صرف میرا ہو جا۔"

یہ بات ایک زمانہ پہلے کی تھی جسے اُن کرنل صاحب نے نہ جانے کس طرح Work out کر کے اپنی بھتیجی کو بتایا کہ زندگی میں یہ پہلا شخص میں نے دیکھا ہے جو بھگوان کو اپنی پراپرٹی سمجھتا ہے۔

پیش گوئیوں میں Accuracy کا انحصار اس بات پر ہے کہ پیش گوئی کرنے والا انسان درحقیقت کس قدر نیک ہے۔ کرنل صاحب بہت نیک انسان تھے۔ اپنی تمام آمدنی ایک یتیم خانہ چلانے پر صرف کرتے تھے اور محض پنشن پر گھر کا گزارہ کرتے۔ چونکہ ان کی Concentration بہترین تھی اس لیے اُن کی باتوں میں Accuracy بھی آ گئی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ جہاں بھی انسانی عقل اور ذہن کا دخل ہوگا وہاں غلطی کا امکان ہمیشہ رہے گا۔ یہ تمام علوم جو Mystic sciences کا حصہ ہیں ان میں غلطی کا احتمال ممکن ہے۔ انہی علوم کی ایک شاخ "عملیات" بھی ہے۔ آپ نے کوئی جن قابو کرنا ہے تو مخصوص عمل کر کے جن قابو کر لیں۔ وہ تین اور علم آج کل بڑے مشہور ہیں۔ اگر انھیں انسان ایک خاص مدت تک خاص وقت میں پڑھے تو وہ کہیں سے بھی تعویذ دھاگے اور سری برآمد کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگ چند دنوں میں اس عمل میں مہارت حاصل کرنے کے بعد لوگوں کو بتانے لگتے ہیں کہ تم پر تو بڑا سخت جادو ہوا ہے۔ تم اپنی استعمال شدہ قمیص یا بنیان یہاں بچھا دو۔ کچھ ہی دیر بعد روشن دان سے آ کر تعویذ نیچے گرنے لگیں گے...... یہ عمل ہے۔

اسی طرح ایک اور علم ہے جس سے میں واقف ہوں۔ عامل حضرات آپ سے کہیں گے کہ آپ کے گھر میں جو ایک گملا ہے آپ نے ایک بار اُس میں پودا لگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اُگا نہیں۔ اس گملے کی مٹی باہر نکالیں اور اُسے اُلٹ دیں۔ اب آپ گھر جا کر گملے کی مٹی اُلٹیں گے تو اُس میں سے سانپ کی سری برآمد ہوگی۔ سانپ کی دائیں آنکھ میں ایک کیل لگا ہوا ہوگا۔ جو آدھا اندر گیا ہوگا اور سانپ کے منہ میں تعویذ ہوگا۔ ایک عامل سٹینڈرڈ پریکٹس سے بآسانی ایسا کر دکھاتا ہے۔

ایک صاحب یہاں تشریف لایا کرتے تھے...... نواز صاحب۔ اب اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت فرمائے۔ رُوحانیت کے حصول کی راہ پر وہ بھی چلے تھے۔ انسان کو جب رُوحانیت حاصل ہوتی ہے تو اوّلین مسئلہ اس میں یہ درپیش ہوتا ہے کہ انسان کو جنات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اگر انسان اللہ کی راہ پر چلتا رہے تو جنات سے گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ یہ Phase کچھ عرصہ تک رہتا ہے۔

اگر انسان اللہ کی راہ پر چلتا رہے تو یہ Phase گزر جاتا ہے۔ نواز صاحب جب اس Phase پر پہنچے جہاں جنات سے گفتگو ہوتی ہے تو وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب وہ چاہتے تھوڑا سا پڑھتے اور جنات حاضر ہو جاتے۔ وہ لوگوں سے رقم لے کر اُن جنات کے ذریعے اُن کا کام کروا دیتے۔ لیکن سب سے مزے کا کام وہ یہ کرتے تھے کہ جب دیکھتے کہ اُن کے پاس Clients کی کمی ہو رہی ہے تو وہ پبلسٹی کا ایک دلچسپ انداز اپناتے۔ گکھڑ سے لاہور آنا ہوتا تو خود پجارو کی پچھلی نشست پر بیٹھ جاتے اور جن سے کہتے کہ گاڑی ڈرائیو کرو۔ یوں گاڑی بغیر ڈرائیور کے چلتی جاتی اور اُن کی شہرت ہوتی جاتی۔ یہ بھی ایک عمل ہے جس سے جنات کو بلا لیا جاتا ہے۔

مختلف قسم کے عملیات کرنے والے حضرات عامل کہلاتے ہیں۔ ان عامل حضرات کے برعکس فقیر ان سب چیزوں سے دُور بھاگتا ہے۔ اُسے چاہت ہوتی ہے تو صرف رب کی۔ وہ تو اُس کی ملاقات کے تصور میں کھویا ہوا عبادت کرتا چلا جاتا ہے کہ کبھی تو مجھے میرا رب ملے گا۔ وہ جب رُوحانی علم میں ترقی کر رہا ہوتا ہے تو پہلے جنکشن میں اُسے جنات دکھائی دینے لگتے ہیں اور اُن سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور سیر و تفریح کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بزرگانِ دین جو دُنیا سے گزر چکے ہیں اُن سے ملاقاتیں ہونے لگتی ہیں۔ یہ مرحلہ بھی گزر جانے کے بعد وہ آسمانوں کی سیر کرنے لگتا ہے اور فرشتوں سے ملاقات کرنے لگتا ہے لیکن ان تمام مراحل میں فقیر خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں کوئی چیز اُس کی راہ کو کھوٹا نہ کر دے کیوں کہ یہ سارے مشاہدات و تجربات اُس فقیر کو اُس کی اصل راہ سے Distract کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

سیر اور ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ اُس فقیر کو کرامات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ اُس کے ہاتھ سے کرامات سرزد ہوتے دیکھ کر بے تحاشا لوگ اُس کی طرف لپکتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ فقیر اپنی اصل راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ لہٰذا کوشش اُس کی یہی ہوتی ہے کہ وہ ان کرامات، مشاہدات اور ملاقاتوں کو نظر انداز کر دے۔

جب درویش یا فقیر مستجاب الدعوات اور صاحب امر ہو جاتا ہے تو ایک بار پھر خلقِ خدا اُس کا پیچھا کرنے لگتی ہے۔ ایک بار پھر اُس کے Distract ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ اور کچھ نہیں ہوگا تو صاحب امر ہونے کی صورت میں جب اُس کی زبان سے نکلی ہوئی بات پوری ہونے لگے گی تو لوگ اُس کی توجہ اس طرف مبذول کروانے لگیں گے "واہ صاحب! آپ کی کہی ہوئی باتیں تو پوری ہو جاتی ہیں۔" نتیجہ یہ نکلے گا کہ اُس

فقیر میں تکبر پیدا ہو جائے گا اور اس راہ میں کی گئی اُس کی تمام محنت رائگاں چلی جائے گی۔

وہ لوگ جو صرف اور صرف رب تعالیٰ کے متلاشی ہیں اور اس راہ میں مشقتیں اُٹھا رہے ہیں درحقیقت وہی اہل فقر ہیں۔

سوال: سلطان، صدر، King (بادشاہ)، Ruler (حکمران) ایک بہت اہم Public post ہے۔ اِن کا انتخاب کیسے ہونا چاہیے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمایئے۔

جواب: میں حافظ قرآن تو نہیں لیکن قرآن پاک کا کچھ علم ضرور میں نے حاصل کیا۔ اسی طرح میں محدث تو نہیں لیکن علم حدیث کا ادنیٰ طالب علم ضرور ہوں۔

مسلمانوں کے امیر کے انتخاب کا طریقہ کار قرآن پاک میں وضاحت سے بیان نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسلامی شریعت کے چار ستون ہیں:۔

1۔ قرآن

2۔ حدیث

3۔ سنت

4۔ اجماع

جو چیز قرآن سے نہ ملے اُسے ہم حدیث سے معلوم کر لیتے ہیں اور جو بات حدیث سے معلوم نہ ہو وہ ہم سنت کے ذریعے جان لیتے ہیں اور جب وہاں بھی نہ ملے تو اجماع کے ذریعے کسی بھی مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں۔ جس میں مستند اصحاب علم جن کے تقویٰ پر زیادہ تر مسلمان متفق ہیں، وہ مل بیٹھ کر مسئلہ پر غور وخوض کے بعد جو نقطۂ نظر یا فیصلہ دیں گے اُسے اپنا لیا جائے گا۔ کیوں کہ اسلام میں زیادہ تر احکامات Symbolic ہیں۔ باریکیوں میں اُن کی تشریح نہیں کی گئی اور یقیناً اس میں بھی حکمت تھی۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ اُن احکامات کی تشریح ہے۔ عملی قرآن ہے۔ اگر ہم آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کو باریکی سے دیکھیں تو تمام احکامات الٰہی کی تشریح از خود ہو جاتی ہے۔ ان احکامات کی Implementation کا طریقہ بھی سامنے آجاتا ہے اور اس کے جو نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اُن کی نظیر بھی ہمارے سامنے آجائے گی۔

امیر المومنین کے انتخاب کے حوالے سے آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہمیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ لہٰذا ہم خلفائے راشدین کی حیات مبارکہ کا جائزہ لیں گے جہاں سے ہمیں امیر المومنین کے چناؤ کا طریقہ معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ اپنے وقت کے سرکردہ عوامی لیڈرز جن کی سچائی، دیانت داری اور تقویٰ پر کسی شخص کو کوئی شک نہیں تھا وہ سب لیڈر اکٹھے بیٹھ کر غور وخوض کے بعد آئندہ کے امیر المومنین کا انتخاب کر لیتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے وقت نزع میں یہ Advice دی تھی۔ یہ وصیت نہیں تھی محض رائے کا اظہار تھا کہ اُن کی سوچ کے مطابق مسلمانوں کا امیر بننے کے لیے حضرت عمرؓ سے معتبر اور کوئی نہیں۔ یہ محض اُن

کی رائے اور Advice تھی، وصیت نہ تھی۔ لیکن لوگوں نے اسے وصیت کا نام دے دیا۔

اسلام میں حکومتی معاملات میں وراثت کا کوئی تصور نہیں۔

مدینہ منورہ کے آٹھ سرکردہ لوگ جن کے تقویٰ، سچائی، ایمان داری اور دیانت داری پر کسی کو شک نہیں تھا انھوں نے بیٹھ کر باہمی مشورہ سے امیر المومنین کے انتخاب کا فیصلہ کیا۔ چاروں بار یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ فیصلہ کرنے کے بعد اس کا اعلان کر دیا گیا اور اگلے دن مسجد نبوی ﷺ میں لوگوں سے بیعت لے لی گئی۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہی طریقہ رائج رہا۔ بعدازاں بدقسمتی سے چراغوں میں روشنی نہ رہی اور ہم ملوکیت کی راہ پر چل نکلے۔ بہرحال امیر المومنین کے انتخاب یا چناؤ کا بہترین طریقہ وہی تھا جو خلفائے راشدین کے زمانہ میں اپنایا گیا۔

سوال: کیا مقدس اوراق کو جلایا جاسکتا ہے؟

جواب: بہتر تو یہی ہے کہ صاف بہتے ہوئے پانی میں ان مقدس اوراق کو بہا دیا جائے لیکن شہروں میں صاف بہتے پانی کی عدم دستیابی کے باعث ان اوراق کو جلایا بھی جاسکتا ہے لیکن اس کو پریکٹس نہ بنایا جائے تو بہتر ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ یہ خیال کر کے نماز پڑھنا افضل ہے کہ میں رب کو دیکھ رہا ہوں۔ کیا رب تعالیٰ کو کسی شکل کا تصور کرنا چاہیے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تصور کہ رب مجھے دیکھ رہا ہے یا میں رب کو دیکھ رہا ہوں اپنے معنوی نہیں بلکہ اصطلاحی معنوں میں بطور استعارہ کہی گئی ہے۔ مثال کے طور پر آپ سے یہ کہا جائے کہ آپ اس کمرہ میں بیٹھ کر ہوم ورک کریں لیکن یہ دھیان رکھنا کہ میں تمھیں دیکھ رہا ہوں یا تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ اب اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص یہاں پر موجود ہے اور کسی جھروکے سے آپ کو جھانک رہا ہے۔ اس کے کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ دھیان اور توجہ سے کام کرنا اور کہیں سو نہ جانا کیوں کہ جب تمھارا کیا ہوا کام میرے سامنے آئے گا تو میں جان لوں گا کہ تم نے کیا کیا۔

''نماز اس طرح پڑھو کہ گویا تم رب کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم نہیں دیکھتے تو وہ تو دیکھتا ہی ہے۔''

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر 1)

اس حکم کا مقصد نماز میں ہمارے خشوع و خضوع میں اضافہ کرنا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو تو رب تعالیٰ کی طرف راغب ہونے کے لیے بھی حوروں کا لالچ چاہیے۔ ہم لوگ اظہار تشکر کے طور پر رب تعالیٰ کی طرف راغب نہیں ہوتے۔

رب تو وہ ہے جو ہماری سرکشی اور نافرمانی کے باوجود ہمیں خوب صورت طریقے سے پال رہا ہے۔

ہمارے سوال سے بھی پہلے ہماری ضروریات پوری فرما دیتا ہے۔ میرا رب تعالیٰ بغیر مجھ سے کوئی توقع رکھے، بغیر یہ دیکھے کہ میرے رویے کیا ہیں بہت فیاضی سے مجھے پال رہا ہے۔ یہ خیال اور سوچ انسان میں جذبہ احسان شناسی اور شکر گزاری پیدا کرتا ہے۔ شکر گزاری کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ انسان کسی کو سجدہ کر دے۔ اسی لیے تو رب کو سجدہ بہت پسند ہے اور کوئی ہم پر اتنا احسان نہیں کرتا جتنا کہ رب۔ اس لیے سجدہ صرف رب کو سزاوار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو دوسرے انسان کا اس درجہ کا محتاج نہیں کیا کہ دوسرا انسان اُس پر اتنا بڑا احسان کر دے۔ کہ وہ شکر گزاری میں اُسے سجدہ کرنے لگے۔ یہ تو صرف رب ہے جو اتنا بڑا محسن ہے۔ ہمیں اس قدر Look after کرتا ہے۔ اس حد تک پالتا اور نوازتا ہے کہ سجدہ اُسی کو سزاوار ہو جاتا ہے۔

ایک اور بات ذاتی تجربہ سے بیان کر دوں۔ مسجد میں فرض نماز میں تو امام کی اقتدا ضروری ہے۔ دیگر نمازوں میں انسان اپنی مرضی سے قیام کر کے رُکوع و سجود کو طویل کر سکتا ہے۔ طویل سجدہ سے انسان بہت جلد اللہ کے قریب ہو جاتا ہے۔ اگر طویل سجدہ کر لیا جائے تو رب جلد مل جاتا ہے۔ یہ ایک نکتہ ہے اس کو آزما کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو رب کی قربت کا احساس ہوگا۔ دوسرا یہ ہے کہ فارغ اوقات میں جب آپ اکیلے ہوں تو رب تعالیٰ سے گفتگو کی عادت ڈال لیے۔ اس طریقے سے بھی رب بڑی جلدی مل جاتا ہے۔ یہ دو چیزیں اور مشقیں انسان کو قربِ الٰہی کے حصول میں بہت مدد دیتی ہیں۔ عموماً ہمارا رابطہ رب کے ساتھ بہت محدود سا رہتا ہے۔ (آپ سب تو نیک لوگ ہیں۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔) ہم نماز کے بعد اپنی ساری دُعا میں دُنیاوی مسائل و ضروریات کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ رزق، اولاد، بیماری ہی ہماری دُعا کے موضوعات ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ان سب کی بجائے ہم رب تعالیٰ سے صرف ایک چیز مانگ لیا کریں۔ اُس سے کہا کریں

"یا اللہ! یہ سب کچھ اپنا اُٹھا کر لے جا۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے تو بس اپنا آپ عطا کر دے۔"

تین چار روز بعد آپ دیکھے گا کہ کس قدر یکسوئی آپ کی دُعا میں آگئی ہے۔ ایسی Feelings ہوں گی کہ انسان خود کو گھومتا ہوا (off balance) محسوس کرے گا۔ یہ دراصل رب تعالیٰ کی طرف Concentration ہو جانے کا اشارہ ہے۔ اس کے اثرات ذہن پر یہ آتے ہیں کہ پہلے یوں لگتا ہے کہ جیسے چکر آ رہے ہیں اور اس کے بعد پھر اسرار کھلنے لگتے ہیں۔ انسان رب سے رب ہی کو مانگتا چلا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے...... "یا رب! مجھے بڑا شوق ہے۔ کسی وقت اپنا تخت تو دکھا دے۔" آپ کے یہ دُعا کرتے ہی فوراً آپ کی نظروں کے سامنے اُس تخت کی Picture چلنا شروع ہو جائے گی۔ پھر خیال آتا ہے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کو تو دیکھوں فوراً Picture چلے گی اور آپ کو اُن کا سایہ دکھائی دے گا۔ یہاں تک Concentration چلی جاتی ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہ کام نہ کیجئے گا کہ یا اللہ! میں (سستی کے باعث) جوتا پالش نہ کر سکا۔ تو کوئی فرشتہ بھیج تا کہ وہ میرے جوتے پالش کر دے۔ یا پھر تو مجھے کوئی وظیفہ دے دے کہ جس کے پڑھنے سے میرا جوتا خود ہی پالش ہو جایا کرے۔

رب سے ہماری Demands کچھ ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اپنی کوتاہی اور مصروفیات کی وجہ سے بچے کی تربیت ہم خود نہیں کر پاتے اور بچہ بگڑ جائے تو شامت دُعا کرنے والوں کی آجاتی ہے کہ دُعا کریں وہ سدھر جائے۔ اگر غلطی سے دُعا کرنے والا کوئی Sensible (سمجھ دار) آدمی ہے اور وہ حل بتائے کہ آپ بچے کی بہترین تربیت کے لیے فلاں طریقہ اختیار کریں تو وہ کہیں گے کہ آپ عجیب آدمی ہیں ہم دُعا کرانے کے لیے آئے تھے اور آپ ہمیں نیا راستہ دکھا رہے ہیں۔ بھلا یہ کوئی طریقہ ہے۔

اگر ہم دُنیاوی چیزوں کے تقاضوں سے باہر نکل آئیں اور رب تعالیٰ کو مانگنا شروع کر دیا خود رب تعالیٰ سے تو رب کے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ لیکن یہاں یہ ضرور بتا دوں کہ جب آپ نے رب تعالیٰ کو مانگنا شروع کر دیا تو ان مشکلات و مصائب کی ایک جھلک آپ کو ضرور Face کرنا پڑے گی جو پیغمبروں کی زندگی میں آئیں۔

حضرت عبد اللہ بن مغفل بیان کرتے ہیں ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی "یا رسول ﷺ! اللہ کی قسم میں آپ ﷺ سے بہت محبت کرتا ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا "تم سوچ لو کیا کہہ رہے ہو؟" اُس نے عرض کیا "اللہ کی قسم! میں آپ ﷺ سے بہت محبت کرتا ہوں۔" نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "تم سوچ لو کیا کہہ رہے ہو؟" اُس نے عرض کی "اللہ کی قسم! میں آپ ﷺ سے بہت محبت کرتا ہوں۔" یہ مکالمہ تین مرتبہ ہوا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو غربت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہو۔ کیوں کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے فقر اُس کی طرف اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ آتا ہے جتنی تیزی کے ساتھ سیلابی ریلا اپنی منزل کی طرف جاتا ہے۔" (جامع ترمذی، ابواب الزھد باب فضل الفقر، حدیث نمبر 2350)

لہٰذا آپ بھی ذہن میں رکھیے گا کہ اگر آپ نے دُعا میں یہ مانگا کہ یا رب! تو مجھے اپنا آپ عطا فرما دے تو فقر و فاقہ دوڑ دوڑ کر آپ کی طرف آئے گا۔ مشکلات و مصائب کا سامنا بھی آپ کو کرنا پڑے گا لیکن اگر ان مشقتوں میں آپ سرخرو ٹھہرے تو رب تعالیٰ آپ کا ہو جائے گا۔

سوال: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "بے شک جنھوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اُس پر قائم رہے اُن پر فرشتے اُترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور خوش ہو اس جنت پر جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا تھا۔ (سورۃ حم السجدۃ:30)

ایسا عملی طور پر کیوں کر ممکن ہے؟ دُنیا میں کون سے اعمال انسان کو اس مقام تک پہنچا سکتے ہیں؟

جواب: اگر ہم خلق خدا پر مہربان ہو جائیں تو رب تعالیٰ ہم پر مہربان ہو جائے گا۔ جس پر رب تعالیٰ مہربان ہو جائے وہ رفتہ رفتہ غم اور خوف سے دُور ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ کو جیتنا ہے۔ اُس کے قریب جانا ہے۔ اُس کی دوستی حاصل کرنی ہے تو اس کا بہت آسان سا نسخہ ہے کہ آپ رب تعالیٰ کے بندوں پر مہربان ہو جایئے وہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرما دے گا۔

احکاماتِ شرعیہ اور فقر کے تقاضے

سوال: اسلام میں مردوں کو ریشم اور سونا پہننے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: دراصل مرد اور عورت کی Body chemistry میں بہت فرق ہے۔ مرد اور عورت کے Molecular structure کی کیمسٹری میں فرق ہے۔

مرد کے Molecular structure کی Density عورت کی Density سے Double ہے۔ کیمسٹری کے اس فرق کی وجہ سے گولڈ اور (silk) ان مردانہ صفات جن کا تعلق براہ راست Body chemistry سے ہوتا ہے، پر بُرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

آدابِ محفل اور Decency کا تقاضا یہی ہے کہ اس موضوع پر زیادہ کھل کر بات نہ کی جائے۔ بہر حال یہ یاد رکھیے کہ اسلام کے ہر حکم کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ مرد ریشم اور سونا نہ پہنیں، اس کی وجہ مردوں کی Body chemistry کو ان چیزوں کے منفی اثرات سے محفوظ رکھنا ہے۔

سوال: کیا بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا فیض ابھی تک جاری ہے؟

جواب: بابا تاج الدین اولیاء کا ''فیض'' ہی نہیں بلکہ ''حکم'' بھی ابھی تک جاری ہے۔ سلسلہ کا چلنا اور Disciples کا وجود میں آنا اُن بزرگ کی تعلیمات کو جاری رکھنے کا سبب بنتا ہے۔ اسی کو ''فیض'' کہتے ہیں۔ جب کہ ''حکم'' بمعنی تصرفات کے ہے۔ عموماً اولیاء جب دُنیا سے رُخصت ہو جاتے ہیں تو رب تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ تصرفات بھی ساتھ ہی منقطع ہو جاتے ہیں۔ لیکن کچھ اولیاء اپنی اطاعت و فرماں برداری سے اللہ کو اس درجہ خوش کر دیتے ہیں کہ رب تعالیٰ اُن کو اپنی رحمت کے صدقے اُس مقام پر فائز کر دیتا ہے کہ اُن کے وصال کے بعد بھی اُن کے تصرفات ایک حد تک جاری رہتے ہیں۔ بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی ایسے ہی بزرگوں میں ہوتا ہے جن کا تصرف آج بھی قائم ہے۔ اسے رُوحانی اصطلاح میں یوں کہا جاتا ہے کہ اُن کا ''حکم'' آج بھی جاری ہے۔ یاد رکھیے فیض اور تصرفات میں فرق ہے۔

سوال: کیا نجومی کو ہاتھ دکھانے سے نماز قبول نہیں ہوتی؟

جواب: یہ محض روایات ہیں۔ ورنہ صرف ایک کوتاہی سے انسان کی دوسری نیکیاں اس طرح ضائع نہیں ہوتیں سوائے اس کے کہ انسان شرک میں مبتلا ہو جائے۔

حسد و تکبر بھی نیکیوں کو کھا جاتا ہے۔ لیکن حسد و تکبر کے بعد انسان جو عبادات کر رہا ہوتا ہے وہ قبول ہوتی ہیں۔ اسلام میں ہاتھ دکھانے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ہاتھ دکھاتا ہے تو یہ اس کا گناہ ہے کہ اُس نے رب تعالیٰ کا حکم نہیں مانا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ کسی انسان نے ایک بار پامسٹ کو ہاتھ دکھا دیا تو اُس کی آئندہ ہونے والی عبادات کبھی بھی قبول نہیں ہوں گی۔ یہ درست ہے کہ اُس کا یہ گناہ اُس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جائے گا۔ لیکن اُس کے آئندہ کیے جانے والے اچھے اعمال کی نیکیاں اور ثواب بھی اُس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا رہے گا بشرطیکہ وہ عبادات دکھاوے اور ریاکاری سے پاک ہوں۔

بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں انصاف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عفو و درگزر بھی بے پناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی جبار و قہار جیسی صفات شاذ و نادر ہی استعمال کرتا ہے۔ زیادہ تر اُس کی رحمٰن و کریم اور غفور الرحیم ہونے کی صفات Exercise ہوتی ہیں۔ وہ اپنی رحیمی اور رحمت کے صدقے بڑے سے بڑا گناہ معاف کرتا رہتا ہے ماسوائے شرک کے۔ رب تعالیٰ کے بارے میں اچھے گمان ہی رکھنے چاہییں اور وہ اچھا ہی کرے گا۔ رب تعالیٰ کو اگر ہم غفور الرحیم اور ستار ہونے کے ناتے سے جانیں تو وہ اپنی رحمت کے صدقے ہمارے ساتھ معاملہ رحمٰن و رحیم، غفور الرحیم، کریم اور ستار کا ہی کرے گا۔

سوال: نیل پالش لگی ہو تو کیا نماز ہو جائے گی؟

جواب: نماز وضو سے مشروط ہے۔ اگر کسی شخص کا وضو ناقص ہے تو اُس کی نماز نہیں ہوتی۔ بلکہ اُلٹا یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ انسان بغیر وضو کے نماز پڑھ لے۔ وضو کے کچھ آداب، فرائض، سنتیں اور واجب ہیں۔ وضو کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ انسانی عضو جسے وضو میں دھونا ضروری ہے اگر خشک رہ گیا تو وضو نہیں ہوگا۔

نیل پالش ایک Waterproof covering ہے اور اس Covering کے نیچے جو عضو ہوتا ہے وہاں تک پانی نہیں پہنچ پاتا۔ جب تک مطلوبہ اعضا گیلے نہیں ہوں گے، وضو نہیں ہوگا۔

خواتین کی زیبائش اگر اُن کے Husband کے لیے ہو تو پسندیدہ ہے۔ نیل پالش بھی زیبائش کا حصہ ہے۔ آج کل Nail polish remover بازار میں بآسانی دستیاب ہیں۔ اگر نیل پالش لگانا ناگزیر ہو تو بوقت ضرورت Remover سے اُسے صاف کر لیا جائے اور وضو کر کے نماز ادا کر لی جائے۔ نیل پالش لگی ہو تو وضو نہیں ہوتا۔

ایک صاحب اپنے وقت کے مشہور عالم تھے اور اُنھیں اپنے علم پر فخر بھی بہت تھا۔ ایک بار وہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لائے۔ حضرت حسن بصری علم کے ہی نہیں فقر کے بھی بلند مقام پر فائز تھے۔

بدقسمتی سے علماء کو اہلِ فقر کے اُسلوب پر اکثر اعتراض رہتا ہے۔ وہ عالم بھی مختلف علمی معاملات پر حضرت حسن بصری کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے اور اس گفتگو میں احساسِ تفاخر کا عنصر خاصا نمایاں تھا۔ جس کو بھانپتے ہوئے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے فرمایا "حضرت! آپ کے داہنے ہاتھ میں جو انگوٹھی ہے یہ آپ نے کب سے پہن رکھی ہے۔" اُنھوں نے کہا "جب میں لڑکپن میں تھا تو جب ایک رشتہ دار کے عطا کرنے پر یہ انگوٹھی میں نے پہنی تھی۔ اور اُس وقت سے یہ میری اُنگلی میں ہے۔" حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "حضرت! آپ جن نمازوں پر ناز کر رہے ہیں کہ بچپن سے کبھی آپ سے نماز قضا نہیں ہوئی۔ وہ نمازیں تو دراصل ادا ہی نہیں ہوئیں کیوں کہ آپ کا جسم فربہ ہونے کے باعث یہ انگوٹھی اُنگلی کے گوشت میں دھنس چکی ہے جس کی وجہ سے آپ کی اُنگلی کا اتنا حصہ کبھی بھی وضو کے دوران گیلا نہیں ہو پایا اور یوں آپ کا وضو ناقص رہ گیا۔ ناقص وضو کے ساتھ ادا کی جانے والی تمام نمازیں اب آپ کو لوٹانا ہوں گی۔"

سوال: کیا اذان کے وقت سر پر دوپٹا رکھنا ضروری ہے؟ اگر ضروری ہے تو کیوں؟

جواب: تقریباً ہر معاشرے میں صنعتی ترقی ہونے سے قبل یہ دستور رہا ہے کہ شرفا سر ڈھانپ کر رکھتے تھے حتیٰ کہ یورپ جہاں لوگ آج Skinhead لیے پھرتے ہیں اور سر پر اُسترا پھرواتے ہیں وہاں بھی شرفا ایک زمانہ میں Hat لیتے تھے۔ مشرقی معاشروں میں بھی تب بزرگوں کے سامنے حاضر ہونے کے آداب میں یہ شامل تھا کہ مرد سر پر ٹوپی اور عورتیں دوپٹا یا چادر لیتی تھیں۔

اذان چونکہ کائنات کی بلند ترین ہستی رب تعالیٰ کی طرف بُلاوا ہے کہ اُس کی طرف رُجوع کرو۔ اذان میں رب تعالیٰ کے بعد جو بلند ترین ہستی ہیں اُن کا ذکر بھی آتا ہے۔ لہٰذا احترام کا تقاضا ہے کہ جب رب تعالیٰ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آئے تو احتراماً سر ڈھانپ لیا جائے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ اہلِ فقر درود پاک پڑھتے ہوئے سر سیدھا نہیں رکھتے بلکہ جُھکا لیتے ہیں۔ یہ ادب کا تقاضا ہے کہ درود پاک پڑھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی اور عظمت کے سامنے سر جُھکا لیا جائے۔

سر پر دوپٹا رکھنا ہماری معاشرتی اقدار اور اخلاقی بلندی کا مظہر ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان مند ہیں کہ اُنھوں نے ہم تک اللہ کا سچا پیغام پہنچایا اور ہمیں وہ سیدھا راستہ دکھا دیا جس پر چل کر ہم دونوں جہانوں میں سلامتی حاصل کر سکتے ہیں۔

جب ہم درود پاک پڑھتے ہیں تو اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرورت نہیں۔ جس ہستی پر رب تعالیٰ خود درود بھیجے، اُس کے اَن گنت فرشتے درود بھیجیں۔ وہ ہستی ہمارے درود کی محتاج نہیں ہو سکتی۔ ہمارا درود بھیجنا تو دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر کیے جانے والے احسان کی Acknowledgement ہے۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج کر اس احسان مندی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح تعظیماً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آنے پر سر کو ڈھانپ لینا ہمارے اخلاق کی علامت ہے۔ اسی طرح بہتر ہو گا کہ درود پاک پڑھتے ہوئے فقراء کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ہم سر کو جُھکا لیا کریں۔

سوال: رزق حلال کیا ہے؟

جواب: ہر وہ چیز جس کو انسان ذہنی یا جسمانی محنت کے بعد جائز طریقے سے حاصل کرے وہ رزق حلال ہے۔ یہ بہت وسیع اصطلاح کا حامل ہے۔ اگر کسی کا مال اُس کی مرضی کے خلاف ہم حاصل کر لیں تو وہ رزق حلال میں نہیں آئے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی محنت کی کمائی اپنی خوشی سے دے دے تو یہ "مباح" ہے اور "ہدیہ و تحفہ" کے زمرے میں آئے گا۔ یاد رکھیں! کسی شخص کی مرضی کے خلاف اُس کا مال لینا، کسی شخص کی لاعلمی میں اُس کے مال کو صرف کرنا یا دھوکا دہی سے کسی کے مال کو استعمال کرنا رزق حلال نہیں ہے۔

رزق حلال وہی ہے جس کے لیے ہم اس کا بدلہ پورا ادا کر دیتے ہیں۔ جسے ہم Value for money کہتے ہیں۔ ہم ملازمت کرتے ہیں۔ اس کی کچھ شرائط تو ہمارے Appointment letter پر درج ہوتی ہیں جب کہ کچھ احاطۂ تحریر میں نہیں لائی جاتیں لیکن بہت واضح ہوتی ہیں۔ ایک شق یہ بھی ہوتی ہے کہ ہمارا Employer خواہ وہ گورنمنٹ ہے یا پرائیویٹ سیکٹر، ہمیں کہیں بھی ٹرانسفر کر سکتا ہے اور ہمیں اس پر شکایت یا اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ٹرانسفر ہو جانے کی صورت میں اُسے رکوانے کے لیے ہم مختلف حربے استعمال کرنے لگتے ہیں۔

حتیٰ کہ صاحبانِ دُعا تک جا پہنچتے ہیں۔ حالانکہ Terms and Conditions کی بنیاد پر ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح اگر ایک Assignment سے دوسری Assignment پر ہمیں Shift کر دیا جائے تب بھی ہم Resist (مزاحمت) کرتے ہیں۔

اہلِ فقر ایسا نہیں کرتے۔ وہ آپ ﷺ کی سنت مبارکہ پر عمل کرتے ہیں اور معاہدہ خواہ تحریری ہو یا زبانی اس کی پاس داری کرتے ہیں۔ ملازمت کے اوقاتِ کار متعین ہوتے ہیں لیکن ہم بہت دھڑلے سے اس میں ذاتی کام بھی کرتے ہیں اور ذاتی Calls بھی کرتے ہیں اور ذاتی دوستوں اور مہمانوں سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔ یہ سب ہمارے رزق حلال کو مشکوک کر دیتا ہے۔

جب تک ہم دفتر میں موجود ہیں تو دفتری اوقاتِ کار میں ہم دفتری معاملات و اُمور کی انجام دہی کے لیے پابند ہیں۔ اس میں No phone calls, No chit chat۔ اگر ناگزیر وجوہات کی بنا پر کبھی ایسا کرنا پڑ بھی جائے تو فقیر یہ کرے گا کہ جتنا وقت اُس نے ذاتی کاموں کو دیا ہے اُتنا زائد وقت (Extra time) وہ دفتر کو دے گا تاکہ اُس کا رزق مشکوک ہونے سے بچ جائے۔

سوال: دُنیا کے رویوں پر راضی رہنا چاہیے یا اللہ تعالیٰ سے تبدیلی کی دُعا کرنی چاہیے؟

جواب: دو طرح سے بات ہے

1۔ لوگ کیا کر رہے ہیں؟

2۔ میں کیا کر رہا ہوں؟

ان دو پہلوؤں میں سے زیادہ اہم یہ ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ انسان دوسرے کی طرف اُسی وقت دیکھتا ہے جب اُسے اپنے آپ سے فرصت مل جائے۔ مجھے دوسروں کے نقائص اسی وقت نظر آئیں گے جب میری ذات نقائص سے پاک ہو جائے گی۔

جس طرح ہوائی سفر میں Safety instructions کے دوران بتایا جاتا ہے کہ صاحب! اگر آکسیجن کم ہو جائے تو ماسک خود بخود آپ کے سامنے آگرے گا۔ اس سے ناک اور منہ ڈھانپ کر نارمل طریقے سے سانس لینے کے لیے اپنا ماسک خود لے لیجیے۔ اسی طرح دوسروں کو Dress up ہونے میں مدد دینی ہو تو پہلے انسان خود Dress up ہوتا ہے۔ یہی بات کاروبارِ دُنیا پر لاگو ہوتی ہے۔ کوئی انسان کیا کر رہا ہے؟ اس کے کام میں کیا نقائص ہیں؟ اُس کے Failures کہاں کہاں موجود ہیں؟ اُس کی Strengths اور Weaknesses کیا ہیں؟ یہ سب کچھ اُسی وقت دیکھا جا سکتا ہے جب ہم اپنے Faults کو Remove کر چکے ہوں۔ اگر میں اپنے Faults کو دُور کیے بغیر دوسروں کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھتا ہوں تو پھر وہی ہوگا جو آج کل ہو رہا ہے۔

فقیر کی اُنگلی دوسروں کی طرف نہیں خود اپنی طرف اُٹھتی ہے۔ انسان خطا کا ایسا پتلا ہے کہ بدقسمتی سے ساری زندگی باوجود کوشش کے وہ اپنی خطاؤں اور کوتاہیوں کو دُور نہیں کر پاتا ہے۔ ایک نقص دُور ہوتا تو دوسرا سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیر دوسروں کے نقائص Point out کرنے کی بجائے ساری زندگی خود کو درست کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اس کا یہی رویہ دوسروں کے لیے Personal Example (ذاتی مثال) قائم کر دیتا ہے جس سے متاثر ہو کر لوگ اُسے Follow کرنے لگتے ہیں۔

لیڈر شپ کی دو تعریفیں ہیں..... ایک مغربی دُنیا اور دوسری رُوحانیت کی نظر میں۔ مغربی شخص لیڈر شپ کی تعریف یوں بیان کرے گا۔

"لیڈر حکم نہیں دیتا بلکہ لوگوں سے اپنی بات منواتا ہے۔"

یہ بات خاصی گہری ہے کہ کوئی شخص حکم دیے بغیر اپنی بات بھلا کیسے منوا سکتا ہے۔ اس کے پیچھے فارمولا یہی ہے کہ لیڈر اپنی ذات کو Personal example کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ یہ کدھر کو جا رہا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ اُس کی اچھائیاں اور بُرائیاں کیا ہیں؟ یوں اُس کی شخصیت سے متاثر ہو کر وہ اُسے Follow کرنے لگتے ہیں۔ اُس کی بات ماننے لگتے ہیں۔

باس (Boss) کسی کو جان دینے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک لیڈر ایسا کر سکتا ہے۔ لوگ اُس کے لیے خوشی سے جان قربان کر دیں گے۔ باس اور لیڈر میں یہی فرق ہوتا ہے۔

فقیر کے نزدیک وہ شخص لیڈر ہے جو اچھے کام کا کریڈٹ لینے میں سب سے پیچھے اور تباہی کی ذمہ داری قبول کرنے میں سب سے آگے ہوتا ہے۔ وہ Discredit لینے میں سرِفہرست اور Credit لینے میں سب

سے آخر میں کھرا نظر آتا ہے۔ یہ رویہ اُسی شخص کا ہوسکتا ہے جو اپنی ذات کے لیے Harsh اور دوسروں کے لیے Soft ہو۔ وہ عمر بھر اپنے نقائص دُور کرنے میں مصروف رہے گا اور اس قدر Polish ہو جائے گا کہ لوگوں کے لیے Lighthouse بن جائے گا جسے دیکھ کر لوگ راستہ پاتے ہیں۔

آپ کے سوال میں جو نکتہ ہے وہ دُعا کا نہیں دوا کا طالب ہے۔ ہم میں سے ہر ایک فکرمند ہے کہ دوسرے لوگ قانون اور ضابطۂ اخلاق کی پابندی کیوں نہیں کرتے۔

انسان اپنی ذات کے لیے Freedom نہیں بلکہ لائسنس مانگتا ہے۔ ایسی آزادی چاہتا ہے کہ وہ جو جی چاہے کرے۔ فریڈم ایسی آزادی ہے جو قواعد وضوابط کی پابند ہے جب کہ لائسنس وہ آزادی ہے جو قواعد و ضوابط سے بالاتر ہے۔

ہم اپنے لیے تو لائسنس مانگتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے قواعد کی غلامی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہی سے مسائل کا آغاز ہوتا ہے۔

فقیر اپنے لیے قواعد کی غلامی اور دوسروں کے لیے آزادی مانگتا ہے اور اس کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

اگر رویے مثبت نہ ہوں تو دُعا کام نہیں آتی۔ اگر رویے بدل لیے جائیں اور ساتھ یہ دُعا کی جائے "یاباری تعالیٰ! ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اپنے رویے بدل لیں اور Law of land کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔"

یوں پہلے توفیق کی دُعا...... اور کوشش کر لینے کے بعد اُس میں برکت اور کامیابی کی دُعا ضروری ہے۔ کوشش کے بغیر دُعا قبول نہیں ہوگی۔ اسی لیے پہلے دوا اور پھر دُعا کیجیے۔

سوال: رُوحانیت کا طالب علم دُنیاداری کو نبھاتے ہوئے کس طرح رُوحانی علوم سیکھ کر اپنی غیب کی آنکھ کھول سکتا ہے؟

جواب: بہت سی دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ رُوحانیت کے بارے میں بھی ایک Misconcept ہے۔ ہم دیگر مذاہب کی تقلید میں اپنے مذہب اور دین کو اُس کی Mainstream سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ جب کہ رُوحانیت آتی ہی دین کے اُس حصہ پر عمل کرنے سے ہے جس حصے کا تعلق حقوق اللہ اور حقوق العباد سے ہے۔ دین کے اُن پہلوؤں پر عمل کیے بغیر انسان میں رُوحانیت پیدا ہو نہیں سکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اگر حقوق العباد میں Required standard (مطلوبہ معیار) سے Beyond (آگے) چلا جاتا ہے تو رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے اُس شخص کی حقوق اللہ کے معاملہ میں کوتاہی معاف فرما دے اور حقوق العباد کی ادائیگی میں بہت آگے چلے جانے کی وجہ سے انعام کے طور پر اُسے رُوحانیت عطا فرما دے۔ لیکن یاد رکھیں کہ حقوق العباد ترک کرنے والے کو رُوحانیت کبھی نہیں ملی۔ میں نے تو ایسا ہی دیکھا، سُنا اور پڑھا ہے۔

حقوق العباد ہمارے دین کا بہت اہم حصہ ہے۔ یہ اور بات کہ اسے Highlight بہت کم کیا جاتا ہے۔

حقوق العباد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں شہید کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ہرگز انھیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔" (سورۂ آل عمران:169)

پھر شہدا کو یہ رعایت حاصل ہے کہ بغیر حساب کتاب کے انھیں جنت میں داخل کردیا جائے گا۔ (یہ رعایت اُن شہدا کے لیے ہے جو راہِ خدا میں مارے گئے) لیکن ایسا بلند مقام رکھنے والے شہدا کے بارے میں بھی ایک حکم ہے کہ اگر انھوں نے دُنیا میں کسی کا قرض ادا کرنا تھا تو وہ اس وقت تک جنت میں نہیں جاسکیں گے جب تک وہ قرض ادا نہیں ہوجائے گا۔ اس حکم سے دینِ اسلام میں حقوق العباد کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مالکِ کُل ہے جو چاہے کرے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ رحیم و کریم ہے۔ لیکن اُس نے اپنے ہی بندے کا حق نہیں چھینا کہ اگر ایک بندہ نے کسی کے ساتھ زیادتی کی تو رب تعالیٰ معاف نہیں کرے گا جب تک وہ بندہ خود اُسے معاف نہ کردے۔

حقوق العباد کی اس اہمیت کے پیشِ نظر فقیر حقوق العباد کی ادائیگی پر بے حد زور دیتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ وہ حقوق العباد کے Required standard (مطلوبہ معیار) سے کہیں آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ فقیر کا ایک Standard ہے کہ اللہ کے ہر بندہ کو اُس کے خطا اور قصور کرنے سے پہلے ہی معاف کردو۔

اگر آپ نے اس بات پر عمل کرلیا۔ کسی شخص کو قصور کرنے سے پہلے ہی معاف کردیا تو آپ کے دل میں موجود غصہ خود بخود ختم ہوجائے گا اور کسی کے خلاف دل میں کوئی گلہ شکوہ پیدا نہیں ہوگا۔ اور جب کسی سے آپ کو شکایت ہی نہیں تو پھر کینہ و بغض بھی پیدا نہیں ہوتا۔ رُوحانیت میں کینہ و بغض اور حسد بے حد خطرناک ہیں۔ اس لیے فقیر اس پہلو پر بہت زیادہ عمل کرتا ہے۔

فقیر ایک اور چیز پر بالخصوص عمل کرتا ہے کہ ہر وہ شخص جو اس کے پاس آرہا ہے...... خواہ وہ اُس کا دوست ہے، رشتہ دار یا کوئی اجنبی...... وہ اُس پر گہری نظر رکھتا ہے کہ کہیں وہ کسی مشکل میں تو نہیں۔ یوں وہ اُس کے درخواست کرنے سے پہلے ہی اُس کی مدد کردیتا ہے اور اس خوب صورتی سے یہ مدد کرتا ہے کہ مدد لینے والے کو اس کا گمان تک نہیں گزرتا۔ فقیر Forthcoming ہوتا ہے۔ دراصل وہ رب تعالیٰ کی سنت پر عمل کررہا ہوتا ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ بن مانگے عطا کرتا ہے۔ فقیر بھی اسی راہ پر چل نکلتا ہے اور یوں رب تعالیٰ اُس سے راضی ہوجاتا ہے۔

دُنیاداری کیا ہے؟ یہ دُنیاداری ہی تو ہے کہ آپ اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ آپ کو اپنے Dependents یعنی والدین، بہن بھائیوں اور بیوی بچوں کی کفالت کرنا ہے۔ فقیر ان فرائض کی انجام دہی میں بہت حساس ہوتا ہے اور Beyond call of duty وہ ان فرائض کو نبھاتا ہے۔ وہ پڑوسیوں کے حقوق آپ ﷺ کی سنت کے مطابق احسن انداز میں ادا کرتا ہے۔ لیکن دین میں خیال رکھتا ہے کہ ترازو کا پلڑا

دوسروں کے حق میں جھکا رہے۔ اُس کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ میرا حق کوئی لے لے لیکن کسی کا حق میری طرف نہ آجائے۔ وہ کسی کے بارے میں بات کرتا ہے تو گواہی کے میزان پر تول کر گفتگو کرتا ہے کہ اس سے کوئی لفظ ایسا نہ ادا ہو جائے جس سے کسی کے ساتھ زیادتی کا اندیشہ ہو۔ وہ دوسروں کی عزت کا پاس دار ہوتا ہے۔ زبان سے کوئی ایسا لفظ، کوئی ایسی بات نہیں نکالتا جس سے کسی کی توہین ہو، عزت پر حرف آئے، کوئی بدنام ہو جائے یا کسی کی دل آزاری ہو۔ یہ سب دُنیاداری ہی تو ہے۔ جب تک مسلمان دُنیاداری کو اُس پیمانے پر نہیں تولتا جو آپ ﷺ نے اپنی عملی زندگی کے ذریعے اس کے لیے Set (قائم) کیا ہے تب تک وہ کسی مقام پر نہیں پہنچے گا۔ رُوحانیت تو بہت دُور کی بات ہے۔

دُنیاداری اور رُوحانی علوم ایک دوسرے کے ساتھ intermingled (باہم مدغم) ہیں۔ انھیں آپ علیحدہ نہیں کر سکتے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی شخص دُنیاداری چھوڑ کر جنگل کی راہ لے لے اور اللہ اللہ شروع کر دے۔

کوئی بھی بند جب آپ باندھتے ہیں شہر کو پانی سے محفوظ کرنے کے لیے۔ اس کی مضبوطی کا اندازہ اُس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک سرکش پانی کی لہریں وہاں ٹکریں نہ ماریں اور سیلاب کا تند ریلا اسے بہا لے جانے کی کوشش نہ کرے۔ آپ بند باندھ دیجیے۔ پانی نہیں آ رہا۔ وہ بند سلامت ہے اور آپ خوش ہیں کیوں کہ اپنی دانست میں آپ نے مضبوط بند باندھ رکھا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ ادھر پانی کا ریلا آیا اور اس نام نہاد مضبوط بند کو بہا کر لے گیا۔ یوں پورا شہر ڈوب گیا۔

دُنیا چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور اللہ اللہ کرنے لگے حتیٰ کہ اپنے زعم میں یہاں تک سمجھنے لگے کہ ہم ولی اللہ ہو گئے ہیں۔ ہر وقت محوِ عبادت جو رہتے ہیں۔ لیکن ادھر ایک جھٹکا آیا۔ بیٹے کی بیماری کی خبر ہمیں ملی۔ اور ہمارا سارا تحمل، صبر، اللہ پر بھروسا اور توکل سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بیٹے کی خبر لینے ہم گھر کی طرف بھاگے۔

یہ کیسی رُوحانیت ہے کہ بیٹے کی بیماری کی خبر پا کر اللہ پر بھروسا ختم ہو جائے۔ گویا بند تو پہلی اطلاع پر ہی ٹوٹ گیا۔

دُنیا میں رہتے ہوئے، دُنیاداری نبھاتے ہوئے انسان اللہ کی راہ پر چل رہا ہوتا ہے اور ہر لحظہ جھٹکے بھی کھا رہا ہوتا ہے۔ یوں اُسے ہر لحظہ اُس بند کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا رہتا ہے جو اُس نے بُرائی کے خلاف باندھا ہوتا ہے۔

سوال: رُوحانی علوم سیکھنے کا جلد اور آسان ترین طریقہ کیا ہے؟

جواب: جلدی کا کام تو شیطان کا ہوتا ہے۔ اللہ کے ہاں تدریج اور Consolidation ہے۔ رب تعالیٰ کا کوئی بھی کام دیکھ لیجیے۔ جیسے دن اور رات کا نکلنا۔

کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ سات بج کر دس منٹ تک تو سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہو اور سات بج کر گیارہ منٹ پر اچانک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جائے۔ روشنی بتدریج کم ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ اسی طرح بہت آہستہ آہستہ دن طلوع ہوتا اور رات رُخصت ہوتی ہے۔ بیج سے پھل تک کا

سفر Abrupt نہیں بتدریج ہے۔ پہاڑ بننے اور ٹوٹنے میں کئی سو صدیاں لیتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے چشمے کا پانی ایک منہ زور دریا کا حصہ بننے کے لیے میلوں سفر طے کرتا ہے۔ انسان کی پیدائش سے موت تک کی ہر چیز میں ایک تدریج نظر آتی ہے۔ جو چیز جتنی جلدی وجود میں آتی ہے اُسی قدر جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اگر وجود Quick ہے تو عدم بھی Quick ہے۔ انسان کا Gestation Period نو ماہ ہے۔ اس کی عمر طویل ہے۔ یہ سخت جان ہے۔ شدائد و مصائب اور بیماری کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہاتھی کا Gestation Period دو سال ہے۔ اس کا بجثہ، قوت جسامت اور مزاحمت اس کا مظہر ہے۔

گھوڑے کا Gestation Period ایک سال ہے۔ اس کی طاقت اور جسامت سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

خرگوش کا Gestation Period 21 دن ہے۔ اس کی زندگی بھی ویسی ہی ہے۔

ہر وہ کام جو جلدی میں کیا جائے اور آسانی سے اس کا نتیجہ حاصل کر لیا جائے اس کا Life span اتنا ہی کم ہوگا۔ اس لیے آسان طریقے نہ ڈھونڈیے۔ رُوحانیت کے حصول کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی فقیر کی خدمت کرنا شروع کر دیجیے۔ وہ خوش ہو کر آپ کو علم عطا کر دے گا۔ لیکن ایک تو وہ مانگے کا علم ہے۔ دوسرے وقت کے ساتھ ساتھ وہ Diminish ہوتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا کہ وہ علم Zero ہو جائے گا۔ یہ سب سے آسان طریقہ ہے لیکن نہ تو اس کی Life ہے نہ اس کی کوئی Durability (پائیداری) ہے اور نہ ہی کوئی Authenticity (صحت)۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ رُوحانی علوم کے حصول کے لیے شارٹ کٹ نہ ڈھونڈیے۔

اہلِ فقر کی چند خاص عبادات

اسلام نے بہت سی چیزوں، راتوں اور اوقات کو اہم بتایا ہے۔ ان اوقات اور ساعتوں میں کی گئی عبادت اور تلاوت کی بے پناہ فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح مختلف اوقات اور راتوں میں قرآن پاک کی مخصوص سورتوں کی تلاوت کی اہمیت بھی بتائی گئی ہے۔ جس کا بے حد ثواب ہے۔ کچھ ایسی عبادات بھی ہیں جو عموماً اہل فقر تک محدود رہیں تاکہ عام آدمی پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ ایسی کئی عبادات ہیں جو انسان کو نیکی کی طرف راغب کرتی ہیں۔ جو لوگ پہلے سے نیکی کی راہ پر ہیں اُن کے لیے وہ راہ آسان ہو جاتی ہے اور جو منزل پر پہنچ چکے ہیں اُن کے لیے وہ منزل Polish ہو جاتی ہے۔

اہم راتوں میں ایک عیدالاضحیٰ کی رات بھی ہے۔ اس رات اگر ہم دو رکعت نفل نماز اس طرح ادا کریں کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد پندرہ بار سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۃ الناس پڑھ لی جائے اور سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ آیت الکرسی پڑھنے کے بعد پندرہ بار استغفار پڑھ لیں۔ اس کے بعد اگر چاہیں تو دُعا کر لیں۔ یہ نفل نماز دو، دو رکعت کر کے جتنی زیادہ پڑھنا چاہیں، پڑھ سکتے ہیں۔ کوئی حد مقرر نہیں۔ چاہیں تو پوری رات یہ نماز ادا کرتے رہیں۔ اس کا ثواب کس قدر ہے وہ تو شاید میں یہاں بیان نہ کروں کیوں کہ کبھی سوچا ہی نہیں کہ کسی عبادت کا ثواب کتنا ملے گا یا کتنے سال کے برابر ہوگا۔ میرے نزدیک تو عبادت کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی طرح مجھے اپنے قریب کرلے۔ جب رب اپنے بندے کو قریب کر لیتا ہے تو اُسے اپنی دوستی عطا فرما دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دوستی کا معیار بے حد بلند و بالا ہے۔ اُس کی دوستی بھی اتنی ہی عظیم ہے جس قدر اُس کی ذات عظیم ترین ہے۔ وہ اپنے دوست کو Look after کرتا ہے اور اُس کی رحمت کا سب سے بڑا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے دوست کو علم سے نواز دیتا ہے اور جسے وہ علم سے نواز دے اُسے صاحب فہم و فراست کر دیتا ہے۔ اُس پر بہت سی چیزیں عیاں کر دیتا ہے۔ یوں وہ بندہ کارخانہ قدرت کی بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جس کا اپنا ایک مزہ ہے۔ اس مشاہدہ سے ہونے والی حیرت کا بھی اپنا ایک لطف ہے جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

ایک اور عبادت جو فقرا کا معمول ہے، اس کا آج سے قبل میں نے ذکر نہیں کیا۔ یہ دو رکعت نفل نماز ہے جو بروز جمعہ اور اتوار ادا کی جاتی ہے۔ اس کا ایک خاص وقت ہے۔ صبح نو اور دس بجے کے دوران یہ نفل پڑھے

جاتے ہیں۔ نو بجے سے پہلے اور دس بجے کے بعد نہ پڑھیے۔

اس نماز کو ہر حال میں نو بجے کے بعد شروع ہونا اور دس بجے سے پہلے ختم ہو جانا ہے۔ جمعہ کے روز جب آپ یہ دو رکعت نفل نماز پڑھیں تو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد 100 بار سورۂ اخلاص پڑھ لیجیے۔ سلام پھیرنے کے بعد دُعا مانگ لیجیے۔ اسی طرح اتوار کو صبح نو بجے سے دس بجے کے دوران دو رکعت نفل نماز پڑھیں۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد 70 بار سورۂ اخلاص پڑھ لیں۔

یہ نماز بہت فضیلت والی ہے۔ یہ فضیلت علم اور اللہ کے قرب کے حصول سے متعلق ہے۔ اس نماز کو ادا کرنے والا اللہ کے بے حد قریب ہو جاتا ہے۔ سلام پھیرنے کے بعد جب آپ دُعا مانگتے ہیں تو وہ دُعا قبول ہوتی ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔

چونکہ میں کوئی زیادہ تعلیم یافتہ انسان نہیں اور مجھے اپنی کم مائیگی کا بھی بے پناہ احساس ہے اس لیے میں رب تعالیٰ سے اس نماز کے بعد ایک ہی چیز مانگتا رہا۔

''یا اللہ تعالیٰ! تو مجھے اس جہاں میں بھی اور اگلے جہاں میں بھی اپنی پسند کی بہترین زندگی عطا فرما دے۔'' (آمین)

ظاہر ہے کہ آپ لوگ تعلیم یافتہ اور بہتر عقل و فہم کے مالک ہیں۔ اس لیے اپنی پسند کی بہترین دُعا مانگ سکتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اللہ کی پسند کردہ زندگی کی دُعا اگر آپ کرنا چاہیں تو ذہن میں رکھیے گا کہ اللہ کے مہمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ کوئی زیادہ قابلِ رشک نہیں۔

پرانے زمانے میں جب لوگ پیدل سفر کیا کرتے تھے تو معاشرتی اقدار اور مہمان نوازی کے پیمانے آج سے قدرے مختلف تھے۔ تب کوئی مسافر مسجد میں جا کر اپنے پردیسی ہونے کا اعلان کرتا تو علاقہ کے مکین اُسے کھانا اور شب بسری کے لیے ٹھکانا اور بستر فراہم کر دیتے۔

ایک بار ایسے چند دوستوں نے امام مسجد سے جا کر کہا کہ ہم آپ کے گاؤں میں مسافر ہیں اور رات گزارنے کے لیے جگہ چاہیے۔ امام مسجد کی درخواست پر اُن میں سے تین دوستوں کے طعام و قیام کی ذمہ داری اہلِ علاقہ نے قبول کر لی جب کہ چوتھے دوست کی مہمان نوازی کا ذمہ چار و ناچار امام مسجد کو لینا پڑا۔ گھر میں جگہ نہ ہونے کے باعث اُس نے مسافر کو مسجد میں ٹھہرایا اور کہا کہ ابھی گھر جا کر میں آپ کے لیے کھانا اور بستر بھجواتا ہوں۔ گھر جا کر امام مسجد صاحب بھول گئے۔ اِدھر مسافر بے چارہ بھوک سے ہلکان ہوتا رہا اور سردی سے ٹھٹھرتا رہا۔ آخر مایوسی کے عالم میں انتظار سے تنگ آ کر اُس نے سردی سے بچنے کے لیے خود کو صف میں کسی طریقے سے Roll کیا اور کسی طرح سرد رات بسر کی۔ صبح تک اُس کا جسم ٹھنڈ سے اکڑ چکا تھا۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی اُس کے باقی دوست شاداں و فرحاں مسجد میں آئے اور اپنے میزبانوں کی مہمان نوازی کی تعریف کرنے کے بعد اُس سے پوچھا کہ تمھاری رات کیسے گزری۔ چوتھا دوست نہایت مسکینی بھری آواز میں گویا ہوا ''میری شب ویسی ہی گزری جیسی اللہ کے مہمانوں کی گزرتی ہے۔ رات بھر سے بھوکا بھی ہوں اور سردی سے اکڑ بھی چکا ہوں۔''

لہٰذا آپ بھی اللہ کا قرب مانگنے سے پہلے یہ صورت حال ذہن میں رکھیے گا۔

یہ نماز جو اتوار کو پڑھی جاتی ہے، یہ رُوحانیت میں انسان کو بہت تیزی سے آگے لے جاتی ہے۔ رُوحانیت میں آگے جانے سے مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ روز کوئی فرشتہ آکر رُوحانیت کے دو چار بنڈل آپ کو تھما جایا کرے گا بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل سے دُنیا کی محبت نکل جاتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتا ہے۔ رب تعالیٰ پر بے پناہ توکل اور بھروسا پیدا ہو جاتا ہے...... ایسا بھروسا کہ انسان سرے سے وسائل سے ہی بے نیاز ہو جاتا ہے۔

رب پر توکل اور بھروسا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے آگے تھے۔ اُن کا ہر بات میں ایک ہی جواب ہوتا۔ جس کا مفہوم ہے "میرا رب ہی میرے لیے کافی ہے۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توکل رُوحانیت اور مذہب میں ضرب المثل بن چکا ہے۔

ایک اور عبادت ہے۔ جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں اور جس کی فضیلت آپ ﷺ نے بے پناہ بیان فرمائی ہے۔ مختلف احادیث کے مطابق اگر کوئی شخص یہ نوافل چار رکعت یا چھ رکعت ادا کرتا ہے تو اُسے نہ صرف بلند مرتبہ عطا ہوتا ہے بلکہ بہت سی نعمتوں اور برکات کے حصول کے ساتھ ساتھ اُس کے چالیس سال اور بعض روایات کے مطابق پچاس سال کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

- ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:۔

  "جو شخص نمازِ مغرب کے بعد چار رکعت ادا کرے اور اس دوران میں بے ہودہ گفتگو نہ کرے تو فرشتے اس کے عمل کو علیین میں لے جاتے ہیں۔ اس سے بڑا مرتبہ ملتا ہے۔ ایسا گویا اُس نے شب قدر کو مسجد اقصیٰ میں پالیا۔ یہ نصف رات کی نماز سے بہتر ہے۔"

- حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے سنا ہے:۔

  "نمازِ مغرب کے بعد چار رکعت نماز ادا کرنے والا ایسا ہے گویا اُس نے دوبارہ حج کیا۔ اگر چھ رکعتیں ادا کرے گا تو اُس کے پچاس برس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔"

- حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:۔

  "اللہ تعالیٰ کو نمازِ مغرب سب نمازوں سے عزیز ہے کیوں کہ اس نماز سے آدمی اپنے دن کو ختم کرتا ہے اور رات شروع ہوتی ہے۔ مسافر یا مقیم کے لیے اس میں کوئی کمی نہیں۔ جو شخص مغرب کے بعد چار رکعت ادا کرے اور درمیان میں کسی سے بات نہ کرے اس کے لیے بہشت میں دو محل تعمیر کیے جاتے ہیں جن میں یاقوت اور مروارید جڑے ہوں گے۔ ان میں باغ ہوں گے جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جو شخص چار سے بڑھا کر چھ رکعت ادا کرے اور درمیان میں کسی سے گفتگو نہ کرے اُس کے چالیس سال کے گناہ

معاف ہو جاتے ہیں۔" (غنیۃ الطالبین، مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی، صفحہ نمبر 470)

یہ نوافل مغرب کی نماز کے بعد دو دو کر کے ادا کیے جاتے ہیں اور شرط یہی ہے کہ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد کسی سے گفتگو نہ کی جائے۔ اس نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد ایک بار آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھے جاتے ہیں۔

آج چونکہ بات نفل نمازوں کی ہو رہی ہے تو یہ بھی عرض کر دوں کہ نمازیں پانچ ہی کیوں فرض ہوئیں۔ یہ نمازیں چار، چھ، یا سات بھی تو ہو سکتی تھیں۔ پانچ ہی کیوں؟

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ آپ ﷺ امام الانبیا ہیں۔ مسجد اقصیٰ میں آپ ﷺ نے تمام انبیا کی امامت فرمائی ہے۔ اور اسی نسبت سے امام الانبیا کہلائے۔ پانچ نمازیں دراصل پانچ پیغمبروں سے منسوب ہیں۔ نماز فجر سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے ادا کی۔ نماز ظہر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطور شکرانہ اُس وقت ادا کی جب اللہ تعالیٰ نے انھیں آتش نمرود سے محفوظ باہر نکالا۔ نماز عصر حضرت یعقوب علیہ السلام نے سب سے پہلے اُس وقت ادا کی جب اُنھیں اپنے گمشدہ بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر ملی۔ نماز مغرب حضرت داؤد علیہ السلام نے سب سے پہلے ادا کی تھی۔ نماز عشاء حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ سے باہر آنے کے بعد سب سے پہلے ادا کی تھی۔ گویا یہ پانچوں نمازیں آپ ﷺ کی بعثت سے قبل ادا کی جا چکی تھیں۔ اُن تمام انبیا پر وہی نمازیں فرض کی گئی تھیں جو انھوں نے ادا کی تھیں۔

معراج شریف سے پہلے مسلمان فجر اور عشاء کی نماز ادا کرتے تھے۔ شب معراج یہ پانچ نمازیں آپ ﷺ کو عطا کی گئی تھیں کیوں کہ یہ پانچوں نمازیں مختلف انبیا کے ذریعے پہلے بھی ادا کی جا چکی تھیں۔ رب تعالیٰ کو ان پانچ نمازوں میں سے سب سے زیادہ عزیز مغرب کی نماز ہے۔ لہٰذا اس نماز کو وقت پر ادا کر لیا جائے تو بہت بہتر ہے۔

سوال: ان نفل نمازوں کی نیت کیسے کی جائے گی؟

جواب: نیت یوں کر لیجیے کہ دو رکعت نفل نماز واسطے اللہ تعالیٰ کے۔ نیت کے حوالے سے یہ بھی عرض کر دوں کہ اگر آپ نے یہ ارادہ کیا کہ میں آٹھوں اور ظہر کی یا فلاں نماز ادا کر لوں۔ اس مقصد کے لیے آپ نے وضو کیا اور جانماز پر کھڑے ہو گئے۔ اب آپ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کریں یا نہ کریں نماز بہر حال ہو جائے گی۔ البتہ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کر لینا یقیناً زیادہ بہتر عمل ہے۔

سوال: گنتی کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا جائے؟

جواب: ایک مخصوص تعداد میں کوئی بھی ورد یا وظیفہ پڑھنا ہو تو اُس کی گنتی کا خیال رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جس کے لیے عموماً تسبیح کا استعمال کیا جاتا ہے۔ Counting کے ساتھ ساتھ تسبیح کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تسبیح کے

دانے گرانے سے ہماری یک سوئی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ سفر کرتے ہیں تو نیند پوری ہونے کے باوجود بس کے انجن کا شور آپ کو سونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس انجن کی آواز ایک ردھم میں آ رہی ہوتی ہے۔ ایک خاص فریکوئنسی اور ردھم پر ایک مخصوص آواز مسلسل آپ کی سماعتوں تک پہنچ رہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے گاڑی میں بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی آپ کو نیند آنے لگتی ہے۔

اسی طرح جب آپ تسبیح پھیرتے ہیں تو اس کا ردھم اگرچہ آپ کو سُلاتا تو نہیں لیکن یک سوئی میں اضافہ ضرور کر دیتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب فوجیں پیدل سفر کیا کرتی تھیں تو اُن کے ساتھ ایک ڈرمر ڈرم بجاتا ساتھ چلا کرتا تھا۔ سپاہی ڈرم کی ڈم ڈم کے ردھم پر پاؤں اُٹھاتے تھے۔ یہ ڈم ڈم اُن کو تازہ دم رکھتی اور انھیں تھکنے نہ دیتی تھی۔

ہمارے وظائف میں تسبیح کا عمل بھی بالکل یہی ہے۔ تسبیح یا Counter کی Tick, Tick کا ردھم آپ کی Concentration (یک سوئی) کو بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔

اُنگلیوں پر تسبیح کرنے سے جہاں یک سوئی میں اضافہ ہوتا ہے وہاں اس کا طبی نقطہ نظر سے بھی ایک فائدہ ہمیں ملتا ہے جسے نہ صرف چینی میڈیکل سائنس بلکہ مغربی ایلوپیتھی نے بھی تسلیم کیا ہے کہ اُنگلیوں کے پور ہمارے بلڈ پریشر کے پریشر Points ہیں۔ جب ہم اُنگلیوں پر تسبیح کرتے ہیں تو یہ پور دبتے ہیں اور ان پوروں کے دبنے سے بلڈ پریشر نارمل ہونے لگتا ہے۔

Counter استعمال کرنے سے صرف انگوٹھا اور تسبیح کے دانے پھیرنے سے انگوٹھا اور ایک اُنگلی حرکت میں آتے ہیں جن کا طبی نقطہ نظر سے کچھ نہ کچھ فائدہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ اُنگلیوں کے پوروں پر گننے سے ہوتا ہے۔

نشست نمبر 28

آدابِ فقر

علم سے زیادہ آدابِ فقر کی راہ میں ضروری ہیں۔ اگر اس راہ کا مسافر منزل پر بآسانی اور جلد پہنچنا چاہتا ہے تو علم سے زیادہ اُسے آدابِ محفل کی جستجو کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی چیز یک طرفہ نہیں ہے۔ پورے توازن اور انصاف کے ساتھ رب تعالیٰ نے ہر چیز کے دونوں رُخ انسان کے سامنے واضح کیے ہیں اور ان معاملات پر عمل کرنا فرض، واجب، سنت یا پھر مباح قرار دیا ہے۔

مثال کے طور پر اللہ نے اس بات پر بہت زور دیا کہ جب انسان کسی کے ساتھ نیکی یا احسان کرے تو اُسے جتائے نہیں۔ حتیٰ کہ جتانا تو دُور کی بات ہے وہ نیکی کرنے کے بعد اس پر پچھتائے بھی نہیں۔ کسی کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بعد اُس کو جتانے والوں کے رویے کو اللہ نے سخت ناپسند فرمایا اور کہا کہ ایسے لوگوں کی نیکیاں اُن کے منہ پر ماردی جاتی ہیں۔

دوسرا پہلو یا رُخ اس کا یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ نیکی یا احسان کا معاملہ کیا جاتا ہے اس کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ خود نیکی کرنے والے شخص کی دوسروں کے سامنے تعریف کرے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے ہر معاملہ میں Balance قائم کیا ہے۔

جس طرح فقرا کے آداب ہیں اسی طرح فقر کے بھی آداب ہیں۔ یہ نہیں کہ مرید تو پابند ہے لیکن فقیر ان تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ بلکہ کچھ معاملات میں تو فقیر پر پابندیاں فقیر کے پاس آنے والے لوگوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ مثلاً فقیر پر ایک پابندی یہ ہے کہ وہ اپنے پاس آنے والوں سے انتہائی عزت سے پیش آئے۔ ہر آنے والا اپنی جگہ پر یہ سمجھے کہ اس فقیر کی نظر میں سب سے زیادہ Valuable اور Important شخص میں ہی ہوں۔ اسی طرح فقیر کے لیے اس سنت پر عمل کرنا بہت ضروری ہے کہ اپنے پاس آنے والے ہر شخص کے ساتھ ایسی محبت کا اظہار کرے کہ آنے والا شخص یہ سمجھے کہ فقیر سب سے زیادہ مجھ ہی سے پیار کرتا ہے۔

فقیر ہر آنے والے کو اگر اپنے سے بلند جگہ نہیں دے سکتا تو اُسے اپنے برابر ضرور بٹھائے۔ یہ نہیں کہ فقیر خود تو بلند مقام پر بیٹھے اور آنے والے فرش پر بیٹھتے ہوں۔

فقیر کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اُس کے پاس آنے والے شخص کی دل آزاری ہو یا اُس کے دل میں فقیر کے حوالے سے کوئی کراہت پیدا ہو۔

فقیر پر ایک پابندی بہت سخت ہے وہ یہ کہ اُس کی گفتگو صاف ستھری ہو۔ لچر اور بازاری نہ ہو۔

آواز کے سلسلے میں وہ اس حدیث کی پیروی کرے۔ آواز اتنی دھیمی ہو کہ سننے میں دقت ہو نہ اتنی بلند کہ سامع کی سماعتوں کو ناگوار اور گراں گزرے۔

فقیر پر یہ بھی ایک بڑی پابندی ہے کہ اگر وہ فاقہ سے بھی ہو تو اپنے پاس آنے والوں پر اس کا اظہار نہ ہونے دے۔ اگر فقیر ضرورتوں کے بوجھ تلے دبا ہے تو اپنے پاس آنے والوں کے سامنے اپنی ضرورتوں کو بیان نہ کرے۔ کیوں کہ اگر تو فقیر نے یہ کہا کہ میں آج کل مشکل میں ہوں۔ فلاں فلاں Problem ہے۔ تو یہ رب کا شکوہ ٹھہرا۔ یاد رکھیں! جس سے انسان پیار کرتا ہے اُس سے انسان کو شکایت نہیں ہوتی۔ فقیر تو رب سے پیار کرتا ہے لہٰذا وہ رب تعالیٰ کا شکوہ کیسے کر سکتا ہے۔ مصیبت کی شکایت کرنے کا ایک اور نقصان یہ ہوتا ہے کہ فقیر کا دل مردہ ہونے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اللہ کے بندوں کو اپنا حاجت روا سمجھنے لگتا ہے۔ فقیر کو سوال کرنے کی اجازت صرف ایک صورت میں ہے کہ جب یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ اب بھی اگر وہ سوال نہیں کرے گا تو ''نفس کا قاتل'' ٹھہرایا جائے گا۔

تصوف میں نفس کا قاتل یا قتل نفس اس چیز کو کہا جاتا ہے جو زندہ رہنے کے لیے ہماری Barest minimum requirement ہے۔ جیسے اگر تین دن پانی نہ پیا جائے تو Dehydration کے باعث موت کا خدشہ ہے۔ یہ قتل نفس ہے۔ اسی طرح اگر ایک ہفتہ تک کھانا نہ کھایا جائے تو انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ بھی قتل نفس ہے۔ جب تک قتل نفس کی نوبت نہ آجائے تب تک فقیر پر لازم ہے کہ سوال نہ کرے اور جب وہ سوال بھی کرے تو وہ براہ راست یوں نہ کہے کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے آپ وہ پوری کر دیں۔ بلکہ اپنی ضرورت یوں بتائے کہ جیسے وہ کوئی قصہ بیان کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ سوال مت کرے۔

فقیر پر سوال کرنا اُس وقت تک منع ہے جب تک اُس کے پاس وقتی ضرورت پوری کرنے کے لیے وسائل موجود ہوں۔ مثلاً اگر فقیر کی ضرورت 100 روپے کی ہے اور اُس کی جیب میں ایک روپیہ بھی موجود ہے تو جب تک وہ یہ ایک روپیہ بھی خرچ نہ کر لے تب تک وہ سوال کرنے کا مجاز نہیں۔ جب وہ یہ ایک روپیہ بھی خرچ کر لے تب بھی وہ محض اس قدر سوال کر سکتا ہے جس سے وقتی ضروریات پوری ہو سکیں۔ کیوں کہ فقیر آج میں زندہ رہتا ہے۔ اگر اُس نے کل کی فکر کی تو تو کل سے باہر ہو گیا۔ جس طرح پرندہ کل کی نہیں بلکہ لمحہ موجود کی فکر کرتا ہے۔ لہٰذا تو کل اگر سیکھنا ہے تو انسان پرندوں سے سیکھ سکتا ہے۔ فقیر بھی سوال کے ذریعے وقتی ضروریات کا Barest minimum حصہ پورا کرے گا۔ لیکن یہ احتیاط رہے کہ سوال کا نہیں بلکہ کہانی کا رنگ ہو۔

فقیر کے لیے پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس کے تمام اعمال و افعال شریعت کے مطابق ہونا

چاہییں اور اُسے پوری طرح سنت کا پابند ہونا چاہیے۔

یہ سب پابندیاں تو اہل فقر کے لیے ہیں۔ لیکن کچھ آداب اُن کے پاس آنے والے لوگوں کے لیے بھی ہیں۔ مثلاً جس طرح فقیر کے لیے ضروری ہے کہ تب تک دست سوال دراز نہ کرے جب تک قتل نفس کی نوبت نہ آجائے اسی طرح فقیر کے پاس آنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے ہوتے ہوئے فقیر کو سوال کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اگر اس فقیر کا خاندان اور بیوی بچے ہیں تو وہ صرف فقیر کی کفالت نہ کریں بلکہ اس انداز میں خدمت کریں کہ جس میں فقیر کے بھوکے بچے بھی پلتے رہیں۔

اسی طرح جب ہم فقیر کے پاس حاضر ہوں تو ہم پر لازم ہے کہ ہم کسی طور بھی خود کو فقیر سے برتر نہ سمجھیں۔ اگر ہم خود کو فقیر سے برتر سمجھیں گے تو پھر حصول علم نہیں ہو سکے گا۔

یاد رکھیے کہ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ پانی کو ایک برتن سے دوسرے میں Shift کرنا ہو تو ایک برتن کو بلندی پر رکھیں گے تو Natural gravitational force سے پانی نچلی سطح پر رکھے برتن میں آجائے گا۔

اسی طرح فقیر کی مجلس میں بیٹھ کر اُسے توجہ سے سنا جائے۔ زبان کو بند رکھا جائے اور آنکھیں اور کان کھلے رکھے جائیں۔ فقیر کے ہاں حصول علم کے دو طریقے ہیں۔

1۔ فقیر کی بات غور سے سنیں

2۔ فقیر کی حرکات Observe کریں

جب تک ہم فقیر کو Patient hearing نہیں دیتے اور اُس کو Observe نہیں کرتے تب تک حصول علم ممکن نہیں۔ کیوں کہ فقیر نہ تو باقاعدہ کلاس لے گا کہ بلیک بورڈ پر سمجھانا شروع کر دے کہ فلاں چیز کا فلاں فارمولا ہے۔ نہ وہ Mathematical calculation میں جائے گا۔ وہ تو محض اپنے مشاہدات و تجربات آپ کے سامنے بیان کرتا ہے۔ انھی مشاہدات و تجربات سے انسان نتائج اخذ کرتا ہے کہ یہ مشاہدہ فقیر کو کس عمل کے نتیجہ میں ہوا ہو گا۔

اس بات کی وضاحت اس واقعہ سے ہو جائے گی۔ میرے قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب ایک بات پر بہت زور دیتے تھے کہ انسان کو وقت کا پابند ہونا چاہیے۔ نہ صرف عبادات میں بلکہ عام زندگی میں بھی Particular تھے۔ میں نے انھیں حیران کن حد تک وقت کا پابند پایا۔ ایک روز ایک قصہ سنانے لگے کہ مجھے ایک پڑھائی رات کے گیارہ بجے کرنا ہوتی تھی۔ گوجر خان میں قیام پذیر تھا۔ اکثر لوگ ملاقات کے لیے آتے اور رات دیر تک بیٹھے رہتے۔ فقیر چونکہ اپنے پاس آنے والوں سے کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اب آپ چلے جائیں۔ وہ اپنے پروگرام Cancel کرتا چلا جائے گا اور کبھی احساس نہیں ہونے دے گا کہ اُس کے پاس بیٹھے لوگوں کی وجہ سے اُس کا کتنا حرج ہو رہا ہے۔ لہٰذا میں نے حل یہ نکالا کہ روزانہ رات 10 بجے تک والے سینما شو کا ٹکٹ لیتا۔ ایک مخصوص سین سے مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب پونے گیارہ کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ سین

آتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہوتا۔ پانچ منٹ کی Walk کے بعد گھر پہنچ جاتا۔ وضو کرتا اور ٹھیک گیارہ بجے وظیفہ شروع کر دیتا۔

مرشد صاحب نے جب یہ قصہ سنایا تو اس میں مجھ کندہ ناتراش کے لیے ایک سبق پوشیدہ تھا کہ وقت کے کیسے Manage کیا جاتا ہے۔ میں جو اکثر گیارہ تو کبھی سوا گیارہ بجے پڑھائی کرتا تھا اس واقعہ کو سننے کے بعد سمجھ گیا کہ ٹھیک وقت پر پڑھائی کیسے شروع کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح میں نے دیکھا کہ اپنے پاس آنے والوں کو مرشد صاحب کیسے Receive کرتے ہیں؟ کیا رویہ رکھتے ہیں؟ کھانا کیسے پیش کرتے ہیں؟ یہ سب ہم آنکھوں سے دیکھتے تھے اور اس حوالے سے قصے کانوں سے سنتے تھے۔ یہ حصولِ علم کا ایک طریقہ تھا۔ سوال کبھی نہ کیا تھا۔ وجہ یہ نہ تھی کہ میں کوئی سلجھا ہوا شخص تھا۔ اصل میں خوف یہ رہتا تھا کہ کہیں جوتے نہ پڑ جائیں۔

جمعہ کی نماز میں مرشد صاحب کے ساتھ ایک Particular مسجد میں پڑھا کرتا تھا۔ وہاں مرشد صاحب کی جگہ مخصوص تھی۔ اُن کے Left side پر میں اور میری Left side پر مرشد صاحب کے خادم مجید بھائی ہوتے تھے۔ نماز ادا کرنے کے بعد جب میں دُعا کرتا تو مختلف چیزیں مجھے دکھائی دیتیں۔ ایک مزار تین چار بار دکھائی دیا۔ سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ مزار ہے کہاں۔ اس مزار کا Lay out اور بناوٹ اس قدر Artistic تھی کہ اس زمین کی نہیں لگتی تھی۔ لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ یہاں کوئی بزرگ دفن ہیں۔ ایک بار جب جمعہ کی نماز کے بعد ہم مسجد سے باہر نکلے تو میں نے مرشد صاحب سے عرض کی ''حضور! اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات پوچھ لوں۔'' اُنھوں نے کہا۔ ''ہاں بولو۔'' میں نے کہا ''نمازِ جمعہ کے بعد جب میں دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتا ہوں تو ایک جگہ دکھائی دیتی ہے لیکن سمجھ نہیں آتی کہ وہ ہے کہاں؟'' یہ سن کر اُنھوں نے غصہ سے ٹیڑھی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولے ''تم نے مجھے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ مت آیا کرو میرے سامنے۔'' میں نے ایک دم سے کہا "!I am sorry sir" ساتھ ہی اُن کا غصہ اُتر گیا۔ تو یہ جوتوں کا خوف تھا جو مجھے سوال کرنے سے باز رکھتا تھا۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اگر سوال نہیں کریں گے تو علم آگے کیسے بڑھے گا؟ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان کوئی خوشگوار جملہ بول کر فقیر کو گفتگو کرنے پر مجبور کر دے۔ جب فقیر بولنے لگے تو مرید خاموش ہو جائے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ فقیر فلموں یا سیاست کی باتیں شروع کر دے گا۔ بالفرضِ محال اگر وہ فلموں کی بات بھی کرے تو پتا چلے گا کہ اس میں بھی علم ہی چھپا ہے اور فقیر فلموں کو ہم سے مختلف Angle سے دیکھتا ہے۔

مرشد صاحب کو ہم نے کھانا پکاتے ہوئے دیکھا اور جانا کہ 3½ × 5½ فٹ کمرہ میں چیزیں کیسے Arrange کی جاتی ہیں۔ شاہ صاحب نے دیوار کی کھدائی کر کے اس میں شیلفیں بنائی تھیں۔ تقریباً 100 کے قریب شیشیاں ان شیلفوں میں موجود تھیں۔ یہ شیلفیں شاہ صاحب کی Back پر موجود تھیں۔ ہم سے گفتگو کرتے ہوئے بغیر پلٹ کر دیکھے وہ ہاتھ پیچھے کرتے۔ ایک شیشی اُٹھاتے اور اُس میں موجود مسالا ہنڈیا میں ڈال

دیتے۔ ایک بار ایک کلو گوشت میں آدھا کلو کے قریب مرچیں، ایک پورا گھی کا ڈبہ اور 15,16 قسم کے مسالے اُنھوں نے ڈال دیئے۔ اب ہماری جان پر بنی تھی کہ یہ کھانا وہاں موجود ہم تینوں لوگوں کو کھانا پڑے گا۔ لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ جب کھانا کھایا تو مرچیں زیادہ تھیں نہ گھی۔ بہترین ذائقے اور خوشبو والا کھانا تھا۔

یو کے میں طویل قیام کے دوران مجھے بھی ایک بار اس آزمائش سے گزرنا پڑا۔ مجھے کھانا بنانا آتا تھا نہ چائے تیار کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے کچھ لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ میں دُعا کر دیتا ہوں۔ اس سلسلے میں ایک نوجوان میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں غیر قانونی طور پر یہاں پھنسا ہوا ہوں۔ دُعا کر دیجئے۔ دورانِ ملاقات ہی کھانے کا وقت ہو گیا۔ میں نے کہا تشریف رکھیے۔ کھانا کھا کر جایئے گا۔ یوں کھانا پکانے کا آغاز ہوا۔ اگلے روز وہ نوجوان مزید کچھ لوگوں کو دُعا کروانے کے لیے اپنے ہمراہ لے آیا۔ حتیٰ کہ کل تعداد 20 ہو گئی۔ اب کھانا باہر سے تو منگوایا نہ جا سکتا تھا۔ پکانے کے لیے گھر میں کوئی خانساماں دستیاب نہ تھا۔ Butcher shop سے میں نے گوشت منگوایا۔ سارے مرچ مسالے ڈال کر اُس میں پانی انڈیلا اور پکنے کے لیے رکھ دیا۔ بیس پچیس منٹ بعد بڑے شاہ صاحب کے انداز میں دو چار بار چمچ چلانے کے بعد اُسے اُتارا اور سب کو Serve کیا۔ اندازہ تھا کہ کسی کو پسند نہ آئے گا لیکن مروتاً یا حقیقتاً اُنھوں نے بہت پسند کیا۔

اس بات کی تو بعد میں سمجھ آئی کہ میری Training میں دراصل میرے لائف سٹائل کی وجہ سے دو چیزوں کی کمی رہ گئی تھی۔

1۔ کھانا بنانا۔

2۔ Serve (پیش) کرنا۔

ان دونوں چیزوں کا فقیر کی زندگی میں بہت عمل دخل ہے۔ عموماً یہ دو چیزیں فقیر ابتدا میں کر گزرتا ہے۔ کیوں کہ لوگوں کے جھوٹے برتن دھونے سے اُس کا نفس مرتا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے لیے اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر Serve کرنے کے بعد بھی انسان کے اندر کافی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ مجھے اُس وقت ہوا جب یو کے میں مہمانوں کے جھوٹے برتن میں سنک تک لے کر آیا اور پھر سوچ میں پڑ گیا کہ لوگوں کے استعمال شدہ یہ برتن دھوئے کیسے جائیں۔ حل یہ نکالا کہ Tissue Paper سے پلیٹوں کو پکڑ کر میں نل کے نیچے کرتا۔ پانی کے Pressure سے اُن میں سے بچا سالن بہہ جاتا۔ تو پھر اُنھیں میں ڈٹرجنٹ سے دھو لیتا۔ اس تجربے سے گزرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کسی فقیر کے لیے جھوٹے برتن دھونا اتنا ضروری کیوں ہے۔ کیوں کہ اس عمل سے اُس کی ''میں'' قطعی طور پر کچلی جاتی ہے۔

گھر میں مہمان نوازی کوئی مشکل کام نہیں۔ آپ خانساماں سے کہہ کر چلے گئے کہ شام کو پندرہ بیس آدمیوں کا کھانا تیار کر کے ٹیبل پر لگا دینا۔ شام کو آپ نے بہترین انداز میں ان کی مہمان نوازی کی۔ اُن کے رخصت ہونے کے بعد ملازم نے برتن سمیٹے اور دھو کر مناسب جگہ پر خود ہی رکھ دیئے۔ ایسی مہمان نوازی بہت اچھی لگتی ہے۔

مرشد صاحب کیسے کھانا پکاتے اور Serve کرتے تھے۔ یہ بھی باقاعدہ علم تھا جو مشاہدہ سے ہم حاصل کر رہے تھے۔ اسی طرح ہم اُن کی باتیں سنتے تھے اور اُن سے سیکھتے تھے۔

ایک بار میں مرشد صاحب کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ رات کو تسبیح کرتے ہوئے اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں کسی نئی جگہ چلا گیا ہوں اور وہاں گھوم پھر رہا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک دم وہاں سمندری طوفان کی وجہ سے پانی آ گیا جس سے بچنے کے لیے میں بلند جگہ کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہاں بھی پانی میرے پاؤں کو چھونے لگا۔ میں مزید اُوپر چلا گیا۔ بلند جگہ پر جاتے جاتے میں ایک سفید محل میں داخل ہو گیا۔ اُس محل کی بھی پہلے ابتدائی اور پھر آخری منزلیں ڈوب گئیں۔ حتیٰ کہ میں پانی سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے اُس سفید عمارت کی آخری منزل کی چھت پر چلا گیا۔ پانی اس چھت کے برابر ہو گیا۔ تب میں سوچنے لگا کہ اب میں کہاں جاؤں گا کہ اچانک ایک Naval lifeboat میرے پاس آ گئی اور میں اُس میں بیٹھ کر باہر آ گیا۔

مرشد صاحب سے یہ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد میں نے پوچھا "سرکار یہ کون سی جگہ تھی۔" بات ختم کرنے کے بعد سر اُٹھا کر میں نے دیکھا تو اُن کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پر جلال تھا۔ کہنے لگے۔ "تم باز نہیں آؤ گے اپنی حرکتوں سے۔" میں نے کہا "حضور! کیا ہوا؟" بولے۔ "تم میرے پیچھے کیوں آئے تھے رات؟" میں نے جواب دیا۔ "میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے تو یہ سب رات تسبیح کے دوران دیکھا ہے۔" میری یہ بات سن کر وہ حالت کشف میں چلے گئے۔ پھر قدرے توقف سے فرمانے لگے "یہ سفید محل جاپان میں ایک جزیرہ ہے۔ رات میری ڈیوٹی وہاں لگی تھی اور تم میرے پیچھے آ گئے تھے۔ آج سے چھ دن بعد یہ جزیرہ سمندری طوفان کی وجہ سے مکمل طور پر غرق ہو جائے گا۔ تم نے اُسی جزیرہ کی بلڈنگ کی چھت پر خود کو دیکھا تھا۔" پھر یہ ہوا کہ ساتویں دن خبر آئی کہ جاپان کے سمندر میں طوفان آ گیا اور اُس سے Naval Headquarters کی بلڈنگ ڈوب گئی۔ اور وہ جزیرہ غرق ہو گیا۔

اب یہ قصہ تو مجھے کسی نے نہیں پڑھایا۔ نہ مرشد صاحب نے سبق پڑھایا تھا کہ ایسا ہو گا۔ سننے اور Observe کرنے سے انسان علم سیکھتا ہے۔ جب تک ہم فقیر کی محفل میں زبان بند کر کے نہیں بیٹھیں گے اپنی ہی کہے جائیں گے اور فقیر کی نہیں سنیں گے تو علم حاصل نہیں ہو گا۔

اگر ہم فقیر کے پاس بیٹھ کر یہی کہتے رہیں گے کہ جناب فلاں وقت میں نے یہ دیکھا، فلاں وقت یہ Experience کیا۔ تو جواباً فقیر آپ کو گھاس نہیں ڈالے گا۔ وہ اپنی زبان بند کر لے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم نے جو سیکھنا تھا۔ وہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

بڑے شاہ صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور بولا "حضرت! میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ ویسے تو میں نے حضرت علیؓ کے دست مبارک سے بیعت کر رکھی ہے۔" اب اُس شخص کا غالباً یہ اندازہ تھا کہ حضرت علیؓ کے اُس Reference کی وجہ سے شاہ صاحب اُسے زیادہ اہمیت دیں گے اور زیادہ مہربانی کا

سلوک کریں گے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ بڑے شاہ صاحب بگڑ گئے۔ "جب اتنی بڑی ہستی کے دست مبارک پر بیعت ہو تو پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟ جاؤ یہاں سے۔" یہ سن کر اُس شخص کا رنگ پیلا پڑ گیا لیکن پھر بھی وہ بحث کرنے لگا۔ اب مجھے معلوم تھا کہ بحث سے معاملہ بگڑ جائے گا لہٰذا میں نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا لیکن اس کے باوجود اُسے اثر نہیں ہوا اور یوں بڑے شاہ صاحب بگڑ گئے۔

باہر آ کر میں نے اُن شخص سے کہا کہ فقیر سے یہ کبھی نہیں کہتے کہ میں کیا ہوں۔ فقیر کے پاس اس عاجزی و انکساری سے جائیں کہ گویا کہ آپ کچھ نہیں ہیں۔ اس سے فائدہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ وہاں اتنے بڑے بڑے نام Quote کریں گے تو آگے سے وہی سنیں گے جو اُن صاحب نے سُنا۔ یہ سب فقیر کی محفل کے آداب ہیں جن کا خیال رکھنے سے ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

علم

علم کی ایک بہتر Definition یہ ہے کہ ''علم سے عقل آتی ہے اور فہم و فراست پیدا ہوتی ہے۔'' لغوی معنوں میں فہم نام ہے کسی چیز کو سمجھ لینے کا۔ جب کہ اصطلاحی معنوں میں فہم سے مراد ہے عقل و دانش۔ یہ عقل و دانش ہمیں سکھاتی ہے صحیح اور غلط میں تمیز کرنا، اچھی اور بُری چیزوں میں فرق کرنا۔

ایک زمانہ میں میرے ایک ایسے صاحب سے خاصے قربت کے تعلقات تھے، جو بہت نیک اور صاحب علم تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے ایک گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ ایک روز دوران گفتگو انھوں نے مجھے اپنا ایک قصہ سنایا۔ کہنے لگے کہ جب میں کلاس 5 کا طالب علم تھا تو مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کا جب بھی سیالکوٹ آنا ہوتا تو وہ ہمارے ہاں قیام فرماتے۔ ایک روز وہ میرے والد صاحب کے پاس تشریف فرما تھے۔ میں نے جا کر انھیں سلام کیا اور پھر ایک سوال پوچھا ''مولانا صاحب! مسلمان اور کافر میں کیا فرق ہے؟'' مولانا صاحب نے دیکھا کہ بچہ کم عمر ہے لہٰذا انھوں نے میری ذہنی سطح کے مطابق جواب دیا ''بیٹا! کافر اور مسلمان میں وہی فرق ہے جو ایک اچھے اور بُرے شخص میں ہوتا ہے۔'' جس طرح کوئی بُرا شخص کسی اچھے انسان کو نیکی کرتا دیکھ کر فوراً کہتا ہے کہ اُس کی نیکی کے پیچھے اُس کے ذاتی مفادات اور اغراض (Motives) پنہاں ہیں جب کہ اس کے برعکس جب کوئی نیک شخص کسی بُرے شخص کو گناہ کرتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ اس بے چارے سے غلطی ہوگئی۔ وہ کبھی اُسے گناہ گار نہیں کہتا۔ بلکہ اُسے Allowance دیتا ہے اور بہت شائستہ الفاظ میں کہتا ہے کہ اس غریب سے غلطی ہوگئی۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس انسان کا اپنا اُجلا پن اور اچھا پن اُسے کسی کی بُرائی دیکھنے ہی نہیں دیتا اور وہ اسے نظر کا دھوکا ہی سمجھتا ہے۔

اسی طرح جب نیک انسان خود سے کم نیک اور اچھے انسان سے ملتا ہے تو اُس کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ شخص تو بہت اچھا ہے جب کہ دیگر لوگ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ اُس شخص میں تو بہت سی ایسی خامیاں ہیں جن کے بارے میں ہم جانتے ہیں۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ کسی آدمی سے جب ہم ملتے ہیں اور اُس میں جو خامیاں ہمیں دکھائی دیتی ہیں وہ اُس کی نہیں ہوتیں بلکہ ہم اُسے اپنے آئینہ میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہماری اپنی اچھائیاں بُرائیاں اُس آئینہ میں

جھلک رہی ہوتی ہیں۔ جب اعلیٰ ظرف شخص کسی کم ظرف سے ملتا ہے تو اس میں اُسے درحقیقت اپنی خوبیاں نظر آ رہی ہوتی ہیں۔ یہ مقام انسان کو اس وقت عطا ہوتا ہے جب علم اُس پر غلبہ پالیتا ہے۔ اس مقام پر آ کر انسان کو دوسروں میں بُرائیاں نظر نہیں آتیں بلکہ خود میں خامیاں نظر آتی ہیں۔ چونکہ وہ ذہنی طور پر خود کو بُرا سمجھتا ہے اس لیے وہ اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھتا ہے اور انھیں دُور کرتا چلا جاتا ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی خامیاں دُور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب ہم کسی اچھے شخص سے ملیں تو یہ سوچیں کہ اس میں کون سی خوبیاں ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے لوگ اُسے سراہتے اور اُس کی عزت کرتے ہیں۔ وہی خوبیاں ہم اپنے اندر پیدا کر لیں تو خود بھی اچھے ہو جائیں گے اور لوگ ہمیں بھی سراہنے لگیں گے۔

بات علم سے شروع ہوئی تھی۔ ایک علم وہ ہے جو ہم Acquire کرتے ہیں۔ میں آپ لوگوں سے ملتا ہوں۔ گفتگو ہوتی ہے۔ میں اس ملاقات میں دراصل سیکھ رہا ہوتا ہوں۔ مثلاً کسی نے ایک اچھا جملہ کہا۔ میں نے وہ Pick کر لیا اور مختلف محافل میں اُسے دہرا دیا اور واہ واہ سمیٹ لی۔ یہ علم کا سیکھنا نہیں بلکہ اُسے Pick کرنا کہلائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص مجھ سے اُس جملے کے اجزائے ترکیبی پوچھ لے تو میں بات کو گھمانے لگوں گا اور جواب نہ دے پاؤں گا۔

Acquired علم Shallow (کھوکھلا) ہوتا ہے۔ اس میں گہرائی نہیں ہوتی۔ اگر انسان علم کو محض Pick کرنے کی بجائے اُسے سیکھ لے تو اس میں گہرائی آ جاتی ہے۔

علم سیکھنے کا معاملہ ایسا ہے کہ جیسے میں قرآن پاک پڑھتا ہوں۔ اُس کی بہت سی سورتیں مجھے تمام رُموز و اوقاف..... زیر، زبر..... پیش کے ساتھ یاد ہیں۔ میں انھیں بالکل درست لکھ بھی لوں گا لیکن اُن سورتوں کو نہ تو میں کسی Construction of sentence میں استعمال کر سکتا ہوں اور نہ ہی اپنی گفتگو میں کہیں Adjust کر سکتا ہوں۔

گفتگو اور تحریر میں خوب صورتی دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔

1۔ لفظ اپنی صحیح جگہ پر Place کیا جائے۔

2۔ Construction of Sentence گرامر کی رُو سے درست ہو۔

مثال کے طور پر لفظ ''ابتدا'' کے متبادل الفاظ ''شروع'' اور ''آغاز'' ہیں۔ اب ہم ایک جملہ بول یا لکھ رہے ہیں۔ موقع محل کی مناسبت سے صحیح Context اور Background کے ساتھ ہر جگہ پر لفظ ''ابتدا'' کا استعمال غلط ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں لفظ ''شروع'' یا ''آغاز'' بہتر ہو۔ یوں مناسب الفاظ کا صحیح جگہ پر استعمال جملے کے حسن کو دوچند کر دے گا۔ اگر ہمارے پاس Acquired knowledge ہے تو ہم تحریر یا گفتگو میں خوب صورتی پیدا نہیں کر سکیں گے۔

جملے کی خوب صورتی مناسب الفاظ کے استعمال، اُن کی صحیح Placement اور Construction of

sentence میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ فقرہ کی ساخت گرامر کی رُو سے درست ہونی چاہیے۔ Verb، Common Noun، Noun، Adverb غرض یہ کہ ہر لفظ کو صحیح جگہ استعمال کیا جانا چاہیے اور الفاظ کی ترتیب کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔

مثال کے طور پر میں کہوں "میں وہاں گیا تھا۔"

اسی جملہ کو میں ایسے بھی بول سکتا ہوں۔ "میں گیا تھا وہاں۔"

اب دونوں جملوں کو صوتی خوب صورتی (Vocal beauty) دیکھیے۔ تحریر اور گفتگو کے دوران لفظوں کی ترتیب جملے کی خوب صورتی کو گھٹانے اور بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی چیز تحریر کر رہا ہے جسے باآواز بلند پڑھنا مقصود ہے تو اس میں Vocal beauty پر دھیان دینا ضروری ہے تاکہ آواز و الفاظ سماعتوں کو بھلے محسوس ہوں۔

جب ہم کسی علم کو سمجھ کر سیکھتے ہیں تو ہمارے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ملتی جلتی Situation میں ہم اس علم کو Apply کرسکیں۔ Acquired knowledge کی صورت میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ Situation مختلف ہونے کی صورت میں ہم کسی چیز کو Improvise کرسکیں۔ یہ فرق ہے Acquired knowledge اور Learned man میں۔

اگر ہم مذہب یا دین کو سمجھ اور سیکھ لیں تو ہماری زندگی آسان ہو جائے گی۔ یہ جو ہم پر Problems آتی ہیں اور پھر ہم بولائے بولائے پھرتے ہیں کہ صاحب! آج کل میرا کاروبار نہیں چل رہا۔ بہت نقصان ہو رہا ہے۔ اگر میں نے رب تعالیٰ کی باتیں جو بچپن سے لے کر اب تک پڑھی ہیں اُن کو سمجھا اور سیکھا ہوتا تو یہ Problem مجھے پریشان ہی نہ کر پاتی۔ میں کاروبار میں نقصان ہو جانے کی صورت میں خود ہی فوراً جمع تفریق کرلیتا کہ میرے رب نے اپنے کلام کے ذریعہ بتایا ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان دنوں کو پھیرتے رہتے ہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:۔

> "اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچی تو وہ لوگ بھی ویسی ہی تکلیف پا چکے ہیں اور یہ دن ہیں جن میں ہم نے لوگوں کے لیے باریاں رکھی ہیں اور اس لیے کہ اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی۔" (سورۂ آل عمران: 140)

انسان پر اچھے دن بھی آتے ہیں اور بُرے بھی۔ جن دنوں میں تھوڑی سی محنت سے بہت زیادہ آمدنی اور منافع کما رہا تھا تو میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق پھرتے ہوئے اچھے دنوں کو Enjoy کر رہا تھا۔ وقت گزر رہا ہے وہ اچھے دن بیت گئے۔ اب مجھے مشکل دن Face کرنا پڑ رہے ہیں۔ جب اچھے دن نہیں رہے تو بُرے دن بھی گزر جائیں گے تو پھر گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔

اگر میں نے علم کو سمجھا اور سیکھا ہوتا تو اس کے نتیجہ میں مجھے عقل نصیب ہوگئی ہوتی جو مجھے سکھاتی کہ یہ زندگی تمہاری ہے اور کاروبار بھی تمہارا۔ اگر اچھے دن تم نے Enjoy کیے ہیں تو بُرے دن بھی تم ہی بھگتو گے۔

جب علم مجھے یہ سکھا دیتا تو میں مشکل وقت کو بآسانی خوش دلی سے قبول کر لیتا اور جب میں کسی دُعا کرنے والے کے پاس بیٹھ کر گڑگڑا نہ رہا ہوتا بلکہ میں اپنے رب سے کہتا "یا باری تعالیٰ تو ہمیشہ مجھ پر مہربان رہا ہے۔ تو کل بھی مہربان تھا اور آج بھی مہربان ہے۔ تو غنی ہے۔ تو رحیم و کریم ہے۔ مجھے تیری ان صفات پر کبھی شبہ نہیں رہا۔ تیری مہربانیاں اور رحمتیں تو بے پایاں ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں بہت کمزور ہو گیا ہوں اور میں ان بُرے دنوں کی شدت کی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ یا باری تعالیٰ! جہاں تو نے اپنی مہربانیاں ہمیشہ مجھ پر فرمائی ہیں وہاں ایک مہربانی یہ کر دے کہ میرے ان مشکل دنوں کو آسان دنوں میں بدل دے۔"

اگر میں نے علم سیکھا ہوتا اور اس کے نتیجہ میں مجھے عقل حاصل ہو گئی ہوتی تو جب میں کسی دُعا کرنے والے کے سامنے بیٹھ کر نہ گڑگڑاتا۔ بلکہ میں رب تعالیٰ کے سامنے بیٹھ کر اپنی مشکل اور حاجت بیان کرتا۔ اگر میرا بچہ نافرمان ہے بات نہیں مانتا تو میری عقل مجھے سکھائے گی کہ رب تعالیٰ نے تو یہ کہا تھا کہ تم اپنے بچے کی تعلیم و تربیت دستیاب وسائل کے مطابق بہترین انداز میں کر لیکن میں شاید اس میں ناکام ہو گیا۔ عقل مجھے بتائے گی کہ فرض نماز قضا ہو جانے کی صورت میں وہ قضا نماز میں ہی ادا کروں گا کوئی صاحب دُعا میری قضا نماز ادا نہیں کرے گا۔ لہٰذا صاحب دُعا کے پاس جا کر گڑگڑانے کی بجائے بہتر ہے کہ میں اپنی کوتاہی کا کفارہ ادا کروں اور بچے کی تعلیم و تربیت کا فرض بہترین طریقے سے سرانجام دوں۔ یہ میرا فرض ہے جو بہر حال مجھے ہی ادا کرنا ہے نہ کہ کوئی تعویذ گنڈے کرنے والا شخص ایسا کرے گا۔

علم ہمیں یہ صحیح راستہ دکھا دیتا ہے۔ اسلام جس کے ہم پیروکار ہیں حصول علم سے اسے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں آپ کی خدمت میں یوں عرض کرنا پڑیں کہ ہم لوگ اکثر ذرا ذرا سی Problems کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہ مسائل تقریباً سب کی زندگی کا حصہ ہیں۔ دقت جہاں آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ کم و بیش ہم سب کے ذہنوں میں من حیث القوم یہ بات پختہ ہو گئی ہے کہ میری زندگی میں کوئی ذرا سی مشکل بھی نہ ہو۔ سکھ میرے اور دُکھ دوسروں کے ہونے چاہییں۔

یہ ایک Universal Truth ہے۔ کہ وہ زندگی، زندگی ہی نہیں جس میں دُکھ اور سکھ ساتھ ساتھ نہ ہوں۔ خوش حالی و تنگ دستی، بیماری و تندرستی ساتھ ساتھ نہ ہوں۔ کیوں کہ یہی چیزیں ہمیں جستجو، تگ و دو اور محنت پر آمادہ کرتی ہیں۔ جس روز ہماری زندگی سے جستجو نکل گئی ہم زندہ لوگوں میں شمار نہیں ہوں گے۔ جب تک زندگی میں جستجو رہے گی ہم جدوجہد کرتے رہیں گے اور کوشش کرنے والا انسان زندہ ہوتا ہے۔

یہ عجیب خیال ہے کہ ہم میں سے ہر انسان چاہتا ہے کہ اُس کی زندگی میں دُکھ کا ہلکا سا عکس بھی نہ ہو۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ تو یاد رہا کہ شہاب الدین غوری، محمود غزنوی، موسیٰ بن نصیر، خالد بن ولید اور محمد بن قاسم ہمارے اسلاف میں سے تھے۔ عمرو بن العاص کی عمر رسیدگی کے باوجود دلیری اور اولوالعزمی تک ہمیں یاد ہے۔ ہم ان سب کو اپنے اسلاف کے طور پر Own کرتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگیوں کا ایک پہلو ہم اکثر فراموش کر دیتے ہیں۔ وہ صحابہ، جنھیں آپ ﷺ نے دُنیا میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی اُن صحابہ نے پُر مشقت

اور محنت وجدوجہد سے بھرپور زندگی گزاری۔ اسی طرح وہ شخص جسے احساس تھا کہ وہ دُنیا کا وہ واحد انسان ہے جس سے آپ ﷺ نے اپنی اُمت کی بخشش کی دعا کے لیے فرمایا تھا، ایسا اعزاز حاصل ہونے کے باوجود اُنھوں نے جو زندگی گزاری وہ جدوجہد سے عبارت تھی۔

پھر وہ آدمی جو میزبان رسول ﷺ تھا، 90 سال کی عمر میں بھی قسطنطنیہ فتح کرنے نکلا اور وہیں جام شہادت نوش کیا۔ کہاں مدینہ منورہ کہاں قسطنطنیہ۔ لیکن پیرانہ سالی کو فراموش کر کے وہ جدوجہد کرتے رہے۔ ہم اپنے اسلاف کی زندگی کا یہ پہلو فراموش کر دیتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہماری زندگی سے جدوجہد نکل گئی اور ہم دُعاؤں کی طرف راغب ہو گئے حتیٰ کہ ہم چھوٹے چھوٹے مسائل کے حل کے لیے بھی عملی جدوجہد اور کوشش کی بجائے اوراد و وظائف اور دُعا کا سہارا لینے لگے۔ ہمارا یہ رویہ اس بات کا مظہر ہے کہ ہم نے کلمہ تو پڑھ لیا لیکن اس کلمہ کو سمجھا نہیں۔ ہم نے رب کو رازق تو کہا لیکن دل سے یہ نہیں جانا کہ وہ واقعی رازق ہے۔ ہم نے رب تعالیٰ کو قادر مطلق تو کہا لیکن اُس کو کبھی قادر مطلق سمجھا نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا رب ہر جگہ موجود ہے لیکن ہمیں یہ خوف بھی ہے کہ کسی نے تعویذ کر کے میرا رزق باندھ دیا ہے۔ (معاذ اللہ) کون ہے جس کی یہ ہمت ہو کہ میرا رب تعالیٰ تو مجھے رزق دینا چاہے اور کوئی اسے باندھ دے۔ میرا رب تعالیٰ سب سے زیادہ طاقت ور ہے اور اُس کے ہوتے ہوئے کسی کی یہ مجال نہیں کہ میرا رزق باندھ دے۔ اسی طرح میری صحت خراب ہوتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ کسی نے مجھ پر کوئی جادو کرا دیا ہے۔ میں یہ نہیں سوچتا کہ صحت تو میری خراب رہے گی کیوں کہ رات گئے تک میں ٹی وی دیکھتا رہتا ہوں۔ دو بجے کے بعد سوتا ہوں اور صبح دس بجے تک سویا رہتا ہوں۔ بیدار ہونے کے بعد بھی سارا دن میں اخبار پڑھتا، ٹی وی دیکھتا اور دوستوں کے ساتھ گپیں مارتا رہتا ہوں۔ میری اس Routine سے Muscles تو Lethargic ہوں گے ہی اور Muscles کے Lethargic ہونے سے تمام Body system بھی Slow down ہو جائے گا جو ہمارے میٹابولزم کو بھی Slow down کر دے گا۔ جس کا نتیجہ بیماریوں کی صورت میں نکلے گا۔ لیکن میں ان تمام حقائق کو سمجھنے کی بجائے اسی خوف میں مبتلا رہتا ہوں کہ کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔

اگر میرا رب مجھے صحت دے تو جادو کی کیا مجال ہے کہ اس صحت کو بیماری میں بدل دے۔ میرا رب ہر چیز پر قادر ہے۔ جب انسان اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل پر مسلسل کڑھتا رہتا ہے تو پھر دُکھ ہوتا ہے کہ میرے اُن مسلمان بھائیوں کا ایمان اتنا کمزور کیوں ہے کہ رب تعالیٰ کو چھوڑ کر رب کے محتاج بندوں کے پاس جاتے ہیں۔

کائنات میں بسنے والی ساری مخلوق اُسی رب تعالیٰ کی محتاج ہے۔ سب اُسی کے حکم کے پابند ہیں۔ کوئی اُس کے حکم سے باہر نہیں۔ کوئی شخص خواہ کسی مقام پر ہو وہ رب تعالیٰ کے حکم سے باہر نہیں۔ وہ اُسی رب تعالیٰ کا محتاج ہے جس رب کے ہم بندے ہیں۔ اُس نے بھی ہمارے لیے اُس رب کے حضور مہربانی کی دُعا کرنی ہے جس کے حضور مہربانی کی التجا ہم خود بھی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم دُعا کرنے والوں کے پیچھے مارے مارے کیوں

پھریں۔ یہ رویہ انسانی عظمت کے منافی ہے۔ ہاں البتہ اگر ہمیں علم کی تلاش ہے تو جس طرح ہم کالج یا یونیورسٹی میں اپنے پروفیسر کے پیچھے بھاگتے ہیں اسی طرح یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے حصول علم میں اپنی عمر گزار دی۔ تفریحات سے منہ موڑے رکھا اور حصول علم کی تگ و دو میں لگے رہے اور اللہ نے انھیں علم سے نوازا۔ اس لیے آپ اُن کے پاس ضرور جایئے لیکن دُعا کے لیے نہیں بلکہ علم کے حصول کے لیے۔ دُعا تو بہت معمولی چیز ہے اگر یہ معمولی نہ ہوتی تو ہندو بت کو وسیلہ بنا کر دُعا نہ کر رہا ہوتا۔ اور بت کو رب تعالیٰ نے اس حد تک Condemn کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے وقت اپنے دست مبارک سے خانہ کعبہ کے سارے بت توڑ پھینکے۔

Atheist (دہریے) جو رب تعالیٰ کے وجود تک سے انکاری ہیں رب تعالیٰ اُن کے کام کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا دُعا ایک ایسی چیز ہے جو مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھی حاصل ہے۔ اسی طرح ہندو پنڈتوں، بھکشوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں میں کرامات موجود ہیں اور اُن کے ہاں یہ کرامات ''استدراج'' کہلاتی ہیں۔

اگر محض کرامات ہی نیکی اور بڑائی کی علامت ہیں تو پھر ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ تبت میں جنگلات میں بیٹھے ہوئے سادھو کو ولی اللہ مان کر اُس کے سامنے جا بیٹھیں۔

بات تو ساری علم کی ہے..... ایسا علم جو کسی شخص کو صحیح اور غلط میں تمیز سکھا دے۔ آسان لفظوں میں یہ کہہ لیجیے کہ ایسا علم جو ہمیں یہ سکھا سکے کہ

What is what and Who is who?

جو صاحبان علم یہ علم سکھا سکیں، اُن کے پاس جا بیٹھیے اور اُن سے درخواست کریں کہ ہمیں علم دے دیجیے۔ لیکن یہ نہ سوچیے گا کہ وہ فوراً آپ کو علم عطا کر دیں گے۔

علم نام ہے انسان کی Evolutionary progress کا۔ وہاں Revolution کبھی نہیں آئے گا۔ یہ Progress بہت Slow ہوتی ہے اور اس میں عمر بیت جاتی ہے۔ علم سیکھنا ایک Continuous process ہے جس کی کوئی Limit اور انتہا نہیں۔ یہ تو قبر تک ساتھ چلتا ہے۔ بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم صاحبانِ دُعا و علم کے پاس جب جائیں تو بجائے اُن سے دُعا کرانے کے ہم اُن سے علم سیکھ لیں۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ کسی ڈاکٹر سے آپ کی شناسائی ہے۔ آپ اُس کے پاس مریض کو لے جاتے ہیں۔ چیک اپ کے بعد وہ دوا دیتا ہے اور آپ کے عزیز دوست یا رشتہ دار مریض دو دن میں ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اب آپ یہ سوچ سوچ کر خوش ہیں کہ آپ کی ڈاکٹر سے شناسائی اور ڈاکٹر کی دوا کی وجہ سے کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ لیکن ذرا سوچیے کیا یہ زیادہ بہتر نہیں ہے کہ جب آپ کی ڈاکٹر تک Access ہے تو بجائے روزانہ اپنے کسی رشتہ دار مریض کے لیے دوا کی سفارش کرنے کے اُس ڈاکٹر کے پاس بیٹھ کر ڈاکٹری ہی سیکھ لی جائے تا کہ جہاں کوئی بیمار ہوا خود ہی اُس کا علاج کر دیا۔ لہٰذا ڈاکٹر کے پاس جا کر علاج مت کرایئے بلکہ خود ڈاکٹری سیکھ لیجیے۔ معاملات د

مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔

مجبوری یہ ہے کہ مسلمان اور پاکستانی بھائیوں کو چھوٹے چھوٹے مسائل پر کڑھتے ہوئے اور دُعا کے لیے گڑگڑاتا دیکھ کر میرے اندر دُکھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ آج میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ بھائیو! یہ دُکھ کچھ بھی نہیں۔ ہم سب کی زندگی ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔ صرف یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ زندگی دراصل نام ہی سکھ دُکھ، خوشحالی تنگ دستی، صحت اور بیماری کا ہے۔ اس کا ایک پہلو نکال کر ہم اس زندگی کو ادھورا اور نامکمل کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ ایسی زندگی Natural نہیں ہوگی۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا کیوں کہ رب تعالیٰ نے زندگی کو Design ہی ایسا کیا ہے۔ جب زندگی نام ہی دُکھ سکھ، کامیابی اور ناکامی کا ہے تو ضروری ہے کہ جس طرح ہم کامیابیوں کو خوش دلی سے اپناتے اور Own کرتے ہیں اُتنی ہی خندہ پیشانی سے ناکامیوں کو بھی گلے سے لگانا سیکھ لیں۔ یہ رویہ زندگی کو آسان بنا دیتا ہے۔ پھر انسان ہر وقت مسکراتا پھرتا ہے۔

ولایت کے حصول کا آسان طریقہ

سوال: مختلف صحابہ کرامؓ کے آپس میں سلوک اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ہونے والے مختلف واقعات کے پس منظر میں یہ بتایئے کہ زیادتی کس کی طرف سے ہوئی تھی؟

جواب: اس سلسلے میں میرا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ خلفائے راشدین خواہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہوں، چاروں اس قدر بلند پایہ ہستیاں ہیں اور چاروں کو آپ ﷺ کے ہاتھوں اس طرح نوازا گیا ہے کہ ہم جیسے چھوٹے لوگ جو اُن کی خاک پا بھی نہیں اُن کے لیے اتنی عظیم ہستیوں پر Comment کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اُن کا آپس میں کیا سلوک رہا؟ اُن کا بیبیوں (اُمہات المومنین) کے ساتھ کیا رویہ تھا؟ ہم اس پر Comment کرنے کی پوزیشن میں نہیں کیوں کہ ہم خوبیوں، مقام اور کردار میں اُن جیسے نہیں ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی دیا اُٹھ کر سورج کی روشنی پر Comment کرنے لگے۔ دیئے کی کیا مجال اور حیثیت کہ وہ بتاسکے کہ سورج میں Ultraviolet Rays زیادہ ہیں یا کم۔ میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ اُن ہستیوں کے معاملات اُنہی کے درمیان رہنے دیئے جائیں تاکہ ہم گستاخ نہ کہلائیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہم پر سب کا ادب واحترام لازم ہے۔ اپنے بارے میں مجھے یہ پورا یقین ہے کہ میں اتنا ناپاک ہوں کہ میں کسی بی بی کا نام نہیں لے سکتا۔ ہماری بچت اسی میں ہے کہ ہم اپنے آپ کو چھوٹا سمجھ کر اور اپنے آپ کو چھوٹا بیان کر کے ان معاملات سے خود کو دُور لے جائیں۔ اُن کے آپس کے معاملات رب جانے یا پھر آپ ﷺ جانیں۔

سوال: ولایت کے حصول کا آسان طریقہ کیا ہے؟

جواب: یہ دو راہ ہے، جس کا شارٹ کٹ ابھی تک دریافت نہیں ہو پایا۔ اس میں سب سے آسان ترین راستہ جو میرے علم میں ہے وہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث مبارکہ یا سنت نبوی ﷺ کو ہم اپنے دو بازوؤں کے طور پر استعمال کریں۔ جس طرح پرندہ اپنے دائیں اور بائیں پر کو پرواز کے لیے ایک ہی وقت میں استعمال کرتا ہے اور اُوپر اُٹھتا چلا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر ہم قرآن و حدیث کو دو پروں کی مانند استعمال کر لیں تو ہماری رُوح کی پرواز شروع ہو جائے گی۔

ہم نیکی کی رہ اختیار کریں اور اللہ کے بتائے ہوئے Do'sاور Do nots کو To the letter and spirit Follow ہم کریں۔ نفس پر قابو پالیں۔ یہ ایک دن میں نہیں ہوگا۔ یہ ایک Continuous process ہے جو قبر تک جاری رہتا ہے کیوں کہ انسان کی خواہشات، اُس کی لذتیں اور منہ کا ذائقہ...... یہ ایسی تین بڑی رُکاوٹیں ہیں جو انسان کو کہیں پہنچنے نہیں دیتیں۔ ان کو اگر ہم Control کرلیں اور قرآن وحدیث کو اپنے پَر بنالیں تو رُوحانیت کی راہ کی طرف پرواز شروع ہو جائے گی۔

اُردو ادب میں چکور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب چاند اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے تو وہ اُس کی طرف پرواز کرتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ بے دم ہو کر زمین پر آن گرتا ہے۔ چاند کی محبت میں چکور اپنی جان گنوا دیتا ہے۔ اگر ہم رُوحانیت کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں تو چکور کی مانند ہمیں رب تعالیٰ سے پیار کرنا ہوگا اور اللہ کی محبت میں ہم اپنی خواہشات کو دفن کردیتے ہیں اور اُس کی بتائی ہوئی چیزوں کو Adopt کر لیتے ہیں۔

ایک اور بات بتادوں جو قرآن وحدیث سے بھی ثابت ہے کہ جو شخص کسی انسان کو صرف اللہ کے نام پر اس طرح پیار کرتا ہے جس طرح کسی سے صرف اللہ کے لیے بغض رکھتا ہے تو رب تعالیٰ اتنا حیادار اور وضع دار ہے کہ وہ صرف اسی نسبت سے کہ اس نے میرے کسی بندے سے میری وجہ سے پیار کیا ہے اس بندے سے پیار کرنے لگتا ہے۔ لہٰذا خلق خدا سے پیار کیجیے۔ یہ چند ایک چیزیں ہیں جن پر اگر ہم عمل کرلیں تو رب تعالیٰ بڑی جلدی مل جاتا ہے۔

میں اکثر ایک بات کہا کرتا ہوں کہ رب کی راہ پر جب انسان چلتا ہے تو اُس کا کشف وکرامات سے واسطہ پڑتا ہے۔ انسان کے ہاتھوں خرق عادات چیزیں سرزد ہونے لگتی ہیں جو مخلوق کے لیے اجنبی ہوتی ہیں۔ جو انسان رب تعالیٰ تک پہنچنے کا خواہش مند ہے اور ولایت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ان کرامات کو اپنی محنت کا حاصل نہ سمجھے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے ہم کسی کارخانہ میں کوئی چیز Produce کرتے ہیں تو بہت سی Byproducts ہمیں Automatically حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ کشف وکرامات بھی اللہ کی محبت اور اُس کی طرف سفر کا Byproducts ہیں۔ یہ حاصل نہیں ہیں۔ اگر کسی مقام پر پہنچے بغیر ان کرامات میں ہم کھو گئے اور ان پر توجہ دے بیٹھے (جو اکثر ہو جاتا ہے) تو ہماری راہ کھوٹی ہو جائے گی اور ہم کہیں پہنچ نہیں پائیں گے۔ اگر ہم نے ان کشف وکرامات کو نظر انداز کردیا یہ سوچ کر کہ میری منزل تو "رب" ہے تو ہم رب تعالیٰ تک پہنچ جائیں گے۔ تب یہ کشف وکرامات اور خرق عادات چیزیں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا پائیں گی۔

ان تمام اُمور پر توجہ ضروری ہے۔ اگر رب چاہیے تو ان تمام باتوں کا دھیان رکھنا ہوگا۔ میرے خیال میں تو رب تعالیٰ کے حصول، اُس کے قرب، دوستی اور محبت کو پانے کے لیے سب سے آسان طریقہ یہی ہے۔

ایک اور آسان راستہ بھی ہم اپنا سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ میں کچھ اور نہ کروں صرف کسی صاحب علم کے نقش پا (Footprints) پر پاؤں رکھتا ہوا چلتا چلا جاؤں۔ ہوگا یہ کہ چونکہ میں کسی صاحب علم کے نقش پا کی پیروی کر رہا ہوں تو جہاں وہ گئے ہیں میں بھی وہیں جا پہنچوں گا۔ لیکن یاد رکھیے کہ اس سارے کھیل میں پیار بنیادی شرط

ہے کہ رب تعالیٰ سے پیار کیا جائے اور کسی صاحب علم سے پیار پالا جائے کیوں کہ اس پیار ہی کی بنیاد پر ہم اُس کی جستجو اور تلاش میں اُس کے پاؤں کے نشانوں پر پاؤں رکھتے چلتے چلے جائیں گے اور اس صاحب علم کے مقام تک جا پہنچیں گے تا کہ اُس سے ملاقات ہو سکے۔ صاحب علم سے یہ محبت ہمیں رب تعالیٰ تک لے جائے گی کیوں کہ وہ رب کو پا چکا ہے۔ یہ آسان ترین نسخہ ہے رب تعالیٰ کو پانے کا۔

ایک اور آسان نسخہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کثرت اور باقاعدگی سے کی جائے۔ عربی سے نابلد ہونے کے باعث قرآن پاک کا مفہوم تو سمجھ نہیں آئے گا لیکن جس طرح کچھ Singers عربی سے ناواقف ہونے کے باوجود عربی نغمہ بہت خوب صورتی سے گا لیتے ہیں۔ مفہوم پوچھا جائے تو Blank eyes دکھا دیتے ہیں۔ البتہ مفہوم سے ناآشنا ہونے کے باوجود وہ Audience سے داد ضرور سمیٹ لیتے ہیں۔ اسی طرح معانی و مطالب سے ناواقف ہونے کے باوجود جب ہم محبت سے قرآن پاک کثرت سے پڑھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ متوجہ ضرور ہوتا ہے کہ اس سے پوچھو...... یہ کیا مانگتا ہے۔ بس وہی موقع ہے کہ اُس سے حسب توفیق کچھ نہ کچھ مانگ لیا جائے۔

سوال: میت کو دفن کرنے کے بعد اذان دی جانے لگی ہے، کیا یہ عمل درست ہے؟

جواب: ہر وہ کام جو قرآن و حدیث، سنت اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہو جائے وہ درست ہے۔ بصورت دیگر کسی بھی کام سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ آپ ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں نہ ایسی کوئی مثال نظر آتی ہے نہ اس سلسلے میں کوئی روایت یا تحریر موجود ہے کہ میت کو دفن کرنے کے بعد اذان دی گئی ہو۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ایسے عمل کو Avoid ہی کر لیا جائے تو مناسب ہے تا کہ بھٹکنے سے محفوظ رہ جائیں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ بسم اللہ کے 786 اعداد ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے 19 اعداد ہیں۔ آپ ﷺ کے اسم مبارک کے کل عدد 92 بنتے ہیں۔ اس پر روشنی ڈال دیجیے۔

جواب: ایک علم ہے علم الاعداد جسے انگریزی میں Numerology کہا جاتا ہے اور اس پر کافی کام بھی ہو چکا ہے۔ لوگوں نے قرآن پاک کا Code بھی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے High Speed Computers استعمال کیے اور اپنی ریسرچ پر مبنی ضخیم کتابیں لکھیں۔ ان میں سے کسی بھی کتاب کو پڑھ لیں یوں لگتا ہے کہ جیسے ہر Researcher (محقق) درست کہہ رہا ہے۔

ایک صاحب نے تحقیق کی کہ قرآن پاک Based ہے Figure 9 پر۔ اُنھوں نے کمپیوٹر کے ذریعے مختلف نتائج کے بعد جو Totals بنائے وہ بظاہر درست تھے۔ اُن دنوں میں کسی کام کے سلسلے میں کینیڈا میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک صاحب میرے پاس آئے۔ ایک کتاب مجھے دی اور کہنے لگے کہ اس کے Writer کا خیال ہے کہ قرآن ہندسہ نو پر Base کرتا ہے۔ تب میں نے اُن سے گزارش کی کہ اب تک میرے علم کے مطابق اس موضوع پر آٹھ نو کتابیں مارکیٹ میں آ چکی ہیں۔ جن میں سے ایک Figure 6، دوسری میں 3 اور تیسری

میں 1 کو قرآن پاک کا Code بتایا گیا ہے۔ یہ کتابیں میں خود بھی پڑھ چکا ہوں۔ مختلف Schools of thought کے لوگوں نے اس پر کام کیا۔ میں نے عرض کیا کہ 1 to 9 figure کے بعد Compound figures ہیں۔ مثلاً اگر ہم اسے Double one کرتے ہیں تو یہ 11 ہو جائے گا اور اگر ون ٹو (1 2) کرتے ہیں تو 12 ہو جائے گا۔ یہ اللہ کا اسرار ہے اور رب تعالیٰ کے اسرار اتنے آسان نہیں ہیں کہ کمپیوٹر کے ذریعے اُنھیں حل کیا جا سکے۔ اس لیے آپ ون ٹو نائن (1-9) کسی بھی ہندسے پر قرآن پاک کو پرکھ لیں وہی اس کا Base code معلوم ہوگا حالانکہ ان میں سے کوئی بھی ہندسہ قرآن پاک کا Code نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کا جو متن (تحریر) ہے اسے اگر سُر اور تال کی نسبت سے دیکھیں تو ایک حیران کن بات سامنے آتی ہے کہ اگر پورے قرآن پاک کو ایک مخصوص سُر اور تال (جسے راگ کہتے ہیں) پر پڑھا جائے تو تلاوت کا رنگ اور اثر ہی بدل جائے گا۔ وہ بہترین تلاوت ہوگی۔ یہ سب قرآن پاک کے معجزات ہیں۔ قرآن پاک کلامِ الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے تو بھید ہی نرالے ہیں۔

جس طرح حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ نہیں معلوم کہ اللہ نے اُن پر کس درجہ کا کرم فرمایا ہے۔ ایک اُمی شخص کہتا ہے کہ داتا صاحب بہت بڑے ولی اللہ ہیں۔ کوئی عمران وہاں چلا جاتا ہے تو سمجھتا ہے وہ ابدال ہیں۔ ابدال وہاں حاضری دیتا ہے تو وہ اُنھیں جس بلندی پر دیکھتا ہے اس کی بنا پر اُنھیں قطب سمجھتا ہے۔ جب کوئی قطب وہاں حاضر ہوتا ہے تو اُن کا مقام دیکھ کر اُنھیں قطب زماں (غوث) تصور کرتا ہے۔ جب کوئی غوث وہاں حاضری دیتا ہے تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ داتا صاحب فائز کس مقام پر ہیں؟

معلوم نہیں کہ داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر کس قسم کی رحمتیں ہوئی ہیں اور مسلسل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اسی طرح جب رُوحانیت کی راہ میں اللہ تعالیٰ اپنے اولیا کو کارخانہ قدرت میں جھانکنے کی اجازت دیتا ہے تو ابتداً بندہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نے سب کچھ سیکھ لیا۔ لیکن جب اُس کے درجات بلند ہو جاتے ہیں تو اس حساب سے اُس کی سیر بھی وسیع ہو جاتی ہے۔ تب وہ پھر یہی سوچتا ہے کہ اب میں نے کارخانہ قدرت کو سمجھ لیا۔ جونہی اُس کے دل میں یہ خیال آتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے ایک جھٹکا دیتا ہے اور اُسے مزید بلندی عطا کرتا ہے۔ جب وہ وہاں جھانکتا ہے تو کہتا ہے دُنیا بہت وسیع ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آتا ہے جب وہ بہت کچھ دیکھنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ وہاں پھر انسان زمین پر ناک رگڑتا ہے۔ وہ سجدہ میں گر جاتا ہے اور بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے "یا اللہ تو بہت عظیم ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ سب تو ہی جانتا ہے۔ تیرے بھید بہت نرالے ہیں۔ ان کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا اور نہ کبھی سمجھ پائے گا۔" لہٰذا ایسا رب جس کے اسرار اور بھید اس قدر وسیع ہیں اُس تک کون رسائی حاصل کر پائے گا۔ اللہ کے نام کے علم الاعداد کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔

جہاں تک علم الاعداد کے مطابق بسم اللہ کے اعداد کا تعلق ہے تو وہ واقعی 786 بنتے ہیں۔ لیکن آپ کے

فائدہ کے لیے بتاتا چلوں کہ بسم اللہ پڑھنے کا تعلق 786 اعداد کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھ کر بسم اللہ 786 بار پڑھے کیوں کہ اس کے اعداد 786 ہیں تو یہ سوچنا غلط ہے۔ اس سے محض ثواب کے سوا کچھ آپ کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہ آپ کی Individual chemistry اور شخصیت ہے جس کی بنا پر فیصلہ کیا جائے گا کہ کتنی بار بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی جائے؟ کس وقت پڑھیں؟ نماز سے پہلے یا پھر بعد میں پڑھیں؟ یا نوافل کے بعد پڑھیں؟ ان نوافل کی تعداد کیا ہو؟ یہ سب ڈھکی چھپی باتیں ہیں۔ محض 786 بار بسم اللہ الرحمن الرحیم کا وظیفہ پڑھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔

ایک اور بات بھی یہاں ضمناً عرض کر دوں کہ کچھ لوگ اپنی تحریر کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ "۷۸٦" لکھ دیتے ہیں۔ یہ درست نہیں پورا بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنا چاہیے۔

جہاں تک اللہ کے نام کے اعداد اور بسم اللہ کے اعداد کی تعداد کے سوال کا تعلق ہے تو مجھے ان اعداد سے کیا لینا؟ میرا واسطہ تو بس اپنے رب کے ساتھ ہے۔ میں تو پہلی بار جب عمرہ کے لیے گیا تو بہت سے لوگوں نے کہا کہ اللہ کے گھر جا رہے ہو پہلی نظر جب خانہ کعبہ پر پڑے تو جو دُعا مانگو وہ قبول ہو جاتی ہے۔ انھوں نے مجھے مختلف دُعاؤں کی تاکید کی کہ یہ مانگ لینا، وہ مانگ لینا۔ میں پھر سارا رستہ دُعائیں رٹتا گیا لیکن ہوا یہ کہ جیسے ہی خانہ کعبہ پر میری پہلی نظر پڑی میں سب کچھ بھول گیا اور ہر فاسق وفاجر اور گناہ گار کی طرح میں نے عرض کیا "یا باری تعالیٰ! مجھے تو یہ ساری دُعائیں پڑھنا آتی ہیں نہ پڑھوں گا۔ تو دل کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں بڑے سچے دل سے تجھے اپنا رب مانتا ہوں اور خود کو تیرا بندہ۔ میں یہ سنتا آیا ہوں کہ تیرے گھر پر پہلی نظر پڑنے پر جو دُعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ تو آج تیرے اندر کچھ دینے کا حوصلہ ہے تو ساری دُنیا کو چھوڑ اور تو صرف میرا ہو جا۔"

لہٰذا میں تو اس انتظار میں بیٹھا ہوں کہ رب تعالیٰ کب اپنی دُنیا کو چھوڑ کر میرا ہوتا ہے۔ مجھے تو اللہ سے غرض ہے۔ اُس کے نام کے علم الاعداد سے مجھے کیا لینا۔ البتہ میرے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اللہ کے نام کے اعداد گیارہ ہیں۔ گیارہ کا یہ عدد جس کا تعلق رب سے ہے اس کی خوب صورتی یہ ہے کہ اسے ایک جمع ایک برابر دو کر کے Single Digit میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسے ایک اور ایک گیارہ ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔

جہاں تک تعلق ہے آپ ﷺ کے اسم مبارک کے اعداد کا تو میرے نزدیک آپ ﷺ کے اسم مبارک کے اعداد نکالنا خلاف ادب ہے اور آپ ﷺ کا ذاتی نام لینا گستاخی ہے۔ آپ ﷺ کا ہم پر اس قدر احسان ہے کہ اس کا شمار نہیں۔ اس احسان کو Acknowledge کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ حتی المقدور آپ ﷺ کا ادب کیا جائے۔ محض علم کی حد تک یہ عرض کر دیتا ہوں کہ آپ ﷺ کے نام کا تعلق 92 اعداد سے نہیں بلکہ Figure 7 سے ہے۔

سوال: تصوف میں سلطان سے کیا مراد ہے؟

جواب: تصوف میں سلطان کے وہی معنی ہیں جو عام بول چال میں لیے جاتے ہیں۔ حضرت سلطان حق باہو صاحب سلطان العارفین کہلاتے ہیں۔ وہ عادات اور سخاوت میں واقعی سلطان ہیں۔ بے حد سخی اور دریا دل انسان ہیں۔ واقعی اسم بامسمّیٰ ہیں۔

سوال: کوئی ایسا طریقہ بتا دیجیے کہ اللہ کے نزدیک ہو کر ہم دُنیاوی آسائشیں حاصل کر سکیں؟

جواب: میں منع تو نہیں کرتا کہ آپ دُنیا کی خواہش نہ کریں لیکن یہ حقیقت ضرور جان لیجیے کہ رب تعالیٰ کا قرب آپ کو دُنیاوی آسائشوں سے دُور کر دے گا۔ آپ رب تعالیٰ کی جتنی قربت حاصل کریں گے دُنیاوی آسائشیں اسی قدر آپ سے دُور ہوتی چلی جائیں گی یا پھر آپ خود اُنھیں دُور کرتے چلے جائیں گے۔

آپ ﷺ اللہ کے ایسے محبوب ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے دن رات آپ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ آپ ﷺ وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ لیکن آپ ﷺ کی حیات مبارکہ دیکھیں تو وہ دُنیاوی آسائشوں سے عاری نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ کی اولاد نرینہ حیات نہ رہی۔ آپ ﷺ کی صاحبزادی جن سے آپ ﷺ بے پناہ پیار کرتے تھے اُن کے ہاتھوں پر چکی پیس پیس کر نشان پڑ گئے تھے۔ پانی کا مشکیزہ اُٹھا اُٹھا کر کندھوں پر Strap کے نشان پڑ گئے تھے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کی یہ لاڈلی صاحبزادی آپ ﷺ کی خدمت میں عرض گزار ہوئیں کہ زندگی بہت سخت ہو گئی ہے تو آپ ﷺ نے دُعا کر کے اُن کی زندگی آسان نہیں کی۔ حالانکہ آنکھ کا اشارہ تو دُور کی بات ہے آپ ﷺ محض سوچ ہی لیتے تو کام ہو جاتا کیوں کہ آپ ﷺ کا مقام اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بلند ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دُنیا میں بھیجے جن میں سے چالیس Known پیغمبر ہیں۔ اُن کی زندگیاں بھی سختیوں سے بھری نظر آتی ہیں۔ صحابہ کرامؓ کی حیات کا مطالعہ کر لیں اُنھیں پیٹ پر پتھر باندھنا پڑے۔ اولیائے کرام کی زندگی میں بھی تلخی اور سختی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا دُنیاوی آسائشیں اگر رب کو عزیز ہوتیں تو وہ اپنے محبوب بندوں کو یہ سب سے پہلے عطا کرتا۔ لیکن اُس نے تو اُنھیں ان سے دُور رکھا۔ اس لیے یہ خیال کہ اللہ کے قریب ہو کر دُنیاوی آسائشوں کو پایا جا سکتا ہے کچھ زیادہ مناسب نہیں۔

دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے اور قرض کی ادائیگی کی دعائیں

دو ایسی دعائیں ہیں جن کے لیے لوگ بہت کثرت سے سوال کرتے ہیں۔

1۔ دوسروں کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا

2۔ قرض کی ادائیگی کی دعا

پریشانی بہر حال انسانی فطرت ہے۔ رب تعالیٰ کے اُتارے ہوئے دین پر عمل کرتے ہوئے انسان اپنی فطرت کی بہت سی چیزوں کو تبدیل تو نہیں کر پاتا لیکن Tame ضرور کر لیتا ہے۔

ہمارے پاس ایک بہت بڑا ہتھیار موجود ہے جس کی مدد سے ہم اپنی زندگی میں در آنے والی پریشانیوں کا مقابلہ بآسانی کر لیتے ہیں۔ وہ ہتھیار ہے رب تعالیٰ پر بھروسا۔ جب رب پر بھروسا ہونے لگتا ہے تو پھر کوئی پریشانی انسان کو فکر مند نہیں کرتی۔ تب انسان کے دل میں ایک آواز اُٹھنے لگتی ہے کہ میرا رب موجود ہے جو مجھے Look after کرتا ہے۔ میری ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ اگر میں پریشانی میں گھر گیا ہوں تو اب بھی میرا رب مجھ پر مہربانی فرمائے گا اور اس قرض سے مجھے نجات دلائے گا۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ پریشانی انسان پر اس قدر غلبہ پا لیتی ہے کہ اس کے اندر موجود رب پر بھروسا دم توڑنے لگتا ہے اور ایسے ہی کسی Unguided moment میں وہ بکھر جاتا ہے اور نتیجتاً اپنی ہی طرح رب کے کسی محتاج بندے کے پاس دُعا کروانے چلا جاتا ہے اور اُس کے سامنے گڑگڑانے لگتا ہے۔

آپ ﷺ کی زندگی میں بہت سے کٹھن مقامات آئے۔ حالانکہ آپ ﷺ کی ذات اس قدر بلند ہے کہ آپ ﷺ کے بارے میں اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے بعد سب سے بڑے ہیں۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آپ ﷺ سب سے بڑھ کر اللہ کے محبوب ہیں۔ اس مقام و مرتبہ کے پیش نظر کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ ﷺ اتنی مشکل زندگی گزارتے۔ لیکن مقصد صرف یہ تھا کہ آپ ﷺ نے ہماری مانند زندگی بسر کرنا تھی۔ اگر آپ ﷺ بشر نہ ہوتے تو ہمارے پاس بہانہ آ جاتا کہ آپ ﷺ تو نور تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ہماری فطرت سے بخوبی واقف ہے اس لیے اُس نے آپ ﷺ کو بشری صورت پیدا فرمایا اور ہر اُس امکانی چیز سے گزارا جس سے

ایک عام انسان کو واسطہ پڑ سکتا ہے تاکہ ہمارے لیے ایک مثال قائم ہو جائے کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ کا کیا عمل یا ردِ عمل تھا۔

آپ ﷺ کی زندگی میں بہت مشکل وقت اکثر و بیشتر آتا رہا۔ جنگ احزاب بھی ایسا ہی کٹھن وقت تھا۔ تب آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حضور ایک دُعا کی تھی جو بعد ازاں صحابہ کرام بھی کرتے رہے۔ وہ دُعا یوں ہے۔

نوٹ: آغاز میں تین بار درود پاک پڑھ لیا جائے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ وَبِنُوْرِ قُدْسِكَ وَعَظْمَةِ طَهَارَتِكَ وَبَرَكَاتِ جَلَالِكَ مِنْ كُلِّ اٰفَةٍ وَعَاهَةٍ وَطَارِقِ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ مِنْكَ بِخَيْرٍ اَللّٰكَ اَنْتَ عِيَاذِيْ فَبِكَ اَعُوْذُ وَاَنْتَ مَلَاذِيْ فَبِكَ اَلُوْذُ وَيَامَنْ ذَلَّتْ لَهٗ رِقَابُ الْجَابِرَةِ وَجُمِعَتْ لَهٗ مَقَالِيْدُ الرِّعَايَةِ اَعُوْذُ بِجَلَالِ وَجْهِكَ وَكَرَمِ جَلَالِكَ مِنْ خِزْيِكَ وَكَشْفِ سِتْرِكَ وَنِسْيَانِ ذِكْرِكَ وَالْاِنْصَرَافِ مِنْ شُكْرِكَ اَنَافِیْ كَنَفِكَ فِیْ لَيْلِیْ وَنَهَارِیْ وَنَوْمِیْ وَقَرَارِیْ وَظَعْنِیْ وَاَسْفَارِیْ ذِكْرُكَ شِعَارِیْ وَثَنَاءُكَ دِثَارِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ تَنْزِيْهًا لِاِسْمِكَ وَتَكْرِيْمًا لِسُبُحَاتِ وَجْهِكَ اَجِرْنِیْ مِنْ خِزْيِكَ وَمِنْ شَرِّ عَذَابِكَ وَعِبَادِكَ وَاضْرِبْ عَلَیَّ سُرَادِقَاتِ حِفْظِكَ وَاَدْخِلْنِیْ فِیْ حِفْظِ عِنَايَتِكَ وَقِنِیْ سَيِّاٰتِ عَذَابِكَ وَاَغْنِنِیْ بِخَيْرٍ مِّنْكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ

"اے اللہ میں تیرے ہاں امن کی درخواست کرتا ہوں، تیرے پاک نور اور تیری پاک بزرگی اور تیرے جلال کی برکتوں کے ذریعے سے ہر آفت و رنج، جنوں اور انسانوں کی بلا سے امن چاہتا ہوں۔ جو کچھ تیری طرف سے مجھے پہنچے میں اُس پر راضی ہوں۔ میری پناہ تو ہی ہے۔ میں تجھی سے پناہ مانگتا ہوں۔ میرے لیے امن کی جگہ تو ہی ہے۔ سب گردن کشوں کی گردنیں تیرے سامنے خم ہیں اور وہ تیرے سامنے خوار و ذلیل ہیں۔ اپنی مخلوقات کی حفاظت اور رعایت کی چابیاں تیرے ہی خزانے میں ہیں۔ اسی لیے میں تیری ذات کے جلال کے طفیل تجھ ہی سے امن چاہتا ہوں اور تیرے رُو برو رُسوا ہونے سے محفوظ رہنے کی درخواست ہے کہ میری پردہ دری نہ کی جائے۔ تیری یاد سے فراموشی نہ اختیار کروں۔ تیری شکر گزاری سے باز نہ رہوں۔ رات کے وقت، دن میں، سوتے، جاگتے آرام، سفر، وطن میں تیری حفاظت میں رہنے کی درخواست ہے۔ تیرا ہی ذکر میرا اشعار ہو اور میرا لباس تیری تعریف ہو۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ہے۔ میں تیرے نام کو بالکل پاک جانتا ہوں۔ تیرے نور کو بہت بزرگ و برتر سمجھتا ہوں۔ مجھے رُسوائی سے بچا، عذاب اور اپنے بندوں کی بُرائی سے بچا۔ میرے لیے نگہبانی کے خیمے کھڑے کر اور اپنی رحمت کے

دروازے کھول کر اس سے مجھے غنی کر دے، تنگی سے مالا مال کر دے تو سب سے زیادہ
رحیم ہے۔''

آخر میں درود پاک پڑھ لیا جائے۔

یہ دُعا مصائب اور ظلم و ستم کو دُور کرنے کے لیے بہترین ہے۔ ہر مشکل وقت میں اور ہر نماز کے بعد یہ دُعا پڑھی جا سکتی ہے۔ اسے روزمرہ معمول کا حصہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اس کی فضیلت اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ خود آپ ﷺ نے یہ دُعا مانگی ہے۔

قرض کی ادائیگی کے حوالے سے بھی ایک دُعا آپ ﷺ نے مانگی۔ جس کی راوی حضرت عائشہؓ ہیں۔ ایک بار حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے اور دریافت کیا ''اے عائشہؓ! کیا آپ کو وہ دُعا یاد ہے جو آپ کو آپ ﷺ نے سکھائی تھی؟'' حضرت عائشہؓ نے جواب دیا ''جی ہاں مجھے وہ دُعا یاد ہے اور اس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص بے پناہ مقروض ہو۔ حتیٰ کہ اُس کا قرض پہاڑ کے برابر بھی ہو تو یہ دُعا پڑھنے سے اُس کے قرض کی ادائیگی آسان ہو جائے گی۔'' دُعا کا متن یہ ہے۔

نوٹ: جب بھی یہ دُعا مانگیں اس سے قبل تین بار درود پاک پڑھ لیں۔

اَللّٰهُمَّ فَارِجَ الْهَمِّ كَاشِفَ الْغَمِّ مُجِيْبَ دَعْوَةِ الْمُضْطَرِّيْنَ رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَرَحِيْمَ الْاٰخِرَةِ اَسْئَلُكَ اَنْ تَرْحَمَنِيْ بِرَحْمَةٍ مِّنْ عِنْدِكَ تُغْنِيْنِيْ بِهَا عَنْ رَّحْمَةِ مَنْ سِوَاكَ۔

''اے اللہ! عقدوں کا کھولنے والا اور غم و الم کو دُور کرنے والا تو ہی ہے۔ تو بے قراروں کی دُعا قبول کرنے والا ہے۔ تو دُنیا میں رحمان ہے اور آخرت میں رحیم۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھ پر اپنی رحمت کر اور اپنی رحمت کے طفیل مجھے غیر سے بے نیاز کر دے۔''

نوٹ: آخر میں تین بار درود پاک پڑھ لیا جائے۔

ایک اور دُعا جو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ شہر کا ایک معزز آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے حالات کی خرابی اور مقروض ہونے کی شکایت کر کے درخواست کی کہ آپ مجھے اسم اعظم بتا دیجیے تاکہ میں اللہ کو اسم اعظم سے پکاروں اور قرض کی ادائیگی کے لیے دُعا کروں تاکہ اللہ مجھے قرض سے نجات دلائے۔ اُس آدمی کی درخواست پر حضرت حسن بصری جن کی کنیت ابو سعید تھی نے یہ دُعا بتا کر فرمایا تھا کہ اس میں اسم اعظم پوشیدہ ہے۔ جب اُس شخص نے یہ دُعا پڑھی تو اسے مسجد میں اشرفیوں کی ایک تھیلی ملی جس پر تحریر تھا کہ تم نے مجھ سے بہت کم مانگا۔ اگر جنت مانگتے تو وہ بھی عطا کر دی جاتی۔

یہ دُعا اگر آپ چاہیں تو تہجد کی نماز کے بعد مانگ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی جب اور جس نماز کے بعد چاہیں یہ دُعا مانگ سکتے ہیں۔ چلتے پھرتے بھی یہ دُعا کی جا سکتی ہے۔ شرط محض یہ ہے کہ یہ دُعا مانگتے ہوئے

انسان باوضو حالت میں ہو۔

امید ہے کہ اس دُعا کی بے پناہ برکات آپ کو حاصل ہوں گی۔

اشرفیوں کی تھیلی والا قصہ بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ واضح ہو جائے کہ اسم اعظم کے ساتھ رب تعالیٰ کو پکارنے سے مراد تو برآئے گی اور قرض ادا ہو جائے گا۔ لیکن تھیلی پر درج تحریر میرے نزدیک تو اطلاع کی بجائے ایک گلہ ہے کہ رب فرما رہا ہے اپنے بندے سے کہ تم نے مجھ سے بہت کم مانگا، جنت بھی مانگتے تو وہ بھی دے دیتا۔ دراصل دُنیا رب تعالیٰ کے حضور کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ لہٰذا اگر ہم رب تعالیٰ سے کچھ مانگیں تو وہ اُس کے شایانِ شان تو ہو۔ میرے خیال میں رب کے شایانِ شان صرف اُس کی ذات ہے۔ جب رب ہمارا ہو گیا تو اُس کی ساری کائنات بھی ہماری ہو گئی۔

یہ جو میں اکثر و بیشتر رب تعالیٰ کے شایانِ شان مانگنے کی بات کرتا ہوں یہ شاید کچھ لوگوں کو عجیب لگے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ دُنیاوی مال و زر اور آسائش رب تعالیٰ کے نزدیک بہت حقیر چیزیں ہیں اور تھیلی پر لکھی تحریر اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب دُعا یوں ہے:۔

پہلے تین بار درود پاک پڑھ لیجیے۔

یَا اللّٰہُ یَا اللّٰہُ اَنْتَ اللّٰہُ اَنْتَ اللّٰہُ بَلٰی وَاللّٰہِ اَنْتَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اللّٰہُ اللّٰہُ اللّٰہُ وَاللّٰہِ اِنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِقْضِ عَنِّی الدَّیْنَ وَارْزُقْنِیْ بَعْدَ الدَّیْنِ

''یا اللہ! یا اللہ! سچا خدا تو ہی ہے۔ خدا کی قسم اللہ تو ہی ہے، تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ اللہ! اللہ! اللہ! قسم ہے تیری۔ تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ تو میرا قرض ادا کر دے۔ قرض ادا کرنے کے بعد مجھے روزی دے۔''

نوٹ: آخر میں درود پاک پڑھ لیا جائے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ تینوں دعائیں حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہیں۔

تھیلی پر درج تحریر سے مجھے ایک اور قصہ یاد آ گیا۔

اکبر اعظم کی پیدائش بہت نامساعد حالات میں عمر کوٹ کے علاقہ میں ہوئی۔ یہ علاقہ اب پاکستان کے صوبہ سندھ کا حصہ ہے۔ ہمایوں کے پاس دایہ کو دینے کے لیے ایک آخری انگوٹھی کے سوا کچھ نہ تھا جو اس نے یہ کہہ کر دایہ کو دے دی کہ اگر زندگی نے کبھی دوبارہ موقع دیا اور حالات بہتر ہوئے تو تمھیں مالا مال کر دوں گا۔

بعد ازاں ہمایوں ایران کی طرف نکل گیا اور تیاری کے بعد اس نے تختِ ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

ان تمام حالات و واقعات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر اعظم کی تعلیم پر توجہ نہ دی جا سکی۔ تخت نشین ہونے کے بعد ہمایوں نے اپنے ایک جاں نثار جنرل بیرم خان جو دُنیاوی تعلیم سے تو بے بہرہ تھا مگر فنونِ سپہ گری میں انتہائی مہارت رکھتا تھا کو اکبر اعظم کا اتالیق مقرر کر دیا۔ ہمایوں کی وفات کے بعد بہت کم عمری میں اکبر اعظم نے تاج و تخت سنبھال لیا۔ تب بیرم خان اُس کے بڑے ہونے تک تمام حکومتی اُمور سنبھالتا اور دیانت داری سے

جلاتا رہا۔ یہ سب دیکھ کر حسد کے باعث درباری سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ اُنھوں نے اکبرِاعظم کو اُکسایا کہ اصل بادشاہ تو بیرم خان ہی ہے۔ اکبرِاعظم اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے درباریوں کی باتوں میں آ گیا اور طریقے سے بیرم خان کو حج کے لیے روانہ کر دیا۔ جب وہ کاٹھیاواڑ کے مقام پر پہنچا تو اُس پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دیا گیا۔ قتل کروانے کے بعد اکبرِاعظم کو احساسِ ندامت و جرم نے گھیر لیا جس کو ختم کرنے کے لیے اُس نے بیرم خان کے صاحبزادے عبدالرحیم کو اپنا بیٹا بنا لیا اور ایک شہزادے کی مانند شاہی محل میں اُس کی بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے باپ بیرم خان سے بھی بڑھ کر Genius، فنونِ سپہ گری میں ماہر اور ادبی ذوق و شوق کا مالک نکلا۔ تاریخ اُسے خانِ خاناں کے نام سے جانتی ہے۔

ایک رات خانِ خاناں نے جنگل میں پڑاؤ ڈالا۔ رات کے سناٹے میں ایک پُرسوز آواز گونجی۔ کوئی شخص فارسی رُباعی پڑھ رہا تھا۔ جس کا ایک بند یوں تھا:

منم کہ ہر جا ر سید خیمہ زد او بارگاہ ساخت

یعنی بادشاہ جہاں بھی جاتا ہے وہاں خیمے گاڑھ دیئے جاتے ہیں اور دربار لگ جاتا ہے۔

رُباعی کے اگلے بند کا مفہوم تھا کہ اس جنگل میں سجے دربار میں بھی اگر کوئی بادشاہ کے پاس حاضر ہو تو وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جاتا۔

رُباعی اس قدر پُرتاثیر تھی کہ خانِ خاناں نے سپاہیوں سے کہا کہ رُباعی پڑھنے والے شخص کو ڈھونڈ کر حاضر کرو۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ حاضر ہوا اور یوں گویا ہوا کہ مجھے اطلاع ملی تھی کہ آج ایک بادشاہ یہاں خیمہ زن ہوگا۔ میں نے روشنی دیکھی تو یہ اشعار میری زبان پر آ گئے۔ خانِ خاناں نے اُسے اشرفیوں کی ایک تھیلی دے کر رُخصت کر دیا۔ دوسری رات بھی اُس شخص کی آواز جنگل میں گونجی۔ تیسری رات بھی ایسا ہی ہوا۔ لیکن چوتھی رات خانِ خاناں شب بھر اُس صدا کا انتظار کرتا رہا اور وہ کہیں سنائی نہ دی۔ صبح سپاہی اُس شخص کی تلاش میں نکلے اور نامراد لوٹ آئے۔ تب خانِ خاناں نے ایک بہت خوب صورت بات کہی تھی جو آپ کے گوش گزار کرنے کے لیے یہ سارا واقعہ آپ کو سنایا ہے۔ وہ بات یہ تھی "وہ شخص تو بہت کم ظرف نکلا، تین تھیلیوں میں ہی ٹل گیا ورنہ میں نے تو اس جنگل میں سات پڑاؤ کرنا تھے اور اشرفیوں کی سات تھیلیاں اُس کے لیے سنبھال رکھی تھیں۔"

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی بتائی ہوئی دُعا پڑھنے والے شخص کے لیے بھی یہی پیغام ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تین تھیلیوں پر ہی مر مٹیں اور کم طلبی کی وجہ سے اپنے بہت سے حصے سے محروم ہو جائیں۔ دراصل ہم کم ظرف ہیں لیتے لیتے تھک جاتے ہیں لیکن رب تعالیٰ دیتے نہیں تھکتا۔

ہم اپنی کم ظرفی کی وجہ سے اُس سے دُنیا ہی مانگتے رہتے ہیں حالانکہ وہ تو اس سے کہیں بڑھ کر اپنے بندوں کو عطا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

میری دُعا ہے کہ رب تعالیٰ آپ کے دل کی خواہشات پوری کرے۔ (آمین)

سوال: میں نے سنا ہے کہ آپ ﷺ نماز میں تین یا سات بار دُعا پڑھا کرتے تھے۔

جواب: دُعا اور نماز میں پڑھی جانے والی چیزوں میں فرق ہے۔ نماز کی حدود و قیود تکبیر اُولیٰ سے سلام پھیرنے تک ہیں۔ سلام پھیرنے کے بعد ہم دُعا خواہ ایک بار مانگیں، تین بار یا سات بار۔ وہ دُعا نماز کا حصہ شمار نہیں ہوگی۔ جب ہم اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیتے ہیں تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم نماز کے فرائض اور سنتوں پر عمل کریں۔ مثلاً سورۂ فاتحہ کے بعد کم از کم تین آیات کے برابر سورۃ پڑھی جائے۔ اس کے بعد رکوع و سجود اور قعدہ بھی آپ ﷺ کی سنت کے مطابق کیا جائے۔ غرض کہ نماز میں مقرر کردہ ارکان کی پابندی ضروری ہے۔ ہم اپنی طرف سے کم یا زائد ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اگر ہم نماز کے لیے مخصوص حدود و قیود اور شرائط کی پابندی نہیں کریں گے تو نماز ادا تصور نہیں ہوگی اور ہمیں وہ نماز لوٹانا ہوگی۔

دُعا سلام پھیرنے کے بعد مانگی جاتی ہے اور آپ جتنی بار چاہیں دُعا کے الفاظ دہرا سکتے ہیں۔

سوال: کیا ستر ہزار عالموں میں بھی مذہب اسلام ہی ہے؟ کیا آپ ﷺ سے پہلے کے پیغمبروں کا پیغام تمام اقوام کے لیے تھا؟

جواب: کچھ عالم ایسے ہیں جہاں زندگی ہے اور وہاں اللہ کے بھیجے گئے مذاہب بھی ہیں اور وہاں کی مخلوق ان مذاہب پر عمل پیرا بھی ہے۔

یہاں ایک بات واضح کردوں کہ مختلف مذاہب (جن میں یہودیت اور عیسائیت بھی شامل ہے) اسی طرح تمام الہامی کتابیں اور صحائف اللہ کی طرف سے اُتارے گئے ہیں۔ یہ دراصل ایک پیغام تھا جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ پیغام زیادہ واضح شکل میں سامنے آتا چلا گیا۔ چونکہ رب تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ مخاطب کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے بات کی جائے لہٰذا خود رب نے بھی اس پر عمل کیا۔

ابتدا میں چونکہ انسان کی ذہنی سطح اتنی Refined نہ تھی اس لیے یہ پیغام بھی زیادہ سادہ اور Limited substance پر مبنی تھا۔ لیکن جیسے جیسے انسانی ذہنی ارتقا ہوتا چلا گیا تو یہ پیغام بھی زیادہ Sophisticated ہوتا گیا۔ اور زبور، توریت، انجیل اور آخر میں قرآن پاک کی صورت یہ پیغام تمام عالموں تک پہنچ گیا۔ تمام انبیاء اور الہامی کتب کی تعلیمات دراصل اسی پیغام کی Continuity لیے ہوئے تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن پاک میں اس پیغام کی تکمیل ہوگئی۔ یہاں ہمیں دو طرح فرق محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ توحید ہے۔ ہم تصدیق کرتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔ ہم ایمان لاتے ہیں آپ ﷺ اور آپ ﷺ سے پہلے کے تمام انبیاء پر۔ ہم قرآن پاک اور اس سے قبل نازل شدہ تمام الہامی کتب پر یقین رکھتے ہیں۔

ہم ایمان تو رکھتے ہیں ان تمام باتوں پر لیکن اکثر یہ اقرار ہمارے ذہن سے محو ہو جاتا ہے اور ہم اُن جانے میں ان کتابوں کو Negate کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح تمام انبیا اور آپ ﷺ میں یہ فرق ہے کہ وہ تمام انبیا ایک مخصوص علاقے اور اُمت کے لیے مبعوث ہوئے جب کہ آپ ﷺ تمام عالمین کے لیے نبی اور رسول بن کر تشریف لائے اور رحمت اللعالمین ﷺ کہلائے۔ آپ ﷺ پر نازل کردہ کتاب قرآن پاک قیامت تک کے لوگوں کے لیے پیغام ہے۔ لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اُٹھاتے ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں اور یہ رب کے اپنے الفاظ ہیں۔

آپ ﷺ سے قبل جتنے بھی پیغمبر آئے وہ Localise تھے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ جب قرآن پاک میں ذکر آیا تو اُن کی اُمت کو "یا بنی اسرائیل" کہہ کر مخاطب کیا گیا۔ لیکن آپ ﷺ کے تشریف لانے اور قرآن مجید کے نزول کے بعد یہ لازم ہو جاتا ہے کہ جہاں جہاں یہ پیغام پہنچے گا کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں وہاں کے لوگوں پر لازم ہو جائے گا کہ وہ آپ ﷺ کے خاتم النبیین اور رحمت اللعالمین ہونے پر ایمان لے آئیں۔ اور اس بات کی بھی تصدیق کریں کہ قرآن پاک آفاقی کتاب ہے۔ یہ اللہ کا آخری پیغام ہے جو اس نے اپنے نبی ﷺ کے ذریعے ہم تک پہنچایا۔

یہ درست ہے کہ اکثر اُمتیں اور مذاہب کے پیروکار اللہ ہی کے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اللہ نے جب اس سابقہ پیغام کو آپ ﷺ پر نازل کردہ پیغام کے ذریعے Supersede کر دیا تو وہ اہل کتاب اس Superseded پیغام سے سرکشی کرتے ہیں اور اس پر ایمان نہیں لاتے۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہودی یا عیسائی جس پیغام پر عمل کر رہے ہیں وہ پیغام یا اُن کا مذہب اللہ کا بھیجا ہوا نہیں ہے۔ اس طرح سمجھنے یا کہنے سے خود ہمارا اپنا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ البتہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ انھوں نے اللہ کے نازل کردہ پیغام زبور، توریت اور انجیل میں تحریف کر دی ہے۔ بہر حال ہم اللہ کے نازل کردہ پیغام کا احترام کرتے ہیں۔

لندن کے جس علاقہ میں میرا گھر ہے وہاں میں اکلوتا مسلم ہوں۔ کرسمس کے موقع پر میں اپنے عیسائی پڑوسیوں کو چاکلیٹ بھجوایا کرتا ہوں۔ شروع کے 2,4 سال تو وہ خاموش رہے لیکن پھر ایک بار میرے پاس ایک انگریز آیا اور کہنے لگا "آپ تو مسلمان ہیں پھر کرسمس کیوں مناتے ہیں؟" میں نے جواب دیا "بھائی میں مسلمان ضرور ہوں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خوشی تم سے زیادہ مناتا ہوں کیوں کہ میرا یقین ہے کہ وہ اللہ کے سچے نبی تھے اور اللہ نے اُن پر کتاب بھی نازل فرمائی۔" میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا اور کچھ بے یقینی کی کیفیت میں گھر گیا۔ تب میں نے مزید وضاحت کی "بھائی اور اصل بات یہ ہے کہ میرا ایمان اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر تمام انبیا پر ایمان نہ لے آؤں اور زبور، توریت، انجیل کو اللہ کی نازل کی گئی کتابیں نہ مان لوں۔"

میری یہ بات سن کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بیٹھا رہا اور پھر مطمئن ہو کر رخصت ہو گیا۔

کرسمس منانے والی میری بات پر شاید آپ کو بھی دھچکا لگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُس روز اللہ کا شکر ادا کیا جائے کہ یا اللہ! تو کتنا مہربان ہے۔ کس قدر رحیم و کریم ہے کہ ہم جیسے نالائق اور بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کے لیے تو فکرمند رہتا ہے اور تو نے ہمیں ہدایت دینے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے نبی اور رسول بھیجے۔

جب ہم کسی عیسائی سے بات کرتے ہیں اور یہ تاثر اُسے دیتے ہیں کہ دُور ہو کر مجھ سے بات کرو تم نجس اور پلید ہو۔ ہمارے اس تاثر اور رویہ سے کوئی ہمارے قریب نہیں آئے گا۔ رب تعالیٰ نے تو انھیں اہلِ کتاب کہا ہے اور یہاں تک فرمایا کہ اُن میں سے کچھ صاحبِ علم بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے تو کفار اور مشرکین تک کو خود سے دُور نہیں کیا۔ اولیائے کرام کی زندگیوں کا جائزہ لیں۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، بابا فرید صاحب، خواجہ غریب نواز صاحب سب نے غیر مسلموں کو خود سے قریب کرنے کے لیے اپنی ظاہری حالت سادھوؤں کی سی بنائی کیوں کہ ہندو اس سے مانوس تھے۔ یہ شباہت دیکھ کر وہ اپنے دُنیاوی مسائل لے کر اُن کے قریب آتے گئے۔ اُن اولیائے کرام کی دُعا سے جب وہ مسائل حل ہونے لگے تو ہندو اُن کی طرف کھنچے چلے گئے اور اُن کے خوب صورت ذاتی کردار سے متاثر ہو کر دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنے لگے۔

اولیائے کرام نے تو بت پرستوں کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا اور ہم اہلِ کتاب کو بھی خود سے دُور بھگاتے ہیں۔ اس انداز سے دین کی خدمت نہیں ہو سکتی۔ غیر مسلموں کو خود سے قریب لائیے جس طرح چودہ سو سال پہلے انھیں نزدیک لایا گیا تھا۔ غالباً حضرت عمرو بن العاص کا واقعہ ہے کہ اُن کے پاس بہت کم فوج رہ گئی تھی۔ شہر فتح کرنے کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ جو تلوار نہ اُٹھائے اُسے امان ہے۔ کوئی فوجی کسی گھر پر حملہ نہیں کرے گا۔ کسی خاتون کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی۔ کسی شہری کو اگر کوئی شکایت ہو تو وہ براہِ راست سپہ سالار یعنی عمرو بن العاص سے رابطہ کرے۔

ایک روز دو عیسائی خواتین نے آ کر شکایت کی کہ آپ کے دو سپاہی رات ہمارے گھر میں گھس آئے اور ہماری بے حرمتی کی۔ ہمیں انصاف فراہم کیا جائے۔ تحقیق کی تو الزام ثابت ہو گیا۔ اب اس کے باوجود کہ فوجی پہلے ہی بہت کم تعداد میں تھے اور اپنے مرکز سے کئی ہزار میل دُور موجود تھے۔ آپ نے اُن مسلمان سپاہیوں کی گردنیں اُڑا دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس انصاف سے متاثر ہو کر عیسائی جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔

جب ہم کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس کے نتائج بہت مثبت نکلتے ہیں۔ لیکن جب ہم دوسروں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو جواب میں ہمیں نفرت ہی ملتی ہے اور کوئی ہمارے قریب نہیں پھٹکتا۔ جب کوئی قریب نہیں آئے گا تو مسلمان بھی نہیں ہو گا۔ لہٰذا اگر ہمیں بھی اللہ کا پیغام لوگوں تک پھیلانا ہے تو ہمیں غیر مسلموں کے ساتھ عمدہ سلوک کرنا ہو گا اور انھیں خود سے قریب کرنا ہو گا۔

علمِ لدُنّی

سوال: خواتین کے قبرستان میں نہ جانے کی Logical reason کیا ہے؟

جواب: قبرستان میں نہ تو مناسب روشنی کا انتظام ہوتا ہے نہ سکیورٹی کا انتظام۔ پھر ابتدا ہی سے یہ جرائم پیشہ افراد کا ٹھکانا رہے ہیں۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ خواتین قدرتی نظام کے تحت کبھی پاکیزہ حالت میں ہوتی ہیں اور کبھی نہیں ہوتیں۔ علاوہ ازیں خواتین شروع ہی سے ضعیف الاعتقاد رہی ہیں۔ جس سے کچھ لوگ فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔ اس لیے خواتین کا قبرستان جانا منع کیا گیا ہے۔

سوال: مردوں کو پینٹ یا شلوار کے پائینچے ٹخنوں سے اُوپر رکھنے کو کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: دو تین وجوہات ہیں۔ پُرانے زمانے میں چونکہ پیدل سفر کرنا ہوتا تھا تو اکثر Flat shoes پہنے جاتے تھے۔ ہیل (Heal) والے جوتوں کی نسبت یہ آرام دہ تو ہوتے ہیں لیکن ان کے ساتھ Bottom ہم نے کوئی سا بھی پہن رکھا ہو تو پائنچے زمین پر لگتے ہیں اور زمین پر موجود کثافتیں انھیں لگنے کا خدشہ ہوتا ہے۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ رومن اُمرا ایسے کلوکز (Cloaks) زیب تن کیا کرتے تھے جو زمین پر گھسٹتے رہتے تھے اور تکبر کا نشان سمجھے جاتے تھے۔ اس سے بچاؤ کے لیے Bottoms کو ٹخنوں سے اُونچا رکھنے کا حکم ہوا ہے۔ پاکیزگی اپنانا بھی ایک مقصد تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ویرانوں میں سفر کے دوران زمین پر موجود کیڑے مکوڑوں کا کپڑوں کے ساتھ چمٹ جانے کا خدشہ تھا۔ لہٰذا یہ حکم دیا گیا۔

ایک اور حکم بھی ہے جسے ہم اکثر Ignore کر دیتے ہیں کہ جوتا دوبارہ پہنتے ہوئے اُس کو پہلے اچھی طرح سے جھاڑ لیں۔ اس کے پیچھے وجہ یہ تھی کہ زمین پر موجود بچھو کے جوتے میں گھس جانے کا خدشہ رہتا تھا جو باعث ضرر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے جوتا جھاڑ کر پہننے کا حکم دیا گیا۔

سوال: ولایت کے مقام پر کیسے پہنچا جائے اور اس سلسلے میں پہلا قدم کیا ہو؟

جواب: علم لدنی یا ولایت کے سلسلے میں اکثر سوال آتا ہے کہ اس مقام تک کیسے پہنچا جائے۔ کوشش تو ہمیشہ یہی رہی کہ اس راہ کو آسان کر کے بیان کر دیا جائے تاکہ لوگوں کے لیے اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ یہ انسانی

فطرت ہے کہ اصطلاحی زبان میں بات کرنے سے انسان معاملات اور چیزوں کی حقیقت کو جلد سمجھ لیتا ہے۔

ایک دور تھا جب Management کا مضمون اتنا عام نہ تھا۔ تب ہمیں جو Marketing پڑھائی جارہی تھی اُس میں انسانی نفسیات کا ہلکا سا سبق ہوتا۔ Sales اور Marketing میں سے جب Sales کا ذکر ہوتا تو بتایا جاتا کہ اس میں Human psychology کا بڑا عمل دخل ہے۔ آپ جب لوگوں سے Sales promotion کے لیے ملتے ہیں تو اُن میں سے کبھی کبھار ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے جو خود کو Mr. know all سمجھتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اُنھیں دُنیا کی ہر شے کا علم ہے۔ اُنھیں کسی بھی بات پر Convince کرنا واقعی خاصا دشوار ہوا کرتا تھا۔ ہماری Sales Book بتاتی تھی کہ جب کسی ایسے شخص سے واسطہ پڑ جائے تو اُس کے سامنے خود سے گھڑ کر ایسے الفاظ بول دیں جو صوتی لحاظ سے بھی مشکل ہوں اور کسی ڈکشنری میں موجود نہ ہوں۔ اور بظاہر وہ لاطینی الفاظ معلوم ہوں۔ اب وہ شخص (Mr. know all) نہ سمجھنے کے باوجود اپنی کم علمی کا اظہار نہیں کرے گا اور اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے آپ سے فوراً Agree کر جائے گا۔

پھر جب بھی کسی Mr. know all سے ہمارا واسطہ پڑا تو ہم نے اس تکنیک کو آزمایا اور بہت فائدہ مند پایا۔ دو تین بار تو ایسا ہوا کہ ہم نے Terminology کے چند مشکل ترین الفاظ بول دیئے اور وہ فوراً بولے ''آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔''

اسی طرح تصوف کی بات جب بھی ہوئی تو میں نے اسے روزمرہ زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی لیکن بات شاید Convincing معلوم نہ ہوتی تھی اور اکثر لوگوں کی طرف سے سوال آتا ہے کہ آسان راستہ بتا دیجیے۔ تو صاحب! میرے نزدیک اس کا آسان راستہ ہے پہچان اور شناخت۔

ہر اسم اسمِ الٰہی کا مظہر ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات جو بہت کم دیکھنے میں آتی ہے لیکن اولیائے کرام بہت شدت سے جس پر عمل کرتے ہیں۔ وہ حکم یہ ہے کہ Alphabets (حروف تہجی) خواہ کسی بھی زبان کے ہوں اُن پر پاؤں نہ رکھیں۔ اُن کا احترام کریں۔ اب یہ بات عجیب سی لگے گی کہ اُردو تو قرآن پاک اور آپ ﷺ کی زبان نہیں ہے تو پھر اس کا احترام کیوں؟ اسی طرح انگریزی زبان کا ادب کیوں کیا جائے؟

دراصل ہر زبان مختلف Alphabets (حروف تہجی) کا مجموعہ ہے۔ کسی زبان کے 22، کسی کے 26 اور کسی کے 28 حروف تہجی ہیں۔ غرض ہر زبان کے Alphabets کی تعداد مختلف ہے۔ جب ہم Alphabets کو ترتیب کے ساتھ Organise کرتے ہیں تو الفاظ بنتے ہیں۔ الفاظ حروف کا اور تحریر الفاظ کا مجموعہ ہے۔

عربی چونکہ آپ ﷺ کی زبان ہے۔ جس علاقہ میں آپ ﷺ تشریف لائے اور جہاں ابتداً قرآن پاک نازل ہوا وہاں کے باسیوں کی زبان عربی ہے۔ (بلاشبہ آپ ﷺ تمام عالمین کے لیے نبی ہیں اور قرآن پاک تمام عالمین کے لیے کتاب رشد و ہدایت ہے۔)

جب ہم حروف مقطعات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ بھی Alphabets ہی کا حصہ ہیں۔ حروف مقطعات کی تعداد 14 ہے۔ یہ حروف مقطعات درحقیقت اسم کہلاتے ہیں۔ اس لیے سورۂ بقرہ میں جب علم الاسماء کا ذکر ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ اسی مقام پر یہ ذکر بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو علم الاسماء سکھایا۔ علم الاسماء سے مراد حروف مقطعات کا ہی علم ہے۔

جیسا کہ پہلے گزارش کی تھی کہ "کُن" اس کائنات کا Controlling word ہے۔ اسی طرح جتنی بھی رُوحیں ہیں ان کا کوئی نہ کوئی Controlling word ہے۔ کائنات کی ہر چیز کا اپنا کوئی نہ کوئی Controlling word ہے۔ اسی نسبت سے کہ ہر اسم چونکہ اسم الٰہی کا مظہر ہے ہم حروف تہجی کی تعظیم کرتے ہیں اور انھیں پاؤں کے نیچے نہیں آنے دیتے۔ لہٰذا جہاں بھی زمین پر ہمیں کوئی تحریر نظر آئے۔ حروف کا کوئی مجموعہ نظر آئے۔ ہم اُسے اُٹھا لیں کیوں کہ ہر اسم اسم الٰہی کا مظہر ہے اور تمام چیزوں کا منبع و مرکز رب خود آپ ہے۔ جب رب نے حضرت آدم علیہ السلام کو علم الاسماء سکھایا تو مرکز رب خود رہا ہے اور مرکوز حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ مرکوز عموماً نقطۂ ارتکاز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مرکوز سے مراد یہ بھی لیا جاتا ہے کہ ایسی چیز یا وجود جس کے اندر چیزیں ارتکاز کر گئی ہوں۔ جب فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں تو ابلیس نے انکار جب کہ فرشتوں نے حجت کی "یا باری تعالیٰ! یہ انسان تو زمین پر فساد برپا کردے گا۔" اور جب رب نے اُن سے فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے، تو اُنھوں نے اس حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کر دیا۔ گویا فرشتے اُس تجلی اور علم کے سامنے جھک گئے جو حضرت آدم علیہ السلام کے اندر مرکوز ہو چکا تھا۔ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ رب سے دُور ہو گیا اور تاقیامت لعین و مردود ٹھہرا۔

جب ہم اپنی شناخت کر رہے ہوتے ہیں تو درحقیقت رب تعالیٰ کی شناخت کر رہے ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کی تخلیق کیوں کر ہوئی؟ اس کائنات میں جب کچھ نہ تھا تو صرف رب تعالیٰ اور اُس کے فرشتے تھے۔ تب رب نے چاہا کہ وہ ایک ایسی مخلوق پیدا کرے جو اُس کی ذات کا مظہر ہو اور جس سے وہ پہچانا جائے۔ یوں رب تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا فیصلہ کیا اور رُوحیں بنائیں اور انسان میں اپنی صفات کی ہلکی پھلکی جھلک رکھ دی۔ ماسوائے ربوبیت اور رحمانیت کے اللہ کی تمام صفات کا ہلکا سا عکس (Flavour) اور پرتو انسان میں ضرور پایا جاتا ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو پہچانتا ہے تو رب کو پہچاننے لگتا ہے۔

انسان کی تخلیق چار عناصر سے ہوئی...... مٹی، ہوا، پانی، آگ۔ آسٹرولوجی میں بھی انھی چار عناصر کو گنا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ عرشِ معلّٰی پر موجود ہے جہاں ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے جو بحرِ مروارید کہلاتا ہے۔ یہ درحقیقت نور کا سمندر ہے جس میں سے چار نہریں نکلتی ہیں، جن کی مختلف شاخیں ہیں اور ان شاخوں سے ہی تمام علوم نکلے ہیں جن کی تعداد 81,000 ہے۔ جب انسان اپنے علوم کے عروج پر پہنچا تھا تو اُس وقت وہ

81,000 میں سے 56,000 علوم دریافت کر چکا تھا۔ یہ قدیم مصری تہذیب کا ذکر ہے جس کے دس پندرہ سال قبل معلوم ہونے والے آثار سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ قوم ہم سے بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ شکل میں موجود رہی ہے۔ لیکن علم کی زیادتی کے باعث وہ قوم بھٹک گئی اور تباہ کر دی گئی۔

آج جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بہت ترقی یافتہ ہیں۔ اس کے باوجود ہم ابھی تک محض 31,000 علوم دریافت کر پائے ہیں اور 50,000 علوم ابھی تک Unexplored ہیں۔ آسٹرولوجی، Numerology اور اسی قسم کے دیگر بہت سے علوم اُن علوم کا حصہ ہیں اور یہ سب سائنس کی مختلف Branches ہیں۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان علوم میں چونکہ انسانی ذہن Apply ہوتا ہے اور نتائج انسان اپنے ذہن کے ذریعے اخذ کرتا ہے اس لیے غلطی کا امکان موجود رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم پر بنایا لیکن پھر بھی انسان میں خامیاں موجود ہیں۔ اس کی عقل بھی ناقص ہے اور علم بھی کم ہے۔ اپنے اس Design کی وجہ سے جب وہ اپنا Mind (دماغ) Apply کرتا ہے تو حاصل کردہ معلومات میں غلطی کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ جو نتائج وہ اپنے اندازوں کی بنیاد پر اخذ کرتا ہے وہ اکثر غلط ہوتے ہیں۔ یہ نتائج جان کر انسان یا تو خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اُس کا جدوجہد کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے یا پھر ان نتائج کو سن کر وہ اس قدر مایوس ہو جائے گا کہ کوشش اور محنت کا باب ہی بند کر بیٹھے گا۔ اسی مصلحت کے تحت ان علوم کے قریب جانے سے منع کر دیا گیا۔ آپ ان علوم کو ضرور سیکھیے لیکن مستقبل بینی کے لیے نہیں بلکہ محض علم کی حد تک۔ جس طرح ہم کیمسٹری، الجبرا، جغرافیہ، تاریخ، سائنس اور دیگر علوم سیکھتے ہیں اسی طرح ان علوم کو سیکھیں لیکن ان پر عمل نہ کیجیے۔ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ وہ علم بے کار ہے جو باعث نفع نہ ہو۔ عالم بے عمل کی نسبت اللہ کو وہ جاہل زیادہ پسند ہے جو باعمل ہو۔ لیکن ان تمام اقوال کے باوجود بہتر یہی ہے کہ ان علوم کو مستقبل کی پیش گوئیوں کے لیے نہ سیکھا جائے۔

ان علوم کا مقصد کچھ اور بھی ہوسکتا ہے جیسے ستاروں کا علم اندھیری رات میں راستہ ڈھونڈنے کے کام آتا ہے۔ آپ سمندر میں ہیں۔ Compass خراب ہو گئے ہیں۔ GPRs کام نہیں کر رہے تو ایسے میں ستاروں کی مدد سے راستہ تلاش کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ دن میں سورج کی Direction سے راستہ ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔ سورج اور ستارے کی Navigation ایک ہی ہے۔

بات ہو رہی تھی انسانی جسم کے چار عناصر کی۔ یہ ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ہوا پر مٹی کو فوقیت ہے۔ مٹی پر آگ کو فوقیت ہے اور ان تینوں ہوا، مٹی اور آگ پر پانی کو برتری حاصل ہے۔ انہی چاروں بنیادی عناصر پر انسانی تخلیق ہوئی۔

ہر انسان کی عادات و مزاج دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ ہر انسان کے ساتھ فرشتے ڈیوٹی پر ہیں۔ نیکی اور بدی کا ریکارڈ رکھنے والے فرشتے جو کراماً کاتبین کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے دیگر فرشتے ہر انسان کے ساتھ موجود ہوتے ہیں جنھیں موکل کہا جاتا ہے۔ یہ تمام موکلات

مختلف مزاج اور طبیعت کے مالک ہوتے ہیں جن کا اثر متعلقہ انسان پر بھی پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے لوگ ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتے ہیں اور ان کی عادتوں میں تضاد نظر آتا ہے۔

انسان چونکہ چار عناصر کا مجموعہ ہے اور وہ وقت جس میں وہ زندگی گزارتا ہے، وہ ایک جگہ ٹھہرا ہوا نہیں ہے بلکہ مسلسل گھوم رہا ہے۔ اس گردش ایام کے باعث انسان پر کبھی ہوا کا عنصر غالب رہتا ہے تو کبھی مٹی یا پانی کا۔ یہ گردش دوراں بھی انسانی موڈ اور مزاج میں تبدیلی کی ایک وجہ ہے۔ جب انسان پر ایسا وقت ہوگا کہ پانی کا عنصر اُس پر غالب ہو تو اُس پر نرمی اور شائستگی غالب ہوگی۔ اگر ہوا کا عنصر اُس پر غالب ہوگا تو اُس کے مزاج میں تیزی آجائے گی۔ وہ ہوا میں بلاوجہ تلواریں چلاتا پھرے گا اور ہر پاس سے گزرنے والے سے بلاوجہ بھڑتا رہے گا۔ مٹی کا عنصر غالب ہونے سے انسان کے مزاج میں عاجزی اور انکسار آجاتا ہے۔ اگر آگ کا عنصر غالب ہو تو مزاج میں غصے کی تیزی اور شدت داخل ہوجائے گی۔ اور بعض اوقات یہ شدت شیطانی عمل میں تبدیل ہوجائے گی۔

چونکہ تخلیق انسان کی بات ہو رہی ہے تو یہ بھی عرض کروں کہ انسانی پتلے سے سات ہزار سال پہلے دل بنائے گئے تھے اور دلوں سے سات ہزار سے قبل رُوحیں تخلیق کی گئی تھیں۔ قرآن پاک میں جس تخلیق کا ذکر ہے وہ آخری مرحلے یعنی پتلے کی تخلیق ہے۔ رُوحوں سے سات ہزار سال بعد دل بنائے گئے۔ دل رُوحانیت میں بہت اہم ہے۔ دل سے بھی سات ہزار بعد پتلے وجود میں آئے تھے۔ ہوا، مٹی، آگ اور پانی سے انسانی مزاج پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، اُنھیں رُوح Control کرتی ہے تاکہ انسان بے لگام نہ ہونے پائے اور دوسرے انسانوں کے لیے تکلیف دہ نہ ہو۔ انسان کی رُوح جب تک طاقت ور نہ ہو وہ ان عناصر اربعہ پر قابو نہیں پا سکے گا۔ اسی لیے ذکر الٰہی کی بے پناہ اہمیت ہے کیوں کہ اس سے انسان کی رُوح میں لطافت پیدا ہوتی ہے اور رُوح میں جتنی زیادہ لطافت ہوگی اُتنی ہی زیادہ اُس کی پرواز بلند ہوگی اور جس قدر رُوح کی پرواز بلند ہوگی اُسی قدر وہ رُوح طاقت ور ہوگی۔

انسانی جسم کا جو پتلا زمین پر ہے اسی طرح کا ایک جسم آسمانوں پر بھی موجود ہے جسے ہم جسم مثالی یا رُوحانی جسم کہتے ہیں۔ جب ہم اپنی رُوح سے مطابقت رکھتا ہوا کوئی اسم پڑھتے ہیں یا ذکر الٰہی کرتے ہیں تو ہمارا رُوحانی یا مثالی جسم طاقت ور ہوتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔ لیکن جب ہم کوئی ایسا اسم یا ذکر پڑھتے ہیں جو ہماری رُوح یا جسم کے بنیادی عناصر سے مطابقت رکھتا ہو نہ مخالفت بلکہ معتدل ہو تو اس کو پڑھنے سے ہمارے جسم مثالی کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچتا۔ رُوح پر اس کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ لیکن ہمیں پڑھائی کا ثواب ضرور ملتا ہے۔ لیکن اگر ہم نے ایسے اسم پڑھنا شروع کر دیئے جو ہماری رُوح سے مطابقت نہیں رکھتے تو اس پڑھائی کے نتیجے میں ہماری رُوح یا جسم مثالی مجروح اور زخمی ہوتا چلا جائے گا اور ہماری رُوح کی پرواز کم ہوتی چلی جائے گی۔

اکثر لوگوں کو آپ نے یہ کہتے سنا ہوگا کہ وظیفہ Resist کر گیا۔ وجہ یہی ہوتی ہے کہ وظیفہ کے الفاظ

ہماری رُوح کے Controlling word سے مطابقت نہیں رکھتے بلکہ اس سے Opposite ہیں جس کی وجہ سے دو مخالف قوتوں کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ رُوح کی طرف سے Resistance آ رہی ہے اور وظیفہ اپنے Influences وہاں پر چھوڑ رہا ہے۔ اس ٹکراؤ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان میں Frustration پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں ''صاحب! وظیفہ پڑھنے کے باوجود بہت بے چینی ہے۔ میرے اندر سکون نہیں ہے۔'' اگلے مرحلہ پر یہ بے چینی بے نام خوف میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اکثر لوگ مخبوط الحواس ہو جاتے ہیں۔ بے چینی میں مبتلا یہ شخص اگر کسی سمجھدار انسان یا صاحب علم کے پاس جائے گا تو وہ پہلا کام یہ کرے گا کہ بجائے یہ کہنے کے کہ تم پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے اپنے کشف کے ذریعے جان لے گا کہ فلاں ورد، ذکر، تسبیح، وظیفہ یا عبادت جو اس کی رُوح سے مطابقت نہیں رکھتا اس کو پڑھنے سے اس میں یہ بے چینی پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ صاحب علم و کشف اُسے اس پڑھائی کو پڑھنے سے فوراً منع کر دے گا۔

بہت سے لوگ یہ شکایت کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں ''صاحب! ہمارے کام نہیں ہو رہے۔ ہم مشکل میں آ گئے ہیں۔ ہمارا بلاوجہ کسی سے جھگڑا ہو گیا۔'' یہ سب اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو بغیر کسی Guide (راہ نما) کے کتابوں اور رسالوں میں سے پڑھ کر وظائف کرنا شروع کر دیتے ہیں اور فائدہ اور سکون کی بجائے مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بہت سے صاحبان نے دبی زبان میں مجھے بتایا کہ ایک مستند ولی اللہ کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھا۔ لیکن فائدہ کی بجائے اُلٹا نقصان ہو گیا۔ قصہ یہ ہے کہ اگر کوئی ولی اللہ رُوحانیت کے بلند مقام پر ہے اور ایک وظیفہ اُس کی رُوح کی کیمسٹری کے مطابق ہے تو ضروری نہیں وہ سب کے لیے یکساں طور پر مفید ہو۔ مثلاً حضرت یونس علیہ السلام ایک پیغمبر تھے۔ اُن سے ایک لغزش ہو گئی جس کے نتیجے میں کشتی سے دریا میں جا گرے اور مچھلی نے اُنھیں نگل لیا۔ مچھلی کے پیٹ میں چالیس روز تک وہ آیت کریمہ کا ورد کرتے رہے اور بالآخر عاشورہ کے روز مچھلی نے اُنھیں دریا کے کنارے اُگل دیا۔ اب ایک پیغمبر نے آیت کریمہ کو چند دن پڑھا اور رب تعالیٰ نے اپنی رحمت کے صدقے اُنھیں معاف کر دیا۔ تب مچھلی نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُنھیں زمین پر اُگل دیا۔ لیکن مجھ جیسے گناہ گار انسان کی کیا جرأت ہے کہ وہ اس وظیفہ کو پڑھے اور اسی سرعت کے ساتھ وظیفہ کے اثرات مجھے حاصل ہو جائیں۔ پھر مجھے کیا معلوم کہ آیت کریمہ مجھے Suit بھی کرتی ہے یا نہیں۔

میں بائیس سال کی عمر میں صبح و شام چالیس بیالیس وظائف کرتا تھا۔ مرشد صاحب سے ملاقات ہوئی تو پہلا حکم اُنھوں نے یہ جاری کیا کہ تم جو کچھ پڑھتے ہو اس کو چھوڑ دو۔ اب مجھے مختلف کتابوں سے لیے گئے وہ اعلیٰ درجے کے وظائف پڑھنا اتنا عزیز تھا کہ اُنھیں ترک کرتے ہوئے تکلیف تو ہوئی لیکن مرشد صاحب کے حکم کی تعمیل بہر حال ضروری تھی۔ تب اُنھوں نے مجھے ایک حرف پڑھنے کو دیا۔ وہ تھا تو ایک ہی حرف لیکن اس کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ پہلے روز لنچ بریک (Lunch Break) کے دوران میں آفس سے اُٹھ کر گھر آ گیا اور ظہر کی نماز کے بعد وہ حرف پڑھنا شروع کیا تو مغرب کی اذان کے وقت ختم ہوا۔ بعد ازاں پریکٹس ہو جانے کے باعث ایک حرف پر مشتمل یہ وظیفہ ایک گھنٹہ دس منٹ میں مکمل ہونے لگا اور اس سے وہ اثرات

حاصل ہوئے جو چالیس بیالیس وظائف صبح وشام کرنے اور تہجد کے وقت اُٹھنے کے باوجود کہیں نظر نہ آئے تھے۔ کہیں کوئی Milestone دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن مرشد صاحب کا بتایا ہوا ایک حرف پڑھنے سے ڈھائی سال کے اندر کشف وکرامات حاصل ہو گئیں۔ پھر سیر کا سلسلہ جاری ہو گیا اور یوں میں تیزی سے آگے بڑھا۔

یہ اُنہی دنوں کا ذکر ہے کہ مرشد صاحب سے گفتگو کے دوران اس آیت کریمہ کا ذکر بھی آیا تو اُنھوں نے مجھے اس کو پڑھنے سے یہ کہہ کر منع فرمادیا "یہ آیت کریمہ تمھیں Suit نہیں کرتی، اسے کبھی نہ پڑھنا۔ یہ تمھیں اُلٹ دے گی۔"

یوں اکثر ہمیں خود نہیں پتا چلتا کہ کون سا وظیفہ ہمیں Suit کرتا ہے اور کون سا نہیں۔ البتہ کوئی صاحب علم یہ جان لیتا ہے۔ پیغمبروں کا اپنا ایک رُوحانی مقام ہے۔ اُن کے مقام تک کون پہنچ پائے گا۔ اُن کی رُوحانی طاقت وبالیدگی اُس درجہ کی ہے جس تک کوئی ولی اللہ پہنچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ذرا سوچیے کہ اُن کے پڑھے ہوئے وظیفہ کے اثرات ہم پر کس طرح مرتب ہوں گے۔ اسے پڑھنے کے بعد حالات بگڑتے دیکھ کر ہم منہ سے کچھ نہ بھی کہیں تو دِل میں سوچتے رہیں گے کہ عجب کمال کا وظیفہ ہے فائدہ کی بجائے اُلٹا نقصان ہو گیا۔

راہِ فقر

سوال: وضو کے لیے Incentive یا Motivation بتا دیجیے تا کہ وضو میں سستی نماز میں کوتاہی کا باعث نہ بنے۔

جواب: جو آدمی پانچ وقت کی نماز کے لیے وضو کرتا ہے اُس کے چہرے پر عجیب سا نور دکھائی دیتا ہے۔ وضو کے تمام فوائد Intangible ہیں۔

وضو سے ایک قصہ یاد آیا۔ جناب حضرت خواجہ غریب نواز صاحب کے خلیفہ اوّل قطب الدین بختیار کا کی رحمۃ اللہ علیہ صاحب تھے جنھیں اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں خلافت عطا فرمادی تھی۔ بعد ازاں طریقہ اویسیہ سے اُنھوں نے گولڑہ شریف میں مدفون پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی خلافت عطا کی۔ یوں وہ خواجہ غریب نواز صاحب کے خلیفہ دوم قرار پائے۔ پیر مہر علی شاہ کے ایک نوجوان مرید اپنے ایک دوست کے ہمراہ اُن کے پاس تشریف لائے اور عرض کیا ''یہ ہمارے دوست نماز نہیں پڑھتے کوئی نصیحت فرما دیجیے تا کہ یہ نمازی ہو جائیں۔'' پیر مہر علی شاہ نے مسکراتے ہوئے اُن نوجوان سے نماز نہ پڑھنے کی وجہ دریافت کی تو وہ بولے ''جناب! نماز پڑھنے میں تو مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں لیکن میں وضو نہیں کر پاتا۔ جس وجہ سے نماز رہ جاتی ہے۔'' یہ بات سن کر پیر مہر علی شاہ صاحب نے شرعی قواعد کے بالکل برعکس ایک بڑی عجیب بات کہی ''بیٹا تم بغیر وضو کے ہی نماز پڑھ لیا کرو۔'' چار چھ مہینے بعد وہ نوجوان دوبارہ حاضر خدمت ہوئے تو پیر مہر علی شاہ صاحب نے Routine pleasantries کے بعد پوچھا۔ ''کیوں بیٹا بغیر وضو کے نماز چل رہی ہے۔'' وہ بولا ''نہیں جناب! الحمد للہ اب تو میں وضو کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں۔'' پیر مہر علی شاہ صاحب نے فرمایا ''وضو کیوں کرنے لگ گئے۔'' نوجوان نے جواب دیا ''چند دن تو میں بغیر وضو کے نماز پڑھتا رہا۔ پھر ایک روز دل میں خیال آیا کہ جب میں اتنی لمبی نماز پڑھ لیتا ہوں تو ایک ڈیڑھ منٹ کا وضو کرنے میں کیا قباحت ہے۔ یوں میں وضو کر کے نماز پڑھنے لگا۔''

سوال کرنے والی خاتون سے یہ کہنے کی تو میں جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ بغیر وضو کے ہی نماز ادا کر لیا کریں کیوں کہ ایسا کہنے والے پیر مہر علی شاہ صاحب تھے۔ کہاں وہ...... کہاں میں۔ ہاں البتہ میں یہ ضرور عرض کرتا ہوں کہ آپ نماز سے پہلے وضو کر کے دیکھیے کہ آپ کے چہرے پر کتنا نور آتا ہے۔

سوال: عورتوں کے لیے فقیری کیا ہے؟ کیوں کہ مردوں کے لیے رُوحانی تربیت کا آغاز صفائی اور Serve کرنے سے ہوتا ہے۔ عورتوں کے لیے تو یہ روزمرہ کا معمول ہے۔ مزید عورتوں کو عملی طور پر مالی مسائل سے بھی نہیں گزرنا پڑتا کیوں کہ وہ عموماً Dependent ہوتی ہیں۔ فقر کی راہ میں عورتوں کی تربیت کیسے ہو سکتی ہے؟

جواب: یہ عجیب و غریب خیال نہ جانے کیسے راہ پا گیا کہ عورت رُوحانی مدارج طے نہیں کر سکتی۔ ایسی بات نہیں۔ خواتین بھی رُوحانی ترقی کرنے کی اُتنی ہی اہل ہیں جتنا کوئی مرد۔ خواتین کو کچھ ایسے Biological مسائل سے گزرنا پڑتا ہے جن سے مرد کو واسطہ نہیں پڑتا۔ چونکہ یہ قدرت کی طرف سے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں رعایت دی ہے اور وہ Biological وجوہات عورت کو کچھ عرصہ کے لیے عبادت سے دُور کر دیتی ہیں۔

خواتین کے لیے بھی پاکیزگی کا اہتمام اُتنا ہی ضروری ہے جتنا مرد کے لیے۔ لیکن گھریلو کام سرانجام دیتے ہوئے کپڑوں پر چھینٹے پڑنے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں شوہر کے آرام اور گھریلو ذمہ داریوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے جو اس رُوحانی راہ میں اُن کے لیے Distraction کا باعث بنتی ہیں۔ بہر حال خواتین کے لیے رُوحانی مدارج طے کرنے کے لیے قدرت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ ہمارے پاس سب سے واضح مثال (Glaring example) حضرت رابعہ بصری ؒ کی موجود ہے۔ اُن کو ایسا مقام عطا ہوا جس پر بہت سے مرد باوجود کوشش کے نہ پہنچ سکے۔ لہٰذا خواتین اگر اپنی ذمہ داریوں کو Manage کر لیں اور کوشش کریں تو رُوحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ سکتی ہیں۔

یاد رکھیے کہ رُوحانیت میں آگے جانے کے لیے مالی Crises سے گزرنا ضروری نہیں۔ عموماً رب اپنے ساتھ دوستی کا دعویٰ کرنے والے کو مختلف آزمائشوں سے گزارتا ہے جس میں جان و مال کی آزمائش ہو سکتی ہے تاکہ یہ پرکھا جائے کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں کس قدر Sincere (مخلص) ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ پہلے وہ مالی مشکلات سے گزرے تب ہی رُوحانی مدارج طے کر سکے گا۔

سوال: کیا انسانی فطرت Changeable ہے؟

جواب: یہاں دو چیزیں ہیں۔

1. کسی چیز کا Changeable ہونا
2. کسی چیز کا Mendable ہونا

انسانی فطرت کو Change کر دیا جائے یا اُسے ایک خاص سمت میں Tame کر دیا جائے۔ فطرت Change نہیں ہوتی لیکن مختلف مشقوں کے ذریعے اُسے Tame کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص فطرتاً کنجوس ہے لیکن فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں رہ کر جب وہ دن رات ایثار و قربانی اور سخاوت کی مثالیں

دیکھتا ہے اور مشاہدہ کرتا ہے کہ اہلِ فقر بخیلی سے دُور ہیں تو رفتہ رفتہ وہ کنجوس شخص سخاوت کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ یوں فطرت تو تبدیل نہیں ہوتی البتہ اُسے محنت کے ذریعے Tame کیا جا سکتا ہے۔

سوال: آپ کہتے ہیں کہ عبادت سے پارسائی حاصل ہوتی ہے لیکن رب تعالیٰ نیکی سے ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نیکی کے لیے تو نفس کو مارنا پڑتا ہے اور ہم جیسے تو نیکی کرنے کے بعد بار بار اُسے گن کر ہی ضائع کر دیتے ہیں۔ ایسی خالی نیکی سے رب کا حصول کیوں کر ممکن ہے؟

جواب: گناہ سے بچنا ضروری ہے۔ انسان کو گناہ سے دُور رہنا چاہیے۔ لیکن اگر کسی شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا اور اُسے اس پر پچھتاوے اور شرمندگی کا احساس ہوا کہ یہ مجھ سے کیا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے گناہوں کو دُور کر دیتا ہے۔ اِسی طرح اگر کسی شخص نے کسی کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور وہ اُسے گنتا رہا یا اُسے یہ احساس ہوتا رہا کہ میں کسی سے نیکی کر رہا ہوں تو وہ شخص آہستہ آہستہ تکبر میں چلا جائے گا۔ لیکن اگر نیکی کے احساس کے ساتھ ساتھ اُسے یہ خیال بھی رہا کہ میں یہ غلط کر رہا ہوں کہ یاد رکھ رہا ہوں کہ کس کس کے ساتھ میں نے نیکی کی۔ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ تکبر سے دُور کر دے گا۔ اللہ اُس پر یوں مہربانی فرمائے گا کہ اُسے اپنی نیکی یاد ہی نہیں رہے گی۔

میری Understanding میں کسی کے ساتھ نیکی کرنا اِتنا اہم نہیں جتنا کہ اس نیک سلوک کو کلیتہً بھلا دینا۔ کسی کے ساتھ اگر اچھا سلوک کیا اور اللہ نے اُس کے ذہن سے اس نیکی کو یکسر محو کر دیا تو یہ اللہ کا بہت بڑا کرم ہے اور خوش قسمتی کی بہت بڑی علامت ہے۔ تب انسان اِسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے کہ میں کوئی نیکی کر ڈالوں۔ مجھ سے کوئی نیکی نہیں ہو پا رہی۔ یوں وہ نیکی کے تعاقب میں رہتا ہے۔ وہ ایسے مواقع ڈھونڈتا ہے کہ ایک نیکی ہی کر ڈالوں۔ یہ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ وہ نیکی کرے اور رب تعالیٰ اُس کے ذہن سے اس کو بھلا دے۔ ایسا شخص نیکی کا ہر لمحہ تعاقب کرتا رہتا ہے اور وہ یاد رکھتا ہے کہ نیکی جتانے والے کی نیکیاں اُس کے منہ پر ماردی جاتی ہیں۔ اس لیے وہ نیکی کر کے بھول جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا ذکر تک کہیں نہیں کرتا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ نیکی کی توفیق سے زیادہ انسان کو اللہ کے حضور یوں گڑگڑانا چاہیے "یا اللہ! مجھے تو نیکی کی توفیق عطا فرما دے۔ لیکن اس سے زیادہ یہ توفیق عطا فرما کہ میری یادداشت سے یہ محو ہو جائے کہ میں نے کسی کے ساتھ نیک سلوک بھی کیا تھا۔"

میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے باوجود قسم کھا سکتے ہیں کہ زندگی بھر میں کسی کے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکا۔ چونکہ اللہ اُن کے ذہن سے یہ بات ہی فراموش کر چکا ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی بات میں سچے ہوتے ہیں۔ یہی لوگ دراصل نیکی کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر وقت روتے رہتے ہیں "یا اللہ! میرا کیا بنے گا۔ مجھ سے اتنے گناہ سرزد ہو گئے لیکن میں آج تک کوئی ثواب کا کام نہ کر سکا۔ یا اللہ! میں ہر وقت تیری نافرمانی ہی کرتا رہا۔ ہر وہ کام کیا جس سے تو نے منع فرمایا ہے۔"

پچھتاوے کا یہ احساس اُن لوگوں کو پاک کروا دیتا ہے۔

ایک بہت متقی بزرگ مسجد سے ملحقہ حجرہ میں قیام پذیر تھے۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا نماز قضا کرنا تو دور کی بات اُنھوں نے جماعت تک Miss نہ کی تھی۔ ایک روز فجر کی نماز کے لیے اُن کی آنکھ نہ کھل سکی۔ سورج طلوع ہونے کے بعد جب بیدار ہوئے تو انتہائی رنجیدہ اور دُکھی ہو گئے کہ آج یہ کیسا ظلم ہو گیا کہ میں وقت پر نماز ادا نہ کر سکا۔ قضا نماز ادا کی اور سارا دن روتے گڑگڑاتے رہے "یا اللہ! آج آنکھ نہ کھلنے کے باعث میری فجر کی نماز قضا ہو گئی۔" رات کو اُنھوں نے عشاء کی نماز اور دیگر معمولات کی ادائیگی کے بعد حجرہ کا دروازہ بند کیا اور سو گئے۔ فجر کی اذان سے بھی کچھ لمحہ پہلے کسی نے اُن کا کندھا ہلا کر بیدار کیا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ اُٹھو۔ نماز ادا کر لو۔ وہ بزرگ حیران ہوئے کہ کمرہ میں کوئی کیسے آ گیا۔ لہٰذا پوچھا "تم کون ہو اور حجرہ میں کیسے داخل ہوئے؟" وہ بولا "میں شیطان ہوں اور میرے لیے مقفل دروازے کوئی رُکاوٹ نہیں ہیں۔" بزرگ نے حیرت سے کہا "تمھارا کام تو دوسروں کو نیکی سے روکنا ہے جب کہ تم مجھے نیکی پر آمادہ کر رہے ہو۔ شیطان بولا۔ "کل فجر کی نماز قضا ہونے کی وجہ سے آپ سارا دن روتے اور گڑگڑاتے رہے۔ اللہ سے معافی مانگتے رہے۔ اللہ کو آپ کی یہ ادا اتنی بھائی کہ اُس نے ادا نماز سے بھی کئی گنا زیادہ ثواب آپ کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آج پھر آپ کے ساتھ ایسا ہو۔ اسی لیے آپ کو جگا رہا ہوں تا کہ آپ بروقت نماز ادا کر لیں اور اضافی ثواب سے محروم رہیں۔"

یہ نیک انسان کی خوبی ہے کہ وہ پچھتاوے میں مبتلا رہتا ہے کہ مجھ سے اس سے زیادہ نیکی ہو سکتی تھی لیکن میں نہیں کر پایا۔ اور پھر صرف یہ احساس بھی کہ میں نیکی کو گنتا رہتا ہوں، کافی ہے انسان کو نیکی کے اُس مقام پر لے جانے کے لیے جہاں وہ نیکی کو گننا بند کر دے گا۔

یہ احساس کہ مجھ سے غلطی ہو رہی ہے، غلطی سے بچانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر تو سوال کرنے والے شخص کے دل میں یہ احساس ہے کہ وہ نیکی گن کر غلطی کر رہا ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ گننا بند ہو جائے گا۔ اور ایسا شخص جس کے اندر گناہ کا پچھتاوا شدید ہو اور نیکی ضائع کرنے کا بھی ڈر ہو۔ وہ بالآخر نیک انسان ہو جاتا ہے اور نیک لوگوں کو ہی رب ملتا ہے۔

سوال: کان کیسے سنتے ہیں؟ اس کی سائنسی توجیہہ کیا ہے؟

جواب: اگر آپ کی مراد ہے کہ انسان سنتا کیسے ہے تو اس کی توجیہہ یہ ہے کہ جب ہم بولتے ہیں تو ہوا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ یہ ارتعاش لہروں کی شکل میں سفر کرتا ہے اور یہی لہریں ہمارے کان سے ٹکراتی ہیں ہمارے کان میں مختلف لمبائی کے بال ہیں جو ہوا میں معلق ہیں۔ ہوا کان کے ان بالوں کو ہلاتی ہے۔ اس سے جو Vibrations پیدا ہوتی ہیں وہ ہمارے کان کے پردے پر Transfer ہوتی ہیں بالکل اُسی طرح جیسے ٹیلی فون کے Earpiece کے اندر تار لگی ہوتی ہے۔ وہ Vibrations جو تار کے ذریعے وہاں تک پہنچتی ہیں اور Magnetic Field میں ارتعاش کا باعث بنتی ہیں وہی Vibrations مقناطیسی میدان کے ذریعے

سے Strong ہو کر اس Dial Tone کے اندر Vibes پیدا کرتی ہیں اور جب ہم اسے کان کے ساتھ لگاتے ہیں تو وہ Vibes ہمارے کان میں اس طرح بالوں کو ہلاتی ہیں کہ ہمیں آواز آنے لگتی ہے۔ ایسی ہی Vibes ہمارے کان کے پردے پر بھی پیدا ہوتی ہیں جو بالآخر آواز میں ڈھلتی ہیں اور یوں ہم دوسروں کے الفاظ سننے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

سوال: نزع کا عالم کیا ہے خصوصاً بچوں میں؟

جواب: عالم نزع سے مراد وہ Stage ہے جس میں انسان کی رُوح اس کے جسم کو خالی کر رہی ہوتی ہے۔ جسے ہم کہتے ہیں کہ ''رُوح قبض کر لی گئی۔''

رُوح کے جسم سے نکلنے کا جو تجربہ مجھے ہوا وہ یہ ہے کہ پاؤں کے انگوٹھے سے رُوح نکلنا شروع ہوتی ہے پھر پنڈلیوں سے ہوتا ہوا یہ Process سر پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہی Process عالم نزع کہلاتا ہے۔ ہر جان دار خواہ بچہ ہو یا بوڑھا حتیٰ کہ جانور بھی اسی Process سے گزرتے ہیں۔

سوال: اگر رُوح بیمار ہو تو کیا اس کا اثر جسم پر بھی پڑتا ہے اور کیا جسم کی بیماری رُوح پر بھی اثر انداز ہوتی ہے؟

جواب: اگر تو رُوح بیمار ہے تو اس کا اثر انسانی جسم پر بہت واضح ہوگا کہ جسم مرجھا جائے گا جسے ہم عرف عام میں یوں کہتے ہیں کہ فلاں انسان کے باطن کا اثر اس کے چہرے پر آیا ہوا ہے کہ یہ انسان نیکی نہیں کر پا رہا۔ لیکن اگر جسم بیمار ہے تو رُوح کی صحت پر تو کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا۔ رُوح اسی طرح توانا رہے گی البتہ جسم کی کمزوری انسان کی نیکی کرنے کی Capacity اور عبادات پر اثر انداز ضرور ہو گی۔ ایسا انسان جسمانی کمزوری کی وجہ سے نہ تو صحیح طور پر عبادت کر سکے گا نہ اس انداز میں لوگوں کے کام آ سکے گا جس طرح آنا چاہیے۔ بہرحال جسم کی بیماری رُوح کو بیمار نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے برعکس اگر انسان کا جسم بہت فربہ ہے تو اس کی توانائی کا خمار انسان کو عبادات کے لیے شب بیداری نہیں کرنے دے گا۔ بھوک زیادہ لگنے کی وجہ سے وہ دوسروں کی بھوک کا خیال نہیں رکھ پائے گا۔ زیادہ پلے ہوئے جسم کا مالک انسان Extra صحت کے نشہ ہی میں رہتا ہے۔ علامہ اقبال کی ڈائری کے پہلے صفحہ پر ایک جملہ تحریر تھا:۔

> ''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا جسم پلتا رہے تو رُوح کو مارنا پڑے گا اور اگر رُوح کو پالنا چاہتے ہو تو جسم کو مارنا پڑے گا۔''

اس لیے کہا جاتا ہے کہ کم بولنا، کم سونا اور کم کھانا فقیری کے انداز ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کھا لینا مباح ہے جس سے عبادات کے لیے توانائی ملتی رہے۔ البتہ زیادہ کھانے سے نیند کا غلبہ رہے گا اور سستی کی وجہ سے ہم اللہ کی یاد سے غافل ہونے لگیں گے۔ رُوحانیت کے ضمن میں پانی کے حوالے سے عرض کر دوں کہ یہ ہماری Body chemistry کو Balance رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی کہ زیادہ پانی پینے سے نیند زیادہ آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیائے کرام بہت کم پانی پیتے ہیں۔ انسان جتنا کم پانی پیئے گا اتنا ہی زیادہ

عبادات کی طرف راغب ہوگا اور اُس کا ذہن، جسم، نفس اور دل عبادات کے اثرات اُتنی ہی تیزی سے قبول کرے گا۔ جتنا کم پانی پیا جائے اُتنی ہی رُوحانی ترقی تیزی سے ہوتی ہے۔ اس کو میں نے خود بھی ذاتی طور پر آزمایا۔ تقریباً ساڑھے چار سال تک میں بس اُتنا پانی پیتا رہا جس سے زبان اور حلق تر ہو جائے۔ ساڑھے چار برس تک تو کام ایسے ہی چل گیا۔ اس کے بعد جب رمضان کا دسواں روزہ تھا تو مجھے Dehydration ہو گئی اور ڈاکٹر نے Drip لگا کر میرا روزہ توڑ دیا اور مجھے روزے رکھنے سے سختی سے منع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں رُوحانی ترقی کرتا کرتا 17 فرض روزوں سے ہی محروم ہو گیا۔ دسویں روزے کے بعد میں نے ستائیسویں کا روزہ رکھا وہ بھی ڈاکٹر کی ہدایات کو پس پشت ڈال کر۔

ہوتا یہ ہے کہ انسان رُوحانی ترقی کے لالچ میں 24 گھنٹوں میں دو گھونٹ پانی پینے لگتا ہے اور کبھی کبھار اس قسم کے مسائل کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔

انسانی جسم پانی کو دو طرح سے Retain کرتا ہے۔ ایک تو سادہ پانی جب ہم پیتے ہیں تو وہ ہمارے System میں جاتا ہے اور اس کا زیادہ تر حصہ پسینہ سے یا Otherwise خارج ہو جاتا ہے۔ بہت کم حصہ Absorb ہوتا ہے۔ ہمارے دل کے نیچے Cells ہیں۔ وہ Cells بھی اپنے طور پر پانی کی خاصی بڑی مقدار کو اپنے اندر یوں Retain کرتے ہیں کہ سادہ پانی کو تو وہ اپنے اندر Retain نہیں کر پاتے لیکن اگر پانی میں نمک یا چینی ملی ہے تو اس پانی کو Body system میں جا کر Pick کرتے ہیں اور پھر Retain کر لیتے ہیں۔

جب ہم پانی بہت کم پیتے ہیں تو پہلے ہمارے System میں موجود پانی Dry ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے جسم میں موجود Defence system بھی Active ہو جاتا ہے اور ان Cells نے جو پانی Retain کیا ہوتا ہے اسے لے کر جسم کی ضروریات پوری کرنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ پانی بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جس کے بعد Body chemistry بُری طرح Upset ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک علامت Dehydration ہے جس سے انسان Collapse کر جاتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ ہم رُوحانی ترقی کے لالچ میں پانی بہت کم پیتے ہیں اور اپنے جسم کی صحت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اپنے اس جوش و جذبہ میں کہ مجھے رُوحانیت کی راہ میں بہت آگے جانا ہے انسان صحت سے غفلت کے باعث بعض اوقات فرض روزوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اپنے جسم کا اتنا ضرور خیال رکھے کہ اس کی توانائی برقرار رہے اور وہ پوری توجہ اور انہماک سے عبادات کر سکے۔

سوال: بخل کا علاج کیا ہے؟

جواب: انسان خود اپنی Training شروع کر دے، خواہ وہ صحبت کے ذریعے سے ہو یا Self-suggestion کے ذریعے سے۔ تو بخل کا علاج ممکن ہے۔

Self-suggestion دراصل ایک نفسیاتی علاج ہے جو انسان خود ہی کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنے آپ کو یاد دلاتا ہے کہ مجھے بخل سے نہیں بلکہ سخاوت سے کام لینا ہے کیوں کہ یہ سنت الٰہی بھی ہے اور سنت رسول ﷺ بھی۔ یوں رفتہ رفتہ اُسے خدمت خلق کی عادت ہونے لگتی ہے اور اُس کا ہاتھ رب کے بندوں پر خرچ کرنے کے لیے کھل جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اہل فقر کی صحبت میں بیٹھ کر وہ مشاہدہ کرے کہ کس طرح وہ بلا تفریق سب پر خرچ کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ بھی یہی نکلے گا کہ وہ خود بھی بخیل سے سخی بن جائے گا۔

سوال: کیا درود شریف ہی بطور ورد کافی ہے؟

جواب: ایک روایت کے مطابق جو بھی درود پاک کہیں بھی پڑھا جاتا ہے وہ ہر جمعہ اور پیر کو آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں شخص نے آپ ﷺ پر درود بھیجا ہے وہ درود آپ ﷺ کی خوشنودی کا باعث بنتا ہے۔ آپ ﷺ تو رحمت ہی رحمت ہیں۔ آپ ﷺ درود پاک پڑھنے والے کو جوابی سلام بھیجتے ہیں اور جس پر آپ ﷺ سلام بھیج دیں اُس کی خوش قسمتی کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے۔ دوسری بات جو شاید آپ کو روایات میں نہ ملے میں اپنی طرف سے عرض کر دوں کہ درود پڑھنے والے کو آپ ﷺ کی توجہ ضرور ملتی ہے اور میرے نزدیک جس کو آپ ﷺ کی توجہ حاصل ہو گئی اُس کی دُنیا بھی سنور گئی اور آخرت بھی۔ ایسا شخص نیکی کی طرف ضرور راغب ہوگا۔

آپ ﷺ کی یہ توجہ میرے نزدیک دُنیا بھر کی نیکیوں سے افضل ہے۔ اگر میں نے کوئی نیکی کی ہوتی اور میرے نامۂ اعمال میں نیکیاں لکھی ہوتیں تو میں ضرور کہتا کہ میری ان تمام نیکیوں کے عوض اگر مجھے آپ ﷺ کی توجہ حاصل ہو جائے تو سودا مہنگا نہیں۔ لہٰذا درود پاک کا ورد رکھنا بہت بڑی سعادت ہے۔

سوال: ہم نے اللہ کو نہیں دیکھا لیکن اُس کے احسانات دیکھ کر اُس سے فطری طور پر محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ سے محبت بھی فطری امر ہے۔ آپ ﷺ سے بعد میں آنے والوں نے آپ ﷺ کو نہیں دیکھا۔ کیا آپ ﷺ سے اس محبت کو پیدا کیا جاتا ہے یا یہ بھی نصیب والوں کو عطا ہوتی ہے؟

جواب: محبت دو طرح سے پیدا ہو سکتی ہے:-

1. کوئی ہستی دل کو بھا جائے یا اچھی لگے۔
2. کسی شخص کی محبت اور رویہ، اُس کی نیکی اور احسانات آپ کے لیے اتنے زیادہ ہو جائیں کہ وہ آپ کو اچھا لگنے لگے۔

محبت یک لخت نہیں ہوتی بلکہ یہ مختلف Stages میں انسان کے دل میں راستہ بناتی ہے۔ انسان عشق تک کا سفر قدم بہ قدم طے کرتا ہے۔

پہلا قدم Liking (پسندیدگی) ہوتا ہے۔ اس پسندیدگی کی بنیاد کسی انسان کی شکل وصورت، اخلاق و عادات، ذہنی صلاحیتیں اور قابلیت ہوسکتی ہے یا کسی شخص کا حسن سلوک ہمارے لیے پسندیدگی کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر یہ Process جاری رہے تو یہ Liking (پسندیدگی) Infatuation میں بدل جاتی ہے اور یہ Infatuation محبت میں بدل جائے گی۔ محبت اگلے مرحلہ میں عشق میں تبدیل ہوجائے گی۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کے دور میں پیدا نہیں ہوئے۔ کم از کم میں تو اپنے آپ کو اس لحاظ سے بدنصیب سمجھتا ہوں کہ میں آپ ﷺ کے زمانہ میں پیدا نہیں ہوا ورنہ میں آپ ﷺ کی زیارت کر لیتا۔

ہم اُس دور سے نہیں گزرے لیکن آپ ﷺ نے اپنی ذات کی صورت میں جو نمونہ پیش کیا اور قرآن کی صورت جو پیغام بغیر کسی ترمیم وتحریف کے حرف بہ حرف ہم تک پہنچایا...... یہ دو چیزیں ہی کافی ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے احسان مند ہوں۔

درود پاک کا قصہ بھی یہی ہے کہ خود رب تعالیٰ بھی آپ ﷺ پر درود بھیجتا ہے۔ اللہ کے فرشتے بھی درود بھیجتے ہیں۔ ایسے میں مجھ جیسے گناہ گار کے درود وسلام کی آپ ﷺ کو ضرورت نہیں۔ لیکن اگر میں درود وسلام بھیجتا ہوں تو یہ گویا Acknowledgement ہے اس بات کی کہ میں آپ ﷺ کا احسان مند ہوں کہ آپ ﷺ نے اپنی ذات مبارکہ کی صورت میں میرے سامنے ایک ایسا نمونہ رکھ دیا کہ جس پر عمل کرنے سے میری دُنیا بھی سنور جائے گی اور آخرت بھی۔ مجھ پر دوسرا احسان عظیم آپ ﷺ کا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بعینہٖ مجھ تک پہنچا دیا جس طرح آپ ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے یہ دو احسانات ایسے ہیں جن کی Acknowledgement کے طور پر میں آپ ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کا پابند ہوں۔ انہی دو احسانات کی Acknowledgement کے طور پر میرے دل میں آپ ﷺ کے لیے Liking پیدا ہوتی ہے اور جب آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کر کے انسان اس پر عمل کرتا اور عمل کے نتیجے میں دُنیا و آخرت میں جو Fruits اور انعامات سمیٹتا ہے ان کی وجہ سے Infatuation محبت میں اور محبت عشق میں بدل جاتی ہے۔ جوں جوں انسان آپ ﷺ کی اتباع کرے گا وہ انعامات سمیٹتا چلا جائے گا اور آپ ﷺ کی محبت میں مبتلا ہوتا چلا جائے گا۔

رب تعالیٰ کا ہم احسان مانتے ہیں کہ وہ ہمیں تخلیق کرنے والا ہے۔ پھر ہم اُس کا یہ احسان مانتے ہیں کہ وہ ہمارا پالنے والا ہے۔ ہماری حفاظت کرتا ہے۔ اُس کی بزرگی بے حساب و بے اندازہ ہے۔ جب ہم رب تعالیٰ کے ان احسانات کو دیکھتے ہیں جو اس نے ہم پر کیے ہیں تو ہمارے دل میں اُس کے لیے محبت پیدا ہوتی ہے۔

آپ ﷺ کا احسان ہم پر یہ ہے کہ اللہ کا نازل کردہ پیغام حرف بہ حرف ہم تک پہنچا دیا اور پھر اپنی زندگی پر اس پیغام کو منطبق کر کے عملی صورت میں بھی پیش کیا۔ یہ دو احسانات ہی کافی ہیں آپ ﷺ سے محبت وعشق پیدا کرنے کے لیے۔ جذبہ احسان مندی سے بھی محبت اور عشق پیدا ہوتا ہے۔

سوال: کیا یہ ممکن ہے کہ کشف و کرامات کی منزل سے گزرے یا اُسے حاصل کیے بغیر اللہ تعالیٰ کی قربت اور دوستی حاصل کر لی جائے؟

جواب: اللہ کو ایسے لوگ بہت پسند ہیں جو نیک ہوں یا جو گناہوں سے دُور رہتے اور نیکی کی راہ پر چلتے ہیں۔ لیکن اللہ کے نزدیک وہ لوگ زیادہ افضل ہیں جنھوں نے گناہ کیا۔ پھر توبہ کی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گناہوں سے دُور ہو گئے اور نیکی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ جو شخص پیدائش سے لے کر موت تک نیک رہا اُس نے تو گناہ کی لذت چکھی ہی نہیں۔ اس لیے اُس کے لیے گناہ سے دُور رہنا قدرے آسان ہے۔ جب کہ وہ شخص جس نے گناہ کی لذت چکھ لی اُسے گناہ کو ترک کرنے کے لیے اپنے نفس سے لڑنا پڑا اور نفس سے جہاد کے بعد وہ نیکی کی طرف گیا۔ اور پھر ساری عمر گناہ کی لذت سے دُور رہنے کے لیے اپنے نفس سے لڑتا رہا۔ نفس سے یہ جہاد اُسے اللہ کی بارگاہ میں افضل کر دیتا ہے۔

اسی طرح رُوحانیت میں کشف و کرامات انسان کے لیے دو طرح Distraction بنتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ انسان کو سمجھ نہیں آتی کہ یہ میرے ساتھ کیا گزرا؟ میرے ہاتھوں کیا ہو گیا؟ یہ کس مقام کی بات ہے؟ اس ناسمجھی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بڑا ولی اللہ سمجھنے لگتا ہے۔ جہاں کسی نے خود کو بہت بڑا ولی اللہ سمجھ لیا وہیں رُوحانیت کا سفر رُک گیا۔ جہاں کسی نے خود کو عالم سمجھ لیا وہیں مزید علم کے حصول کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

دوسری Distraction یہ ہے کہ جب کسی کو کشف و کرامات حاصل ہوتی ہیں اور وہ لوگوں کے سامنے اُن کا اظہار کرتا ہے تو لوگ اُسے عزت و احترام دینے لگتے ہیں جس کی وجہ سے اُس انسان کا نفس پھلنے پھولنے لگتا ہے۔ جہاں کسی شخص کا نفس پروان چڑھنے لگا وہیں وہ تباہی کی طرف چلا گیا۔

یہ دونوں بہت بڑی Distractions ہیں۔ لیکن اگر کسی نے ان Distractions پر توجہ نہ دی بلکہ یہ سمجھ لیا کہ میری منزل تو قربِ الٰہی کا حصول اور اُس کی دوستی ہے تو وہ ان تمام چیزوں کو جھٹکتا ہوا بہت تیزی سے آگے نکل گیا۔

بہت سے اولیاء اللہ ایسے ہیں جو کشف و کرامات سے گزرے بغیر رب تک پہنچ گئے اور اُس کے دوست ہو گئے۔ لیکن کیا یہ زیادہ بہتر نہیں کہ انسان اپنے نفس سے لڑتا ہوا اس راستہ سے گزرے اور فضیلت پالے۔

کشف و کرامات ایک لحاظ سے نعمت بھی بن جاتی ہیں کہ انسان ان سے بچنے کے لیے خود سے لڑتا ہے۔ نفس کے ساتھ جہاد کرتا ہے اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتا ہوا رب تعالیٰ تک جا پہنچتا ہے۔ لہٰذا آپ ان کشف و کرامات سے گھبرائیے مت۔ اگر ہم نفس سے لڑتے چلے گئے تو یہ ہمارے لیے بہتری کا سامان پیدا کریں گی۔

سوال: یہ کیسے پتا چلے گا کہ ہمارا اللہ کی طرف جھکاؤ واقعی Fair اور Genuine ہے یا پھر یہ محض وقتی لذت ہے؟

جواب: سوال کرنے والے صاحب رُوحانی لحاظ سے کافی آگے ہیں۔ کیوں کہ ایسا سوال وہی شخص اُٹھائے گا جو رُوحانیت میں کافی آگے جا چکا ہو۔

جب تک انسان یہ سمجھتا رہا کہ یہ جو میں رب تعالیٰ کی طرف راغب ہوتا اور اُس کی طرف جھکتا ہوں کہیں یہ ریاکاری تو نہیں۔ سمجھ لیجیے جب تک اُس کی رُوحانی ترقی بہت تیز ہوگی۔ وہ اسی خوف سے مرتا رہے گا کہ میں جو رب تعالیٰ کے سامنے جھکتا ہوں، نیکی کی راہ پر چلتا ہوں، لوگوں کی خدمت کرتا ہوں کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے اندر Deep down یہ چیز ہو کہ میں اچھا کہلاؤں۔ یہ تو ریاکاری ہو جائے گی۔ شیطان مجھے اِدھر کو دھکیل رہا ہے کہ تمھیں لوگ اچھا کہیں گے اس لیے نیکی کرتے جاؤ۔ ایسا انسان جب یہ بات سوچے گا تو اور زیادہ محتاط ہو جائے گا اور وہ اپنی نیکیوں کو اور زیادہ پوشیدہ رکھے گا۔

اسی طرح عبادات کے بارے میں اگر کوئی شخص ہمیشہ مشکوک رہا کہ کہیں میری عبادت میں یہ دکھاوا تو نہیں کہ لوگ میری عزت کریں۔ اس قسم کے خوف میں مبتلا رہنے والے شخص کی عبادت میں دن بدن اخلاص زیادہ ہوتا چلا جائے گا کیوں کہ وہ نیک ہونے کے باوجود ہر وقت رب تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتا رہے گا "یا باری تعالیٰ! میں نیکی کی طرف نہیں آسکا۔ تو مجھے نیکی کی توفیق عطا فرما۔" اُس کا یہ عمل اُسے رُوحانی مدارج تیزی سے طے کرا دے گا۔

رُوحانیت کی بنیادی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ جس شخص نے یہ انتظار کیا کہ مجھے کچھ ملا یا نہیں ملا..... تو ایسے شخص کو کبھی کچھ نہ ملا۔ جو شخص اس تلاش میں رہا کہ میں نے کوئی راستہ طے بھی کیا یا نہیں۔ میں آگے بڑھا بھی یا نہیں۔ وہ کبھی کوئی راستہ طے نہ کر سکا۔ پتھر کی طرح اُسی جگہ پڑا رہ گیا۔ اسی طرح جس نے سوچا کہ میں بہت آگے آ گیا وہ تکبر میں پڑ گیا اور سب کچھ کھو دیا۔

رُوحانیت کی راہ گویا تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ یہ ایسا کڑا راستہ ہے کہ تلوار کی دھار پر چلنا تو شاید آسان ہو لیکن اس راہ پر چلنا خاصا دشوار ہے۔ لوگ انسان کو عبادت کرتا دیکھ کر مذاق اُڑاتے اور طعنے دیتے ہیں۔ تب وہ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے کہ مجھے دُنیا سے کیا لینا دینا۔ کوئی کچھ کہتا ہے تو کہتا رہے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ اس تضحیک اور استہزا کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے اور بہت آگے نکل جاتا ہے۔

دُعا کی قبولیت میں لاشعور کا کردار

سوال: میری بیٹی کو کتا اور بلی گھر میں رکھنے کا بہت شوق ہے لیکن ہم نے سُنا ہے کہ اس صورت میں فرشتے اور رُوحیں گھر میں داخل نہیں ہوتیں۔

جواب: میرے علم کے مطابق گھر میں کتا رکھنے سے رحمت کے فرشتے وہاں داخل نہیں ہوتے۔ لیکن یہاں یہ واضح کردوں کہ اگر ہم کُتے کو Living Area سے باہر خالصتاً رکھوالی کی نیت سے رکھیں تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

کتا رکھنے کے حوالے سے ایک اور احتیاط کی ضرورت ہے کہ کُتے کی نجاست اور لعابِ دہن نجس ہے۔ اگر کُتے کا جسم خشک ہے اور وہ ہمارے ساتھ مَس کر جائے تو ہمارا لباس ناپاک نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کُتے کا جسم گیلا ہے تو اس صورت میں مَس ہو جانے سے ہمیں لباس پاک کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

شوق کی خاطر یا شکار کھیلنے کی غرض سے کتا گھر میں رکھنا مناسب نہیں۔ اس سے منع کیا گیا ہے۔

بلی کو گھر میں رکھنے کی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن جب بلی گھر میں رکھی جائے تو اس کے بالوں سے محتاط رہنا چاہیے کیوں کہ یہ انسان کے لیے نقصان دہ ہیں۔ میرے خیال میں تو بلی گھر میں پالنے سے کوئی ایسا نقصان نہیں ہوتا کہ فرشتے یا فوت شدگان کی رُوحیں گھر میں نہ آئیں۔

سوال: خواتین کے لیے حجاب کی کیا شرائط ہیں؟

جواب: خواتین کا لباس ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے ان کے جسم کی ساخت نمایاں نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے کوئی عبایا یا Overall استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہاتھوں اور پاؤں کو چھپانے کے لیے Gloves اور Socks کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کچھ علماء کے مطابق چہرے کا پردہ ضروری نہیں جب کہ کچھ مکتبۂ فکر کے علماء چہرے کے پردے پر زور دیتے ہیں۔ حجاب کی شرائط کے حوالے سے یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے آپ بہشتی زیور کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

دُعا کی قبولیت میں لاشعور کا کردار

سوال: میری بیٹی کو کتا اور بلی گھر میں رکھنے کا بہت شوق ہے لیکن ہم نے سُنا ہے کہ اس صورت میں فرشتے اور رُوحیں گھر میں داخل نہیں ہوتیں۔

جواب: میرے علم کے مطابق گھر میں کتا رکھنے سے رحمت کے فرشتے وہاں داخل نہیں ہوتے۔ لیکن یہاں یہ واضح کردوں کہ اگر ہم کتے کو Living Area سے باہر خالصتاً رکھوالی کی نیت سے رکھیں تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

کتا رکھنے کے حوالے سے ایک اور احتیاط کی ضرورت ہے کہ کتے کی نجاست اور لعابِ دہن نجس ہے۔ اگر کتے کا جسم خشک ہے اور وہ ہمارے ساتھ مَس کر جائے تو ہمارا لباس ناپاک نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کتے کا جسم گیلا ہے تو اس صورت میں مَس ہوجانے سے ہمیں لباس پاک کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

شوق کی خاطر یا شکار کھیلنے کی غرض سے کتا گھر میں رکھنا مناسب نہیں۔ اس سے منع کیا گیا ہے۔

بلی کو گھر میں رکھنے کی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن جب بلی گھر میں رکھی جائے تو اس کے بالوں سے محتاط رہنا چاہیے کیوں کہ یہ انسان کے لیے نقصان دہ ہیں۔ میرے خیال میں تو بلی گھر میں پالنے سے کوئی ایسا نقصان نہیں ہوتا کہ فرشتے یا فوت شدگان کی رُوحیں گھر میں نہ آئیں۔

سوال: خواتین کے لیے حجاب کی کیا شرائط ہیں؟

جواب: خواتین کا لباس ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے ان کے جسم کی ساخت نمایاں نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے کوئی عبایا یا Overall استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہاتھوں اور پاؤں کو چھپانے کے لیے Gloves اور Socks کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کچھ علماء کے مطابق چہرے کا پردہ ضروری نہیں جب کہ کچھ مکتبۂ فکر کے علماء چہرے کے پردے پر زور دیتے ہیں۔ حجاب کی شرائط کے حوالے سے یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے آپ بہشتی زیور کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

سوال: ''عارف'' ولایت کا کون سا مقام ہے؟

جواب: ''عارف'' دراصل مقام نہیں بلکہ ایک کیفیت اور اسلوب کا نام ہے۔ ہر وہ آدمی جو تصوف کی راہ پر چلا، ولایت کے مقام پر پہنچا، اللہ کے احکامات کا پابند اور نیکوکار ہے۔ وہ عارف ہے۔

سوال: Mortgage کے لیے کیا شرائط ہیں؟ جب سود اور ربا کے بغیر گزارہ نہ ہو تو گھر کیسے خریدا جائے جب کہ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا میسر نہ ہو۔

جواب: اگر کوئی شخص گھر خریدنا چاہتا ہے اور اُس کے حالات ایسے ہیں کہ وہ کرایہ مستقل ادا نہیں کر سکتا لیکن Limited resources اسے سر چھپانے کے لیے گھر خریدنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ دوست و احباب سے قرضِ حسنہ کا حصول بھی ناممکن ہے تو اس صورت میں یہ کیا جا سکتا ہے کہ کم سے کم Loan لے کر گھر خرید لیا جائے اور پھر Top priority کے طور پر اس قرض کو جلد سے جلد چکانے کی کوشش کی جائے۔ جس طرح شدید بھوک کی صورت میں گھوڑے کا گوشت کھانا جائز ہے اور شدید بیماری میں شراب کی ایک خاص مقدار بطور دوا استعمال کی جا سکتی ہے تاکہ جان بچ جائے۔ اسی طرح ناگزیر حالات میں گھر خریدنے کے لیے قرض لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص Comfortably کرایہ ادا کر سکتا ہے تو میری رائے ہے کہ وہ قرض نہ لے۔

سوال: رُوح کا کیا رنگ ہے؟ کیا نیک رُوحوں کا رنگ سفید ہوتا ہے؟

جواب: رُوح کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ یہ بے رنگ و بے بُو ہے۔ جب یہ ہے ہی بے رنگ تو نیک رُوح کے سُرخ یا سفید رنگ کے ہونے کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ جو کہا جاتا ہے فلاں شخص کی رُوح کا رنگ سفید یا سُرخ ہے تو دراصل یہ رُوح کا رنگ نہیں بلکہ اس رُوح کو Suit کرنے والا رنگ ہے۔ اسی نسبت سے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی رُوح کا رنگ ایسا ہے۔

اسی طرح جو خوشبو کسی رُوح سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں شخص کی رُوح کی خوشبو ہے۔

یاد رہے کہ رُوح کا کوئی بھی رنگ نہ تو پاک ہے نہ ناپاک۔ نہ نیک ہے اور نہ بد۔ کیوں کہ رُوح ہے ہی بے رنگ۔ رُوح کو خواہ کوئی بھی رنگ یا خوشبو Suit کرتی ہو۔ اس رُوح کا Function ایک ہی ہے کہ وہ ہمارے مٹی کے بُت کو چلتا رکھتی ہے۔ اس کی Driving Force ہے۔

سوال: آیت کریمہ اور لاحول ولا قوۃ کے جنرل اثرات کیا ہیں؟

جواب: ہر لفظ کے اثرات ہر رُوح پر مختلف مرتب ہوتے ہیں۔ آیت کریمہ کا بنیادی عنصر جلالی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ ہر رُوح کو Suit کرے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر رُوح کو یہ Suit نہ کرے۔

آیت کریمہ جلالی ہے اور اس کا Background یہ ہے کہ جب حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے تو انھوں نے اس آیت کا ورد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر کرم کیا اور دس محرم کو مچھلی نے انھیں دریا کے

کنارے پر اُگل دیا۔

کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی اس آیت کریمہ کو پڑھے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے صدقے اُس کی مشکل دُور ہو جاتی ہے۔ یہ اس کے جنرل اثرات ہیں۔ لیکن یہ سب بھی اس پر Depend کرتا ہے کہ آیت کریمہ پڑھنے والے شخص کی رُوح کی Formation کیا ہے اور اُس رُوح کا اپنا بنیادی Element کیا ہے۔

اس لیے میں زور دیا کرتا ہوں کہ وہ تمام وظائف جو کتابوں میں لکھے ہوتے ہیں یا اخباروں میں چھپے ہوتے ہیں وہ اپنی مرضی سے مت پڑھا کیجیے کیوں کہ انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی تسبیح، ورد یا وظیفہ اُسے Suit کرتا ہے اور کون سا Suit نہیں کرتا۔

آپ نے اکثر مشاہدہ کیا ہوگا کہ جو شخص جتنی زیادہ تسبیحات کرتا ہے، اُتنا ہی زیادہ وہ پریشان دکھائی دیتا ہے۔ فقیر، اولیا و درویش عام طور پر کوشش کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک یا دو وظائف کر لیں بے شک اُن کے پڑھنے کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ جب بھی کوئی شخص زیادہ پڑھائیاں پڑھتا ہے تو وہ ذہنی طور پر پریشان ہو جاتا ہے۔ اس لیے کوشش کریں کہ وظائف اور ذکر اذکار کے پیچھے بھاگنے کی بجائے دل ہی دل میں وہ سورتیں پڑھتے رہیں جو آپ کو یاد ہیں۔ اور درود پاک پڑھ لیا کریں۔

جہاں تک لا حول و لا قوۃ کا تعلق ہے اُس کا بنیادی عنصر بھی جلالی ہے اور یہ شیطان کو دُور کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب بھی انسان پر نفس کا غلبہ ہو تو یہ پڑھ لینے سے انسان شیطان کے وار سے بچ جاتا ہے اور بھٹکتا نہیں۔

سوال: کیا درود پاک ہی بطور ورد کافی ہے؟

جواب: بے شک درود پاک بطور ورد کافی ہے۔

تصوف کی راہ میں پیار اور عشق و محبت کو بہت دخل ہے۔ اگر انسان کسی فقیر سے دل سے پیار کرتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ اُسی کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے لگتا ہے کیوں کہ انسان جس سے پیار کرتا ہے اُسے یاد بہت کرتا ہے۔ وہ اُسی کے دھیان میں لگا رہتا ہے اور لاشعوری طور پر وہ اُس کی اچھی چیزوں کو نقل کرنے لگتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی فقیر سے پیار کرے گا تو اُس کے انداز، الفاظ اور Style کی نقل کرنے لگے گا۔ اگر فقیر یہاں سے پیدل چلتا ہوا اسلام آباد گیا ہے تو اُس کے نقش قدم پر چلنے والا بھی لامحالہ اسلام آباد ہی جا پہنچے گا۔ جب ہم کسی سے پیار کرتے ہیں تو اُس کی تقلید کرنے لگتے ہیں اور وہیں جا پہنچتے ہیں جہاں وہ شخص گیا ہوتا ہے۔

آپ ﷺ کا معاملہ تو بہت آگے کا ہے۔ آپ ﷺ اللہ کے بعد سب سے بلند و بالا ہیں۔ جب کوئی شخص آپ ﷺ سے پیار کرتا ہے تو اُسے جواب میں آپ ﷺ کی نظر عنایت ملتی ہے اور جس کو آپ ﷺ کی نظر عنایت مل جائے اُس کا دُنیا و آخرت میں بیڑا پار ہے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ یہ توفیق بخشے کہ وہ دن رات درود پاک کا ورد رکھے اُس سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہوگا۔

سوال: اسمِ اعظم قرآن پاک کی کس سورہ میں ہے۔ دُعا کیا ہے؟ دُعا کی قبولیت میں Conscious mind اور Subconscious mind کس طرح کام کرتے ہیں؟

جواب: معلوم نہیں کہ لوگ اسمِ اعظم کے پیچھے کیوں بھاگتے پھر رہے ہیں۔ اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ فقیر تو اس سے بہت دُور بھاگتا ہے۔ اس سلسلے میں تو میں نے خود بھی ٹھوکر کھائی ہے۔ جب میں very first time بڑے شاہ صاحب سے ملا تو انھوں نے مجھے چار حروف پر مشتمل ایک لفظ عطا کیا اور فرمایا کہ وضو کے دوران ہاتھ دھوتے وقت یہ لفظ پڑھ لیا کرو لیکن یہ لفظ پڑھنے کے بعد دُعا ہرگز نہ مانگنا۔ دو چار روز تو میں نے صبر کیا لیکن پھر مغربی تعلیم کے زیرِ اثر دل میں خیال آیا کہ دُعا مانگ کر تو دیکھوں۔ آخر ہوتا کیا ہے۔ لہٰذا میں نے وضو میں ہاتھ دھوتے ہوئے جب وہ لفظ پڑھا تو دُعا مانگ لی۔ اس کے بعد نماز پڑھی اور دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو مجھے ایک بہت خوب صورت مقام نظر آیا۔ میں نے جا کر خوشی خوشی مرشد صاحب کو بتایا۔ وہ سن کر سوچ میں پڑ گئے اور بجائے خوش ہونے کے Upset ہو گئے۔ کچھ دیر سوچ میں ڈوبنے کے بعد کہنے لگے ''دوبارہ بتاؤ تم نے کیا دیکھا۔'' میں نے بتایا تو خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے ''اچھا۔ اتنی جلدی ایسا ہوا تو نہیں کرتا۔'' پھر وہ مراقبہ میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد سر اُٹھا کر مجھ سے پوچھا ''تم نے دُعا مانگی تھی؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو بولے۔ بھاگو یہاں سے۔ اب کیا لینے آئے ہو؟ میں نے تمھیں دُعا کرنے سے منع کیا تھا۔''

وہ تو کہیں بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لفظ دراصل اسمِ اعظم تھا۔ اسمِ اعظم اس لحاظ سے خطرناک بھی ہے کہ انسان بعض اوقات غیر ارادی طور پر دُعا مانگ لیتا ہے۔ جیسے اکثر فارغ اوقات میں وقتاً فوقتاً میں رب سے مخاطب ہو کر کہتا رہتا ہوں ''یا اللہ! رحم کر دے مجھ پر۔'' یہ بھی ایک دُعا ہے۔ اب آپ نے اسمِ اعظم پڑھا اور غیر ارادی طور پر یہ کہہ بیٹھے کہ یا اللہ رحم فرما۔ تو یہ دُعا ہو گئی اور آپ لٹکا دیے گئے۔ اس لیے فقیر اسمِ اعظم سے دُور بھاگتا ہے جب کہ عام آدمی اس کی جستجو میں رہتا ہے۔

Problem یہ ہے کہ اس کی سزا پر کسی کی نظر نہیں۔ اگر کسی فقیر نے اسمِ اعظم پڑھ کر دُعا مانگ لی تو اُس کا کام تو ہو جائے گا اور دُعا تو قبول ہو جائے گی۔ لیکن فقر کی فہرست سے اس کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خارج کر دیا جائے گا۔ یہ سزا اتنی بڑی ہے کہ فقیر اپنی جان تو دے سکتا ہے لیکن یہ سزا برداشت نہیں کر پاتا۔ اس لیے دُنیا کی خواہش اگر اتنی غالب ہو جائے کہ فقیر سوچنے لگے کہ میں اسمِ اعظم سے دُنیاوی فائدہ حاصل کر لوں چاہے میرا نام فقیری کی List سے کٹ جائے تو ایسے میں انسان سوائے یہ کہنے کے کہ ''یا اللہ! مجھ پر رحم اور کرم فرما کہ میں اس حال کو پہنچ گیا ہوں'' اور کچھ نہیں کہتا۔ مقامِ فقر سے معزولی بہت کڑی سزا ہے جو برداشت نہیں ہو سکتی۔

جب انسان کا کشف جاری ہوتا ہے وہ مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور کشف اختیاری عطا ہو گیا تو انسان بیٹھے بیٹھے کشف میں چلا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے لیے دُعا کرتا ہے اور وہ قبول ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ سب سلسلہ چل رہا ہوتا ہے کہ اچانک کشف بند ہو جاتا ہے۔ جب پہلی بار ایسا ہوتا ہے تو اُسے

سمجھ نہیں آتی کہ یہ ہوا کیا ہے۔ اس کا اثر فقیر پر اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ اُسے اپنی زندگی بے کار لگنے لگتی ہے۔

اسی طرح وہ لوگوں کے لیے جو دُعا کرتا ہے وہ پوری ہو رہی ہوتی ہے۔ پھر اچانک یوں ہوتا ہے کہ وہ ایسی کیفیت میں چلا جاتا ہے کہ دُعا قبول ہی نہیں ہوتی۔ یا پھر ایسی کیفیت ہو جاتی ہے کہ وہ جو دُعا کرتا ہے اُس کے بالکل برعکس اور اُلٹ ہونے لگتا ہے۔ یہ کیفیت عموماً تین سے سات دن تک رہتی ہے۔ عام طور پر اس کا دورانیہ تین دن ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت فقیر سے برداشت نہیں ہوتی۔ واقعتاً وہ سوچتا ہے کہ اب میرے زندہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ اور بات کہ بعد میں اُسے سمجھ آ جاتی ہے کہ یہ سب ہونا ضروری تھا اور تب اُسے اس کا فائدہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

جب انسان کی کہی ہوئی ہر بات پوری ہو رہی ہوتی ہے، ہر مانگی جانے والی دُعا قبول ہو رہی ہوتی ہے تو یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں اُس انسان میں تکبر نہ پیدا ہو جائے اور وہ لوگوں سے کہنے لگے "جاؤ! میں دُعا مانگوں گا تمھارا کام ہو جائے گا۔" اس تکبر کی وجہ سے انسان کو عطا کردہ چیزیں اور علم کے ضائع ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کشف کا رُک جانا اور دُعا کا قبول نہ ہونا انسان کے لیے رب کی رحمت ثابت ہوتا ہے کہ وہ اُسے جھٹکا دیتا ہے کہ تکبر میں نہ آنا، قادرِ مطلق میں ہوں اور میں ہی یہ چاہتا ہوں کہ تمھاری سب دُعائیں پوری ہو جائیں اور میں ہی ہوں جو تمھیں کشف میں سب کچھ دکھاتا ہوں۔ رب میں ہی ہوں۔ میں جب چاہوں اس سلسلے کو روک دوں۔ جب یہ جھٹکے درمیان میں لگتے رہتے ہیں تو انسان کے پاؤں زمین پر رہتے ہیں۔ وہ تکبر میں نہیں آتا اور یوں بچا رہتا ہے۔ یہ بھی رب تعالیٰ کی رحمت کا ایک انداز ہے کہ بعض اوقات اُسے خلقِ خدا سے جوتے بھی لگ جاتے ہیں۔ کوئی شخص آ کر اُس فقیر سے دُعا کے لیے کہتا ہے اور فقیر جواب دیتا ہے "آپ اطمینان سے جائیے۔ ہو جائے گا یہ کام۔" اور وہ کام اُلٹ ہو گیا۔ لوگ آ جاتے ہیں پھر فقیر کے پاس کہ آپ نے تو کہا تھا کہ کام ہو جائے گا وہ تو ہوا ہی نہیں۔ جب وہ لوگ لفظوں کے جوتے مار کر جاتے ہیں تو فقیر کے مزاج ٹھکانے آ جاتے ہیں اور وہ دوبارہ تکبر سے انکساری میں چلا جاتا ہے اور یوں بچ جاتا ہے۔

کشف میں چیزیں اُسے ہمیشہ درست دکھائی دے رہی ہوتی ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ رب تعالیٰ اُسے رگڑ دیتا ہے۔ تب پتا چلتا ہے کہ رب تو وہی ہے۔ سب چیزوں کا مالک بھی وہی ہے۔ یہ ادراک ہوتے ہی فقیر ایک بار پھر انکساری میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ جھٹکا بھی ایک رحمت ہے کیوں کہ انسان کو عموماً پتا ہی نہیں چلتا کہ مجھ سے کہاں غلطی ہو گئی۔ پتا اُس وقت چلتا ہے جب سزا مل جاتی ہے۔ اس لیے فقیر تو اسمِ اعظم سے بہت دُور بھاگتا ہے۔

ہماری ایک عجیب عادت ہے کہ ہم اُس چیز کے پیچھے بھاگتے ہیں جسے رب نے انتہائی حقیر قرار دیا ہے۔ دُنیاوی آسائش اور مال و زر سے رب تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین بندوں کو ہمیشہ دُور رکھا۔ اللہ کے تمام پیغمبر دُنیاوی مال و زر سے تہی دامن رہے۔ کوئی تکلیف ایسی نہیں جس سے وہ نہ گزرے ہوں لیکن اللہ نے اُنھیں بے پناہ عزت و احترام سے نوازا۔

رب تعالیٰ نے جس چیز کو ہمارے لیے پسند کیا ہم اُسی سے دُور بھاگتے ہیں۔ رب نے جس شے کو حقیر جانا ہم اُسی کی جستجو میں رہتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے قرآن پاک ہمیں راہ ہدایت دکھانے کے لیے نازل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت کرنے والے کے دل سے دُنیا کی محبت نکل جاتی ہے لیکن ہم اپنی جان پر یہ کیسا ظلم کرتے ہیں کہ وہ قرآن جو دل سے دُنیا کی محبت نکالنے کے لیے نازل ہوا تھا ہم اُسی کو دُنیا کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ایک ٹریفک کانسٹیبل جو چوراہے پر اس لیے کھڑا ہے تا کہ لوگوں کو بتا سکے کہ اس روڈ (Road) پر دو طرفہ ٹریفک منع ہے اور وہ خود ہی One-way کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ ہم دُنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے قرآن پاک کی مختلف آیات اور سورتیں پڑھتے ہیں۔ یہ ہم نے قرآن پاک کا کیسا استعمال شروع کر دیا ہے۔ ہم اس کے ایسے استعمال سے دُور رہیں تو بہتر ہے۔

ہم اکثر دُعا کے قصے میں پڑے رہتے ہیں۔ دُعا کیا ہے؟ یہ کس طرح کام کرتی ہیں؟

دُعا دراصل اُس کیفیت کا نام ہے کہ جب انسان کا دل دُکھے اور وہ تکلیف میں ہو تو سب سے اعلیٰ قوت کے سامنے وہ فریاد کرے، اُسے پکارے اور اُس Supreme Power سے مدد کا طالب ہو۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو سب سے اعلیٰ، پیچیدہ اور طاقت ور چیز عطا کی ہے وہ اُس کا دماغ ہے۔ اس کے کئی Levels ہیں۔ ایک شعور ہے جسے ہم Conscious mind کہتے ہیں۔ دوسرا لاشعور ہے جسے ہم Unconscious mind کہتے ہیں۔ تیسرا Subconscious mind ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جب ہم دُکھ اور تکلیف میں ہوتے ہیں اور ہماری کوئی آرزو پوری نہیں ہو رہی ہوتی تو اس کا ادراک ہمارے Conscious mind (شعور) کو ہوتا ہے۔ جب ہم اُس آرزو کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے بے چینی، دُکھ اور تکلیف میں گڑ گڑا کر اللہ سے دُعا کرتے ہیں تو اپنی اُس آرزو یا خواہش کو Subconscious mind کے سپرد کر دیتے ہیں۔ تب ہمارا Subconscious mind اُسے اللہ کے حضور Repeat کرنے لگتا ہے۔ یوں ہماری وہ دُعا اللہ کے حضور قبول ہونے لگتی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جیسے ہم بعض اوقات کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ مثلاً ہم گاڑی کی چابی کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ اسے ڈھونڈنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں اور بالآخر ناکام ہو کر تلاش ترک کر دیتے ہیں۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے اچانک یاد آتا ہے کہ میں نے وہ چابی فلاں جگہ رکھی تھی۔ تب ہم اُس جگہ جا کر چابی اُٹھا لیتے ہیں۔

اب وہ چیز خود بخود کیسے یاد آئی؟ کہیں تو کوئی چیز کام کر رہی تھی جس نے اس بھولی ہوئی چیز کو Recall کرنے میں مدد دی۔ وہ شے ہمارے Conscious mind میں آ گئی۔ وہ دراصل ہمارا Subconscious mind تھا۔ جب ہم نے تھک ہار کر تلاش کا سلسلہ ترک کر دیا تو دراصل ہم نے تلاش کے اس عمل کو Subconscious mind کے حوالے کر دیا تھا جو اس پر مسلسل کام کرنے لگا حتیٰ کہ وہ بھولی ہوئی چیز ہمیں یاد آ گئی۔

جب ہم دُعا مانگتے ہیں تو فوری طور پر ہماری وہ دُعا یا خواہش اگرچہ پوری نہیں ہوتی لیکن ہمیں ایک سکون ضرور آ جاتا ہے اور ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہمارا یہ کام ہو جائے گا اور ہماری تکلیف کم ہو جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ دُکھ اور احساس ہمارے Conscious mind سے ختم ہو گیا اور Subconscious mind میں منتقل ہو گیا۔ یوں تکلیف کا احساس جاتا رہا۔

یہ جو Conscious mind to Subconscious mind کا Transfer کھیل ہے یہ انسان کے لیے بہت بڑی رحمت ہے۔ ورنہ وہ پاگل ہو جاتا۔ منتقلی کا یہ احساس ہمیں آسودگی دیتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دُعا بہت بڑی Strength ہے۔ جو لوگ اپنے عقیدہ میں پختہ ہوتے ہیں اور دُعا مانگتے رہتے ہیں، وہ بہت کم آپ کو پریشان دکھائی دیں گے کیوں کہ اُن کے Subconscious mind کی طاقت اتنی زیادہ ہے کہ وہ انھیں یقین دلاتا رہتا ہے کہ اُوپر ایک Supreme power موجود ہے جو ہمارے سب کام کرتی ہے اور ہر چیز اُس کے قبضہ اختیار میں ہے۔ یہ Subconscious mind پختہ عقیدہ کے حامل انسان کو پریشان نہیں ہونے دیتا۔

عجیب بات یہ ہے کہ دہریئے اور سیکولر رب تعالیٰ کو نہ ماننے کے باوجود بھی مشکل اور مصیبت میں دُعا مانگتے ہیں۔ سقراط اس کی سب سے بڑی مثال تھا۔ جب اُسے زہر کا پیالہ دیا گیا تو اُس نے رب تعالیٰ کے حضور دُعا مانگی اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اعتراف کیا کہ ہاں ایک دکھائی نہ دینے والی قوت موجود ہے جو سب قوتوں پر محیط ہے۔ میں اُس کا وجود سب کے سامنے تسلیم کرتا ہوں اور اسی اطمینان سے یہ زہر کا پیالہ پی رہا ہوں۔

اس کے برعکس ارسطو کو جب زہر کا پیالہ دیا گیا تو اُس نے دُعا نہیں مانگی اور اُس کا آخری وقت اتنا ہی خراب ہوا۔ بہرحال دُعا صرف اسلام ہی نہیں بلکہ ہر مذہب کے مطابق عبادت کا مغز ہے اور قلبی سکون کے حصول کا ایک ذریعہ بھی۔

الہامی مذاہب میں دُعا اور دُعا میں مان کی اہمیت

دُعا تمام مذاہب کا حصہ رہی ہے خواہ وہ الہامی مذاہب تھے یا انسان کے متعارف کردہ نظام تھے۔ دُعا کو ہمیشہ اُن میں ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ انسانی نفسیات کے ماہرین بھی جانتے ہیں اور رب تعالیٰ تو بہر حال انسان کا خالق ہے اور خالق سے بہتر اپنی تخلیق کی کمزوریاں اور اُس کی خوبیاں سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس لیے رب تعالیٰ نے انسان کے بارے میں دو چیزیں بہت صراحت سے بیان فرمائیں۔

1۔ انسان ناشکرا ہے۔

''اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو شمار نہ کر سکو گے۔ بے شک آدمی بڑا ظالم ناشکرا ہے۔''
(سورۂ ابراہیم 34)

2۔ انسان بے صبرا ہے۔

''بے شک آدمی بنایا گیا ہے بڑا بے صبرا حریص۔'' (سورۃ المعارج آیت 19)

یہ جو انسان کو رب تعالیٰ نے ناشکرا کہا اور اس بارے میں قرآن پاک میں یوں فرمایا کہ جب کوئی انسان مشکل میں ہوتا ہے تو مجھے پکارتا ہے اور جب میں اُسے اس مصیبت سے نکال دیتا ہوں تو وہ مجھے بھول جاتا ہے۔

''اور جب آدمی کو تکلیف پہنچتی ہے ہمیں پکارتا ہے لیٹے اور بیٹھے اور کھڑے۔ پھر جب ہم اُس کی تکلیف دُور کر دیتے ہیں۔ چل دیتا ہے۔ گویا کبھی کسی تکلیف کے پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔'' (سورۂ یونس 12)

انسان رب تعالیٰ کے ساتھ دُعا کے معاملہ میں بھی ایسا ہی رشتہ قائم کرتا ہے۔ جب ہمیں کسی چیز کی حاجت ہوتی ہے تو ہم رب کے حضور دُعا کرتے ہیں کہ ہمیں فلاں چیز عطا فرما دے یا ہمارا فلاں کام کر دے۔ جب رب تعالیٰ انسان کو وہ چیز عطا فرما دیتا ہے تو انسان بڑی رعونت سے کہتا ہے کہ یہ چیز تو مجھے عقل مندی اور تدبیر سے حاصل ہوئی ہے۔

دُعا مختلف ادوار میں مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی موجودہ رنگ میں پہنچی۔ سب سے پہلے ہندو ازم میں دُعا کے ساتھ تو ہمات شامل ہوئیں۔ ہندو مذہب کسی زمانہ میں مذہب رہا ہوگا۔ یہ وہ دور تھا جب انسان ذہنی

ارتقا ونشوونما کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ تب اُس کے I.Q. Levels بہت Low تھے۔

ایک وقت اور دوسری انسان کی کم علمی...... ان دونوں Factors نے مل کر ہندوازم میں تو ہمات کو فروغ دیا۔ پھر اس مذہب میں پروہت کا نظام داخل ہوا۔ Priesthood کی وجہ سے پنڈت اور پروہت وجود میں آئے جن کا گزر بسر اس بات پر تھا کہ مذہب کے حوالے سے ایسے ابہام پیدا کر دیے جائیں کہ لوگ مذہب کے بارے میں Confuse ہو جائیں اور اس Confusion کو دُور کرنے کے لیے پنڈت کے پاس بھاگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے یہ تاثر دینا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ خود سے قریب لوگوں کی دعائیں جلدی سنتا ہے۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے یہ کام کیا کہ بھگوان کو Material شکل دے کر بُت بنا دیا اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بیان کردہ مختلف Attributes کی بنیاد پر مختلف دیوتا بنا لیے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے "غنی"۔ اُس کے خزانے بے پناہ ہیں جن میں سے وہ مخلوق کو عطا فرماتا ہے۔ اس صفت کی بنیاد پر ہندو پروہتوں اور پنڈتوں نے بتوں کو لکشمی کی شکل دے دی۔ پھر اللہ تعالیٰ سب کی مدد کرتا ہے۔ بگڑی بناتا ہے All time powerful ہے۔ اس صفت کی بنیاد پر اُنھوں نے اُسے گنیش کی شکل دے دی۔

یہ سب ہندو پروہت اور پنڈت کی کاریگری تھی کہ وہ اپنے اردگرد لوگوں کو اکٹھا کریں تا کہ اُنھیں عزت بھی حاصل ہو اور مال و دولت بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ لوگ اُن سے خوفزدہ بھی رہیں۔ یہ ایک طرح ہندو معاشرہ میں بے تاج بادشاہ کے اقتدار کی لڑائی تھی۔ جس کے حصول کے لیے اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو مختلف دیوتاؤں کی شکلوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اُن کے مندر بنائے اور اُس کی ایک نشانی رکھ دی کہ میں اس دیوتا کا خدمت گار ہوں اور یہ مندر فلاں دیوتا کا ہے۔

پھر اُنھوں نے اس مندر کو کمائی کا ذریعہ یوں بنایا کہ لوگ وہاں پر چڑھاوے چڑھانے لگے۔ پنڈت اور پروہت نے اپنی Income کو Ensure کرنے کے لیے دُعا کے ساتھ قربانی کو Attach کر دیا حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو انسانی خون کی بھینٹ دی جانے لگی یہ سوچ پروان چڑھائی گئی کہ خون کی قربانی کے بعد کی جانے والی دُعا جلد قبول ہو گی۔ اسی طرح یہ تصور بھی ہندو پنڈتوں نے پھیلایا کہ ہمارے ذریعے سے دُعا کراؤ کیونکہ ہم اللہ کے پہنچے ہوئے اور قریبی بندے ہیں اور ہماری دُعائیں جلدی قبول ہوتی ہیں۔ یہ تصور پھیلانے کا مقصد دراصل ذاتی مفاد کا حصول تھا۔ مذہب کے ساتھ حقیقتاً اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں نے یہ سمجھ لیا کہ دُعا کے لیے مندر جاؤ تو ساتھ کچھ نذرانہ، چڑھاوا یا قربانی ضروری ہے۔ ہندوازم میں مذہبی رُسوم کو اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ صرف ہندو پنڈت ہی کے لیے اُن کی ادائیگی ممکن تھی۔ ایک عام آدمی اُنھیں ادا نہ کر سکتا تھا۔ اور اب تک یہی صورتِ حال برقرار ہے۔

اسی طرح یورپ جب Dark Ages سے گزر رہا تھا تب علم بہت کم تھا اور مکمل اناری تھی۔ جنگل کا قانون رائج تھا۔ ایسے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام تشریف لائے اور اللہ کا پیغام پہنچایا۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپ میں بھی دُعا میں شرک اور مبالغہ غالب تھا۔

بدقسمتی سے دُعا کے ساتھ ہمیشہ دو چیزیں Attach ہو جایا کرتی ہیں:

1۔ شرک

2۔ غلو یا مبالغہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دُعا سے منسوب یہ غلط فہمیاں دُور کیں اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ تک Direct پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی قربانی کی ضرورت ہے نہ انسان کے کسی خاص مقام پر فائز ہونے کی شرط۔ انسان جب اور جہاں چاہے اللہ کے حضور دُعا کرے۔ اللہ تعالیٰ دُعا سننے والا، قبول کرنے والا اور پوری کرنے والا ہے۔ لیکن ہوا یوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد پادریوں نے بالکل پنڈت اور پروہت کا طریقہ متعارف کروایا کہ آپ دُعا کے لیے ہمارے پاس تشریف لائیں، دُعا قبول ہوگی۔ ہمارے سامنے Confession کیجیے۔ ہم دُعا کریں گے اور آپ بخشے جائیں گے۔ رفتہ رفتہ عیسائی معاشرہ میں پادری کی گرفت اتنی مضبوط ہوگئی جتنی کہ ہندو معاشرہ میں پنڈت کی تھی۔

آپ ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے تمام ایسی روایات و رواج اور Myths اور حکایات جنھوں نے دُعا کی حقیقت کو گہنا دیا تھا، اُن کی نفی کی۔

آپ ﷺ نے بتایا کہ رب تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے۔ وہ اپنے بندوں کی ہر زبان میں اور ہر مقام سے کی جانے والی فریادیں سنتا ہے۔ حتیٰ کہ عبادت کے سلسلے میں آپ ﷺ نے یہ بات مسلمانوں پر واضح فرما دی کہ عبادت کے لیے مسجد کی پابندی نہیں۔ ساری زمین اگر اس پر بظاہر ا گندگی نہیں ہے تو وہ گویا مسجد ہے۔ وہاں نماز ادا کر لیجیے۔ نوافل پڑھ لیجیے۔ یوں مسلمانوں پر واضح ہو گیا کہ ساری زمین ہی جائے عبادت ہے:۔

> ''میرے لیے تمام روئے زمین کو نماز پڑھنے کی جگہ اور طہارت (بطور تیمم) کے حصول کا ذریعہ بنا دیا گیا۔'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر 427)

اسی طرح آپ ﷺ نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ ہر انسان اللہ کے حضور دُعا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کی دُعائیں سنتا ہے۔

> ''جو بھی شخص اللہ تعالیٰ سے جو بھی دُعا مانگتا ہے اللہ اُسے وہ چیز عطا کر دیتا ہے جو اُس نے مانگی تھی۔'' (جامع ترمذی، حدیث نمبر 3381)

کسی کو صاحب دُعا کے پاس بھاگے جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اہل تقویٰ معاشرہ میں باعزت ہیں۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ رب تعالیٰ گناہ گاروں کی دُعائیں بھی قبول کرتا ہے۔ نیک آدمیوں کی دُعائیں تو بہت دیر میں قبول کرتا ہے لیکن گناہ گاروں کی جلدی قبول کرتا ہے۔ اس طرح رب تعالیٰ اپنا ظرف دکھاتا ہے کہ اگرچہ تم دن رات میری نافرمانی کرتے ہو لیکن پھر بھی میں تمھاری دُعائیں اپنے فرماں بردار بندوں کی نسبت زیادہ جلدی قبول کر لیتا ہوں۔ یہ میری شان ربوبیت ہے۔

ایک بات یاد رکھیے کہ وہ گناہ گار جو اللہ کے حضور گناہ کر لینے کے بعد سچے دل سے توبہ کرتا ہے وہ اُس زاہد و پارسا سے کہیں بہتر ہے جو توبہ کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ توبہ نہ کرنا تکبر کا ایک رنگ ہے جو رب تعالیٰ کو پسند نہیں۔ تکبر صرف اللہ کو سزاوار ہے اس کے علاوہ کسی کو نہیں۔

ہمارے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کے ساتھ رہتے رہتے ہم پر ہندو معاشرہ کا رنگ چڑھ گیا۔ ہمارے آباؤ اجداد پر اللہ تعالیٰ نے رحم کیا اور انھیں سیدھا راستہ دکھایا جس کے نتیجہ میں وہ ہندو سے مسلمان تو ہو گئے اور اُنھوں نے اپنے عقائد تو بدل لیے لیکن ہندوانہ رُسوم کو ساتھ ہی لے آئے۔

عقائد کا تعلق ہمارے دین سے اور رُسوم کا تعلق ہمارے معاشرہ سے ہے۔ یوں دین اور معاشرہ کو ہم نے گڈمڈ کر دیا۔ حالانکہ اسلام میں معاشرہ بنتا ہی دینی اقدار سے ہے۔ اس میں انسان پورے کا پورا مذہب کا شٹل کاک (Shuttle cock) خود پر اوڑھ لیتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر پہلو دین کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس لیے مسلمان معاشرہ کی تمام رُسوم دین اسلام کے ماتحت ہونی چاہییں لیکن ہوا یہ کہ ہم نے عقائد تو بدلے لیکن ہندوؤں کے رُسوم و رواج کو اپنی زندگی میں شامل رہنے دیا۔

اللہ تعالیٰ نے تو دین و دُنیا سب کو ہم پر آسان کر دیا تھا۔ اسلام میں تو شادی بیاہ اتنا آسان ہے کہ دو گواہ ہوں تو بغیر کسی نکاح خواں کے دُلہا دُلہن کا نکاح پڑھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی شرط نہیں۔ حضرت علیؓ کے ولیمہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس میں تمام Invitees اپنا اپنا کھانا لے کر آئے اور سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ لیکن ہمارے معاشرہ میں شادی بیاہ کی رُسوم کے نام پر جو کچھ ہوتا ہے ان میں ماسوائے نکاح کے کچھ دینی نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کسی کا عزیز انتقال کر جاتا ہے تو تین دن تک لوگ وہاں جاتے ہیں۔ فاتحہ پڑھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ چوتھے روز سب لوگ اپنے کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

دُعا میں بھی اسی طرح کی رُسوم شامل ہو گئیں اور ہم نے بہت سے بے جا لوازمات اس میں داخل کر لیے۔ مثلاً یہ کہ اگر ختم دلا کر دُعا کی جائے۔ کسی پہنچے ہوئے بزرگ سے دُعا کرائی جائے، کسی خاص مقام پر کھڑے ہو کر دُعا کی جائے، کسی مخصوص Posture میں بیٹھ کر دُعا کی جائے یا مخصوص الفاظ میں دُعا کی جائے تو وہ جلدی قبول ہوتی ہے۔

ایک اور چیز جو مسلمانوں کے لیے خطرناک ہے وہ بھی دُعا میں شامل ہو گئی۔ ہندو جاپ بہت جپتا ہے۔ ہم نے وہ Influence بھی Draw کر لیا اور اب ہم نے ہر کام کے لیے وظیفہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ڈیڑھ منٹ کے کام سے نجات کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ کا وظیفہ ہم کرنے لگتے ہیں۔ دُعا کا کام تو یہ ہے کہ وہ دلوں کو سکون عطا کرتی ہے۔ انسان پریشانی میں اگر صدقِ دل سے دُعا کرے تو دل کو اطمینان ہو جاتا ہے لیکن ہم نے وظائف کی راہ پکڑ لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب ہم میں سے بہت سے لوگ نماز کے بعد گھنٹہ گھنٹہ جانماز پر بیٹھ کر وظیفہ کرتے رہتے ہیں۔ پوچھنے پر پتا چلتا ہے کہ تمام فرائض کی تکمیل کے لیے بجائے محنت کرنے کے تسبیح پھیرنے

کو ترجیح دیتے ہیں۔ فرض کریں میرا باس میری نالائقی، بے پروائی یا چھٹیاں کرنے کے باعث مجھ سے ناراض ہے تو بجائے یہ کہ میں اپنے فرائض درست طور پر ادا کرنا شروع کردوں میں کسی پیر صاحب کے پاس جاکر وظیفہ معلوم کروں گا اور صبح شام گھنٹہ گھنٹہ وظیفہ کرنے کے بعد تصور کرلوں گا کہ اب باس میرے قدموں میں ہوگا۔ جہاں یہ سوچا وہاں میری کوتاہی اور بے پروائی میں اضافہ ہوگیا نتیجہ کے طور پر باس نے جاب سے میری چھٹی کروادی۔ اب میں بھاگا بھاگا پیر صاحب کے پاس جاتا ہوں کہ جناب میں نے تو وظیفہ اس لیے کیا تھا کہ باس میرے قدموں میں ہوتا لیکن میری تو جاب ہی سے چھٹی ہوگئی۔ یہ سننے کے بعد وہ پیر صاحب میرے وظیفہ پڑھنے کے طریقہ میں کوئی نہ کوئی غلطی نکال دیں گے اور کہیں گے کہ یہ غلطی کرنے کی وجہ سے آپ کے ساتھ ایسا ہوا۔ آج کل یہ رویہ عام ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ نے Clearly فرمایا تھا کہ اللہ سب کی دُعا سنتا اور قبول فرماتا ہے تاوقتیکہ کسی گناہ کی یا کسی رشتہ دار سے ناتا توڑنے کی دُعا کی جائے۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے۔

> ''جو بھی شخص اللہ تعالیٰ سے جو بھی دُعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے وہ چیز عطا کردیتا ہے جو اُس نے مانگی تھی یا اسی کے حساب سے کوئی تکلیف وہ چیز اُس شخص سے دُور کردیتا ہے جب کہ وہ شخص کسی گناہ یا قطع رحمی کے بارے میں دُعا نہ مانگے (یعنی اس بارے میں دُعا قبول نہیں ہوتی)۔'' جامع ترمذی۔ حدیث نمبر 3381، کتاب الدعوات باب ان دعوۃ المسلم مستجابۃ

آپ ﷺ نے ایک جگہ فرمایا کہ خلاف فطرت دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ ایسی دُعائیں جو Law of nature کے خلاف ہوں۔ مثلاً میں اگر بیر کا درخت لگا کر سارا سال دُعا کرتا رہوں کہ اس درخت پر سیب کا پھل لگ جائے تو ایسی دُعا پوری نہیں ہوگی۔ ایک فلاسفر والٹیئر نے بھی کہا تھا کہ Law of nature کے خلاف کی گئی دُعا کبھی قبول نہیں ہوتی۔ ایک اور فلاسفر نطشے جسے مجذوب دانش ور کہا جاتا ہے اُس نے بھی یہی کہا تھا۔ فرانس کے ایک ایک فلاسفر بینجمن فرینکلن نے بھی دُعا کی اہمیت یوں بیان کی ''دُعا بگڑے کاموں کو بنا دیتی ہے۔'' ان سب لوگوں کی فلاسفی کے مطابق یہ پتا چلتا ہے کہ جب کوئی مایوس انسان اللہ کے حضور دُعا کرتا ہے تو اُسے دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں:۔

1۔ ذہنی اطمینان

2۔ رب پر پختہ یقین اور مان

دُعا کرنے سے جب انسان کو ذہنی اطمینان عطا ہوتا ہے تو اُس کی مایوسی دُور ہو جاتی ہے۔ وہ نئے عزم و جذبے کے ساتھ دوبارہ محنت کرتا ہے اور یہی وہ Turning point ہوتا ہے جب انسان نئے جذبے سے محنت کرتا ہے اور کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ ایک بات بہت Simple ہے کہ مسلمان کسی بھی وقت، کسی بھی زبان میں، کسی بھی مقام سے اللہ کے حضور دُعا کرے اللہ تعالیٰ اُسے سنتا اور قبول فرماتا ہے۔ وہ ہر ایک کی دُعا

سن لیتا ہے۔ لیکن مسلمان جتنی سادگی میں رہے اُتنا ہی بہتر ہے اور سادہ فارمولا یہ ہے کہ آپ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ سے کسی بھی زبان میں رب تعالیٰ کو پکاریں وہ سن لے گا۔ ہاں البتہ اس میں ایک بنیادی شرط ہے...... "مان"۔

ایک فلاسفر زینو کا پختہ یقین تھا کہ دُعا اگر مان سے کی جائے تو ضرور قبول ہوتی ہے۔ مان اس طرح کہ مجھے اپنے رب تعالیٰ کے بارے میں یقین ہے کہ وہ مجھے کبھی بے سہارا نہیں چھوڑے گا۔

دوسرا میرے دل میں یہ پختہ یقین ہے کہ میرا رب تعالیٰ بہت مہربان ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ میرا پختہ یقین ہے کہ رب میرا ہے۔ مجھ سے کسی نے ایک بار پوچھا تھا "آپ اللہ کو رب کیوں کہتے ہیں؟" تب میں نے اُن سے ایک بات کہی "جب میں اپنے رب کو اللہ کہتا ہوں تو نہ جانے کیوں مجھے ایک غیریت کا احساس ہوتا ہے کہ جیسے میں اپنے رب سے جدا ہو گیا ہوں۔ میرے اور اُس کے درمیان دُوری آ گئی ہے۔ لیکن جب میں اُسے 'رب' کہتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں اُس کی کُکلی میں سمایا ہوں۔ وہاں دوئی نہیں ہے۔ بہت زیادہ قربت ہے۔ جب میں اُسے رب کہتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں اُس کے احسان کا اعتراف کر رہا ہوں بغیر الفاظ ادا کیے...... میں اُس کا احسان مند ہوں کہ وہ مجھے پال رہا ہے اور یہ "پالنا" صرف کھانا فراہم کرنے تک محدود نہیں بلکہ بہت وسیع المعانی ہے۔ وہ میری حفاظت کر کے بھی مجھے پال رہا ہے۔ وہ اپنی رحمت کے صدقہ میرے سفر کو مختصر کر دیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بھی پالنا ہے۔ وہ مجھے توفیق دیتا ہے کہ میں گفتگو کر لوں تو یہ بھی پالنا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ، کوئی پہلو میں لے لوں...... وہ ہر ہر طریقے سے مجھے پال رہا ہے۔

اس لیے جب میں اللہ کو "رب" کہتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں اُس کے احسان کا اعتراف کر رہا ہوں۔ اُس کی احسان شناسی کر رہا ہوں۔ احسان مندی کا یہ احساس اور اعتراف مجھے رب تعالیٰ کے قریب کر دیتا ہے۔ اس لیے میں اُسے 'اللہ' نہیں بلکہ 'رب' کہتا ہوں۔"

جب انسان کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ میرا رب میری ضرور سنے گا اس لیے نہیں کہ میں نے کوئی وظیفہ پڑھا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ میرا رب ہے اور اُس کی شان ربوبیت ہے کہ وہ اپنے گناہ گار ترین بندے کی بھی سن لیتا ہے۔ اُس کی شانِ ربوبیت پر یقین میرے ایمان کو پختہ کرے گا اور تب میں اُسے شام کو ایک Letter لکھوں گا "یارب! مجھے رات نو بجے سے پہلے اتنے پیسے چاہئیں تو مجھے دے دے۔" یہ مان کہ میں اپنی Application ایک ایسے رب کو دے رہا ہوں جو دُعاؤں کو سنتا اور فریاد کو پورا کرتا ہے۔ جو مجھے پالتا ہے۔ دُعا کی قبولیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ مان کہ جب میں اُسے رب جان کر یقین سے پکاروں گا تو وہ میری دُعا پوری کرے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی انجیل متی میں فرمایا تھا "جب دُعا مانگو تو یقین سے مانگو کہ اللہ پوری کرے گا۔ یہ نہ کہو کہ تُو چاہے تو دے اور چاہے تو نہ دے۔ بلکہ مان سے کہو تُو مجھے دے۔" آپ نے دیکھا ہو گا کہ بچہ بڑے مان سے اپنے باپ سے کہتا ہے مجھے فلاں کھلونا ابھی لے کر دیں۔ اس اصرار کے پیچھے یہ یقین مضمر ہوتا ہے کہ میرا باپ کھلونا لے کر دینے پر قادر ہے۔ اُس کا یہ اصرار ضد اور گستاخی نہیں بلکہ مان ہوتا ہے۔ آپ بھی اپنے رب تعالیٰ سے اسی مان سے مانگیے کہ وہ میرا رب ہے، مجھے پالتا

ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی پالنے والا نہیں۔ جب اُس کے سوا کوئی پالنے والا ہے ہی نہیں تو میں کس کے پاس جاؤں۔ اس لیے بے شک آپ اپنے رب سے کہہ دیا کیجیے "میں تو تیرے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ بس تو مجھے یہ دے دے۔ یا پھر مجھے تو کوئی اور رب بتا جس کے پاس میں جاؤں کیوں کہ میں تو صرف تجھے جانتا ہوں۔" جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "میں تو صرف تجھے جانتا ہوں" تو یہ مان ہے۔

لوگوں کو تو میں نے یہ تک کہتے بھی دیکھا "یا رب! یہ چیز مجھے دے ابھی...... بڑا رب بنا پھرتا ہے۔"

یہ گستاخی نہیں بلکہ مان ہے اُس بندہ کا اپنے رب پر کیوں کہ وہ اپنے رب کے ساتھ ایسا رشتہ جوڑ چکا کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ میرا رب مجھے نہ دے۔ اس لیے وہ مان کے ساتھ رب کو پکارتا ہے اور رب اس مان کو رکھتا ہے۔ میں اس بات کی Guarantee دیتا ہوں۔ آپ بھی اس انداز میں مانگ کر دیکھیے۔ پکڑیے اُس کا دامن اور اُس سے کہیے:-

"دے مجھے۔ ابھی چاہیے مجھے اسی وقت۔"

وہ رب ضرور عطا کرتا ہے۔ دُعا کا یہ طریقہ اپنا لیجیے۔ رب آپ کو ضرور نوازے گا۔ مت جائیے آپ کسی کے پاس دُعا کرانے کے لیے کیوں کہ آپ بھی اللہ کو اُتنے ہی عزیز ہیں جتنا کوئی دوسرا بندہ۔ آپ کیوں کسی کے در پر جائیں دُعا کروانے کے لیے۔ اپنے رب کو کیوں نہیں پکڑتے؟ رب کو پکڑیے وہ ضرور آپ کی دعائیں سنے گا۔

دُعا کی قبولیت میں توکل کی اہمیت

دُعا کسی غیر اللہ سے نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ یہ شرک ہے۔ ہمارا مالک و آقا رب کریم ہے اور ایسا رب جو سب کی سنتا ہے بلکہ گناہوں میں لتھڑے ہوئے لوگوں کی دُعائیں وہ جلد قبول کر لیتا ہے۔ اُسے وہ بندے بہت عزیز ہیں جو گناہ سرزد ہو جانے کے بعد توبہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح دُعا کی قبولیت میں جو چیز زیادہ Role play کرتی ہے وہ ''توکل'' ہے۔ جتنا زیادہ وہ بندے کا رب پر توکل ہوتا ہے اُتنی ہی جلد دُعا قبول ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ شاید توکل اجازت نہیں دیتا کہ انسان اللہ سے دُعا کرے۔ حالانکہ معاملہ اس سے قطعی برعکس ہے۔ توکل سے انسان دُعا کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے کیوں کہ توکل کے معنی ہی یہ ہیں کہ میرے لیے میرا رب ہی کافی ہے۔ میرا رب ہی میرا حاجت روا ہے۔ میری پیدائش سے لے کر اب تک وہ میری ضروریات پوری کر رہا ہے۔ مانگنے پر بھی اور بغیر مانگے بھی۔ اُمید و آس کی یہ کیفیت ہی دراصل توکل ہے۔ جب ہم پوری اُمید اور توکل کے ساتھ دعا مانگتے ہیں۔ مکمل یقین کے ساتھ دُعا کرتے ہیں تو دُعا جلد قبول ہوتی ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگ دُعا مانگتے ہوئے یہ غلطی کر جاتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں ''یارب! تو بڑا غفور الرحیم ہے۔ تو کریم ہے تیرے خزانے بے پایاں ہیں۔ تو چاہے تو مجھے عطا کر دے اور چاہے تو عطا نہ کر۔''

یہیں انسان غلطی کر جاتا ہے۔ جب کہ ایک متوکل انسان جب دُعا کرتا ہے تو وہ بھرپور یقین کے ساتھ کہتا ہے ''تو بس مجھے یہ چیز عطا کر دے۔'' وہ ''چاہے'' کا لفظ استعمال نہیں کرتا کیوں کہ یہ اُمید و بیم کی کیفیت ہے۔

دُعا مانگتے ہوئے یہ الفاظ استعمال نہ کیے جائیں کہ ''تو چاہے تو عطا کر دے'' بلکہ مکمل یقین کے ساتھ اُس سے مانگیں اور اگر ہمیں اللہ تعالیٰ یہ توفیق عطا فرما دے تو ہم چپکے سے اُسے کہا کریں۔

''یا باری تعالیٰ! تو بچپن سے اب تک مجھے بڑے خوب صورت طریقے سے پالتا رہا اور یہ میرا یقین اور ایمان ہے کہ تو آیندہ بھی مجھے پالے گا۔ تو اپنے رب ہونے کے صدقے مجھے یہ چیز عطا کر دے گا۔''

اب انسان اپنے رب تعالیٰ سے درخواست تو کر رہا ہے لیکن اُس کے دل میں یقین ہے کہ ہمیشہ عطا کرنے والا میرا رب اس بار بھی مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ یقین و بے یقینی کی کیفیت میں مانگی گئی دُعائیں رنگ

نہیں لاتیں۔ جب دُعا کی قبولیت میں تاخیر ہو جاتی ہے تب ہم مایوس ہونے لگتے ہیں۔ شیطان کے ساتھ کیا قصہ ہوا؟ جب وہ راندۂ درگار ہوا تو مایوس ہو گیا۔ اسی لیے شیطان کے لیے ابلیس کا لفظ استعمال ہوا جس کے معنی "مایوس" کے ہیں۔

اُس کو ابلیس اس لیے کہا گیا کہ جب اُس نے گستاخی کی اور رب تعالیٰ کے حضور حجت کی اور تکبر کیا تو اُسے سزا حجت کرنے پر نہیں بلکہ تکبر کرنے پر ملی تھی۔ وہ ابلیس اس بات پر ہوا کہ راندۂ درگاہ ہونے پر وہ رب کی رحمت سے مایوس ہوا اور اُس نے رب تعالیٰ کے حضور معافی نہیں مانگی۔ توبہ نہیں کی کہ یا رب! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے تو مجھے معاف فرما دے۔

عجیب بات یہ ہے کہ شیطان نے توبہ تو نہ کی لیکن ایک دُعا اُس نے ضرور مانگی "یا باری تعالیٰ! مجھے قیامت تک کی مہلت دے دے۔" اور رب تعالیٰ کی شان کریمی دیکھیے کہ اُس راندۂ درگاہ کی دُعا بھی اُس نے رد نہیں کی اور اُس کو مہلت دے دی۔ یہ بڑا باریک نکتہ ہے۔ ذرا سوچیے کہ رب تعالیٰ تو شیطان تک کی دُعا رد نہیں کرتا پھر نیک بندوں کی دُعائیں کیوں کر قبول نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعائیں نہیں ٹالتا۔ فرق یہ ہے کہ نیک انسان کی نظر اپنی عمر پر رہتی ہے کہ گزری عمر میں رب تعالیٰ نے مجھ پر کیا کیا احسان کیا۔ وہ دیکھتا ہے کہ اُس کی زندگی میں بہت سی چیزیں اُسے بن مانگے ملی ہیں۔ تب وہ انسان سوچتا ہے کہ وہ رب جس نے مجھے بن مانگے اتنا کچھ عطا کیا ہے اگر میں اُس رب سے کچھ مانگوں گا تو وہ "یقیناً" مجھے عطا کرے گا۔ یہی سوچ کر وہ "یقین" کے ساتھ دوسروں کے لیے دعا کرتا ہے۔

"یا باری تعالیٰ! یہ تیرا بندہ میرے پاس اس گمان کے ساتھ آیا ہے کہ تو میری دُعا قبول کرے گا۔ یا اللہ! تو اس کے گمان کو پورا کر دے۔ اس پر رحم کر اور اس کا کام کر دے۔"

وہ نیک شخص یا صاحب دُعا یہ نہیں کہتا کہ یا اللہ! تو چاہے تو یہ کام کر دے۔ کیوں کہ ایسا کہنے سے ایمان ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے۔ اب آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہو گا کہ ایمان کیسے ڈانواں ڈول ہو گیا؟ وہ یوں کہ آپ نے سوچا کہ رب تعالیٰ میری دُعا تو سنتا نہیں لیکن اس صاحب دُعا کی دعا قبول کر لیتا ہے۔ یہ بڑا عجیب اور باریک نکتہ ہے۔

اگر میں اپنے والد سے کوئی کام کروانا چاہتا ہوں اور والد کے دوست کے پاس جا کر درخواست کرتا ہوں کہ آپ بحیثیت دوست میرے والد سے کہیں کہ وہ میرا کام کر دیں..... میرا یہ رویہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ میرے اور والد کے درمیان جو رشتہ ہے مجھے اس کی مضبوطی پر شک ہے۔

جب رب اور بندہ کے تعلق کی بات ہوتی ہے تو یہ بندگی کی شرائط کے خلاف ہے کہ اپنے اور رب تعالیٰ کے رشتہ پر شک کیا جائے۔ رب اور بندہ کا رشتہ آقا و غلام کا رشتہ ہے۔ رب تعالیٰ تو بطور آقا تمام شرائط پر نہ صرف پورا اُترتا ہے بلکہ Beyond call of duty آقا ہونے کا حق ادا کرتا ہے۔ لیکن ہم بندگی کی شرائط کا حق ادا نہیں کر پاتے اور بندگی کی شرائط کو اُس وقت توڑ دیتے ہیں جب اُس کے حضور سفارشوں کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

انسانی دماغ کے تین Level ہیں۔

1. Conscious mind
2. Subconscious mind
3. Unconscious mind

Conscious mind دُعا کرتا ہے اور وہ دُعا Subconscious mind میں Shift ہو جاتی ہے۔ وہ Subconscious mind اُس وقت تک دُعا کرتا رہتا ہے جب تک دُعا قبول نہیں ہو جاتی۔ یہ جو ہمارے اندر دُعا کرنے کے بعد ایک سکون کی کیفیت در آتی ہے اس کے پیچھے دراصل Subconscious mind میں ہونے والی دُعا ہی ہوتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہمارے ذہن میں ایک سکون اور تسلی پیدا ہو جاتی ہے۔ ذہن میں یہ شک رہنا کہ نہ جانے رب تعالیٰ دُعا قبول بھی کرے گا یا نہیں۔ یہ بندگی کی شرائط کے خلاف ہے۔ بندگی کی شرائط اور تقاضے اس مثال سے واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک بار ابو بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید نے یہ دیکھ کر کہ پیرانہ سالی میں بھی اُنھیں اپنے کام خود کرنا پڑتے ہیں اُن کی خدمت میں ایک بہت اچھا غلام پیش کیا۔ حضرت ابو بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیوں کہ وہ تھا ہی اس قابل۔

اُنھوں نے غلام سے پوچھا "تمھارا نام کیا ہے؟"

وہ بولا "میرا کوئی نام نہیں ہے۔"

حضرت ابو بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا "اچھا یہ بتا دو کہ تم کس نام سے پکارا جانا پسند کرو گے؟"

وہ بولا "ہر اُس نام سے جس سے آپ پکارنا پسند کریں۔"

پوچھا "تمھیں کھانے میں کیا پسند ہے۔"

غلام بولا "ہر وہ چیز جو آپ مجھے کھلانا چاہیں۔"

حضرت ابو بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ "کیا پہننا پسند کرتے ہو؟"

غلام "ہر وہ لباس جو آپ پہنانا چاہیں۔"

حضرت ابو بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ "سوتے کب ہو؟"

غلام "جب آپ سونے کی اجازت دے دیں۔"

حضرت ابو بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ "تمھاری اپنی بھی کوئی مرضی ہے؟"

غلام "حضور! میں تو آپ کا غلام ہوں۔ غلام کی کیا مرضی ہے؟"

یہ سنتے ہی حضرت ابو بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آنے پر لوگوں نے استفسار کیا تو اُنھوں نے جواب دیا "مجھے خیال آیا کہ یہ غلام اپنے جیسے ایک انسان کا غلام ہے لیکن اس کی بندگی کا یہ

عالم ہے کہ نہ اس کا کوئی نام ہے نہ کھانے پینے میں کوئی پسند، نہ سونے، جاگنے اور پہننے میں کوئی مرضی۔ یہ ہر چیز اور معاملہ میں اپنے مالک اور آقا کی مرضی کے تابع ہے۔ میں اپنے رب تعالیٰ کا کیسا غلام ہوں جو آقاؤں کے آقا کا غلام ہے اور پھر بھی اپنی مرضی کرتا ہے۔"

بندگی کا مقصد تو Total submission اور Total surrender ہے۔ جس کے بعد نہ اپنی کوئی مرضی ہے نہ ارادہ، خواہش یا تمنا۔ سب چیزیں آقا کی مرضی کے ماتحت ہو جاتی ہیں۔ انسان Total surrender میں اُس وقت جائے گا جب اُس کے اندر یہ یقین ہو کہ میرا آقا و مالک All time powerful ہے اور مجھے ہر حال میں Look after کرے گا۔

"توکل" کو دو لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ توکل نام ہے بندگی کا اور بندگی نام ہے Total submission کا۔ Total submission کے ذریعے بندہ Total surrender تک جا پہنچتا ہے۔

دُعا کی قبولیت کی بنیادی شرط یہی ہے کہ انسان نہ صرف پُراُمید رہے بلکہ پُر یقین رہے کہ میرا رب ضرور میری دعا قبول کرے گا۔ پھر یقیناً رب تعالیٰ ضرور دُعا پوری کرے گا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ دُعا میں اگر ہم روز ایک ہی جیسے الفاظ دہراتے رہیں تو کچھ عرصہ بعد یوں لگے گا کہ جیسے ہم رٹے رٹائے الفاظ عادتاً ادا کر رہے ہیں اور ہمارا ذہن کہیں اور ہے۔ تجربہ سے یہی پتا چلا ہے کہ ایسی دُعائیں عموماً کم قبول ہوتی ہیں۔

قرآن پاک میں مختلف انبیا سے منسوب دُعائیں مذکور ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ دُعائیں اگر ہم کریں تو جلد قبول ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

ہوتا یہ ہے کہ مثال کے طور پر ہم مشکل وقت میں ہیں اور ہمارے ذہن میں ایک دم وہ دُعا آتی ہے جو حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں کی تھی...... لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔

ہم سوچتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کو اس دُعا کے صدقہ مصیبت سے نجات مل گئی تھی۔ لہٰذا ہمیں بھی مشکل اور تکلیف سے رہائی مل جائے گی۔ دُعا کے وہ مخصوص الفاظ ادا کرتے ہی ہمارے ذہن میں حضرت یونس علیہ السلام کے قصے کی فلم چل پڑے گی اور ہم زیادہ توجہ اور دھیان سے دُعا کریں گے۔ پھر ہمارے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے گا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی دُعا قبول ہو گئی تھی تو ہماری دُعا بھی قبول ہو جائے گی۔ پیغمبروں کی مانگی ہوئی دُعائیں جب ہم لوگ مانگتے ہیں تو وہ اس لیے جلدی قبول ہو جاتی ہے کیوں کہ وہ دُعائیں مانگتے ہوئے ہم زیادہ یک سو ہو جاتے ہیں۔ ماضی اور پوری Analogy ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ ہمارے اندر یہ یقین اور اُمید پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اس وقت دُعا قبول ہو گئی تھی تو اب ہماری بھی دُعا پوری ہو جائے گی۔ یوں دُعا کی قبولیت کا یقین ہمارے اندر اُتر آتا ہے۔

اب یہ سوال کہ دُعا کیسے مانگی جانی چاہیے؟

جب ہم طویل دُعا مانگتے ہیں تو ہماری توجہ بٹ جاتی ہے۔ Concentration کا وہ Level نہیں رہتا جو دُعا کی قبولیت کے لیے ضروری ہے۔ لہٰذا اگر ہم مختصر اور جامع دُعا کریں تو ہم پوری توجہ سے الفاظ ادا

کر سکیں گے۔ مثال کے طور پر قرآن پاک میں ایک مختصر لیکن جامع دُعا بتائی گئی ہے:۔

"اے ہمارے رب! ہماری دُنیا بھی بہتر کر دے اور آخرت بھی اچھی کر دے اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا۔" (سورۃ البقرہ:201)

یہ بہت Comprehensive دُعا ہے کہ دُنیا بھی اچھی کر دے اور آخرت بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دُنیا کی زندگی آخرت کی زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ اس بات پر بہت سے لوگ چونکتے ہیں کیوں کہ عموماً سننے میں تو یہی آتا ہے کہ آخرت کی زندگی زیادہ اہم ہے کیوں کہ وہ دائمی و ابدی ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم اس دُنیا میں اچھی طرح رہتے ہیں اور اس دُنیا میں ہمارے اعمال اچھے ہیں تو آخرت بھی اچھی ہو جائے گی۔ اگر ہم نے اس دُنیاوی زندگی کو اہمیت نہ دی اور روا روی میں عمر بتا دی تو اُخروی زندگی بھی اچھی نہ ہو گی۔ اس لیے آخرت کی ابدی زندگی کی بنیاد اس فانی زندگی پر ہے۔

اب کیا کیا جائے کہ یہ دُنیاوی زندگی خوب صورت ہو جائے؟ خوب صورتی سے میری مراد پُر آسائش زندگی، محلات اور فاخرانہ لباس نہیں ہے۔ خوب صورت وہ زندگی ہے جو آپ ﷺ نے گزاری۔ وہ پُر آسائش تو نہ تھی لیکن خوب صورت بے پناہ تھی۔ یہ اُس خوب صورت زندگی ہی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ لوگ جو آپ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے وہ بھی نہ صرف آپ ﷺ کی عظمت کے اعتراف اور ستائش پر مجبور ہیں بلکہ آپ ﷺ کا اسم گرامی دُنیا کے سو بہترین لوگوں میں سر فہرست رکھنے پر بھی مجبور ہیں۔ یہ خوب صورت زندگی ہی کا کرشمہ ہے ورنہ پُر آسائش زندگی تو جولیس سیزر اور ہرکولیس نے بھی گزاری لیکن اُن میں سے کسی کا نام اُن 100 بہترین لوگوں میں شمار نہ ہوا۔ خوب صورت وہ زندگی ہے جو گزاریں تو غیر مسلم بھی سر فہرست نام لکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

خوب صورت وہ زندگی ہے جو دوسروں کے لیے گزاری جائے۔ خوب صورت زندگی کا مفہوم کچھ یوں بھی واضح ہو جائے گا کہ مثال کے طور پر آپ آفس کے لیے نکلتے ہیں۔ روڈ پر ایک شخص آپ کو اوورٹیک (Overtake) کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ بجائے چڑ چڑے پن کا مظاہرہ کرنے کے اپنا حق چھوڑ کر ہاتھ کے اشارہ سے اُسے آگے جانے کا کہتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر اُس شخص کی طبیعت میں بھی بشاشت آئے گی اور آپ کی زندگی میں بھی خوش گواریت پیدا ہو گی۔ مزید وہ شخص آپ کو یاد رکھے گا اور سوچے گا کہ میرا حق نہیں تھا پھر بھی اس انسان نے مجھے خوش دلی سے آگے بڑھنے کی اجازت دی۔

اسی طرح آپ قطار میں کھڑے ہیں۔ ایک شخص کی جھنجلائی ہوئی آواز آپ کی سماعتوں میں پڑتی ہے کہ یہ قطار Move کیوں نہیں کرتی؟ آپ اُس شخص کی بے چینی بھانپ لیتے ہیں اور مسکراتے ہوئے اُسے Offer کرتے ہیں مجھے اتنی جلدی نہیں۔ آپ میری جگہ پر آجایئے۔ میں پیچھے آپ کی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ آپ اُس شخص کو پیار سے شولڈر سے پکڑ کر اپنی جگہ لا کھڑا کرتے ہیں۔ اب اس عمل سے آپ کے اندر بھی بشاشت آئے گی اور وہ شخص بھی خوش ہو جائے گا۔ آپ کے چہرے کی مسکراہٹ اُسے بھی آسودگی اور خوش گواریت کا احساس عطا کرے گی۔ یاد رکھیں کہ مسکراہٹ محض 32 دانتوں کی نمائش نہیں ہوتی بلکہ مسکراہٹ

آنکھوں کی جگمگاہٹ کا نام ہے۔ جب آپ مسکراتے ہیں تو اندر کی خوشی آپ کے چہرے پر جھلکتی ہے۔

جب آپ اپنے آپ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اپنے دُکھوں کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپا لیتے ہیں اور دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں تو یہ ہے خوب صورت زندگی۔

آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ دیکھیے۔

کہاں آپ ﷺ نے اپنے لیے زندگی گزاری؟ کہاں خود کو دوسروں پر ترجیح دی؟ کہیں بھی ایسا نہیں کیا۔ کوئی ایک بھی ایسی مثال پوری حیاتِ طیبہ میں نظر نہیں آتی۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ دوسروں کے لیے دُکھ سہے۔ سدا دوسروں کا ہی بھلا کیا۔ یہ تھی خوب صورت زندگی۔ اگر ہم نے یہ زندگی خوب صورت بنالی تو آخرت کی زندگی خود بخود خوب صورت ہو جائے گی۔

ایک کمال کی چیز ہے کہ آپ ﷺ کی تمام عمر کی دُعاؤں کو اگر ہم دیکھیں تو کہیں کوئی دُنیاوی دُعا نظر نہیں آتی۔ اور یہ کیسے کمال کی بات ہے کہ یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ آپ ﷺ جنت میں سب سے پہلے داخل کیے جائیں گے۔ جنت Guaranteed تھی۔ پھر بھی آپ ﷺ تمام عمر رب تعالیٰ سے معافی مانگتے رہے۔ اور ہم ذرا اپنی دُعائیں دیکھیں تو ان میں نہ کہیں مغفرت ہے اور نہ ہی توبہ۔ ان میں تو دُنیاوی فرمائشیں ہیں اور زندگی کی آسائشوں کی دُعائیں ہیں۔

بہر حال دُعا وہی ہے جو پورے یقین اور توکل کے ساتھ مانگی جائے ایسی دُعا یقینی طور پر قبول ہوگی۔

دوسروں کے پاس جانا کہ وہ میرے لیے رب کے حضور دُعا کریں یہ گویا رب تعالیٰ پر بھروسا کی کمی ہے۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ صرف میرا رب ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ میں کوئی Claim کر رہا ہوں کہ کوئی اور میرے رب کو اپنا نہ مانے۔ یہ تو دراصل ایک بہت مضبوط Sense of belonging ہے کہ ''وہ میرا ہے۔'' جب آپ کے اندر یہ احساس اور یقین پیدا ہو جائے تو پھر یہ یقین خود بخود پیدا ہو جائے گا کہ وہ میرا رب ہے۔ اُس کے خزانے بے پایاں اور بے حساب ہیں۔ اُسے دیتے وقت کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو مالکِ کل اور قادرِ مطلق ہے۔ جب یہ یقین دل میں پیدا ہو گیا (یاد رکھیے یہ Conscious یقین نہیں ہوتا بلکہ یہ یقین تو دل میں آ گیا ہے) تب جو زبان سے نکلو رب تعالیٰ پورا کرتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ دُعا کی قبولیت چاہتے ہیں تو رب تعالیٰ کے ساتھ ایک Sense of belonging پیدا کر لیجیے کہ وہ صرف میرا ہے۔ دُعائیں قبول ہونے لگیں گی۔ وہاں تو پھر یہ مقام آ جایا کرتا ہے کہ کاغذ قلم اُٹھایا اور لکھا ''میرے رب! فلاں ضرورت آن پڑی ہے اور فلاں تاریخ تک پوری کرنی ہے تو مہربانی فرما اور وسائل عطا فرما دے۔'' پھر انسان وہ Letter پوسٹ (Post) کر دیتا ہے اور جواب کا انتظار نہیں کرتا بلکہ یقین رکھتا ہے کہ مقررہ تاریخ تک وسائل ضرور مہیا ہو جائیں گے۔

یہ یقین رفتہ رفتہ ''مان'' میں تبدیل ہونے لگتا ہے.... یہ مان کہ وہ رب میرا آقا و مالک ہے۔ جب یہ مان پیدا ہو گیا تو پھر بندہ دُعا کے سارے الفاظ اور درخواست بھول گیا اور کہنے لگا۔

"اوئے ربا! تو دیکھدا نہیں کہ میری ایہہ ضرورت اے۔ پوری کر۔"

یہ گستاخی نہیں...... ماں ہے اور رب بھی اس انداز کو سمجھتا ہے۔ اس لیے آپ ماں کے اس Level پر چلے جایئے۔ دُعائیں فوراً قبول ہونے لگیں گی۔

میں آج پھر عرض کرتا ہوں کہ مت جایئے کسی کے پاس دُعائیں کروانے۔ رب آپ کا ہے، وہ ضرور آپ کی دُعائیں سنے گا۔ بس اُس کے ساتھ توکل کا رشتہ قائم کر لیجیے اور جان لیجیے کہ رب آپ کا ہے۔ رب کے سارے خزانے آپ کے ہیں...... رب کی کائنات آپ کی ہے کیوں کہ ان خزانوں اور کائنات کا مالک آپ کا ہے۔

عرب ممالک میں
تبدیلی کا رجحان/بسم اللہ کے "ب" کی وضاحت

سوال: آج کل عرب ممالک میں تبدیلی کا جو رُجحان چل رہا ہے اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب: اس نشست میں ہم فروعی اور سیاسی معاملات سے دُور رہنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ Controversial معاملات کی وجہ سے کسی کا دل نہ دُکھے اور عقائد سے ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔ بنیادی طور پر حکم بھی یہی ہے کہ ہم حتیٰ کہ غیر مسلموں اور کفار تک کے عقائد کو بُرا نہ کہیں۔ کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے اُن کے مذہبی عقائد مجروح ہوتے ہوں۔ حکم یہ ہے کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا احترام کیا جائے اور اُن کی حفاظت کی جائے۔ مسلمان صرف اُس وقت غیر مسلموں کے خلاف کھڑا ہوتا ہے جب وہ آمادۂ جنگ ہوں۔

یہاں شاید یہ سوال ذہن میں پیدا ہو کہ اگر ہم غیر مسلموں کو یہ نہ بتائیں کہ صحیح عقائد کیا ہیں تو انھیں راہِ راست کیسے معلوم ہوگا۔ اس سلسلے میں اگر یہ دیکھ لیا جائے کہ کون لوگ اسلام پھیلانے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے تو جواب مل جائے گا۔ آپ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد کے 12 سالوں میں بہت کم لوگ مسلمان ہو پائے تھے۔ روایات کے مطابق ہجرت کے وقت 101 یا 110 لوگ مسلمان تھے۔ لیکن مدینہ منورہ میں گزرنے والے دس سالوں میں باوجود غزوات اور شہادتوں کے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ یہاں تک کہ فتح مکہ کے وقت دس ہزار مسلمان آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ اسلام اتنی تیزی سے اُسی وقت پھیلا جب مسلمانوں نے بہترین طرزِ حیات اختیار کرلیا۔ میری نظر میں اسلام مذہب سے زیادہ ایک کلچر ہے جس میں بنیاد توحید اور اللہ کی غلامی ہے۔ ان دو چیزوں کو سامنے رکھ کر مسلمان زندگی گزارتا ہے۔ رب کی غلامی کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر وہ کام کیا جائے جس کا رب نے حکم دیا ہے اور ہر اُس کام سے رُک جائیں جس سے اُس نے منع کیا ہے۔ یوں ایک چکر Develop ہوتا ہے۔

برصغیر میں مسلمانوں نے اسلام کو پھیلایا ہے۔ انھوں نے غیر مسلموں کو تضحیک کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ انھوں نے اپنی زندگی اور رویہ ایسا رکھا کہ لوگ اُن کی طرف اس طرح کھنچے چلے گئے جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ جب لوگ فقیر کے قریب آتے ہیں تو اُس کی طرزِ زندگی کو خواہ مخواہ Adopt کر لیتے ہیں۔ یوں اسلام

میں Conversion بہت تیزی سے ہوتی ہے۔

اس کے برعکس جب ہم محض زبان سے تبلیغ کرتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ تمھارے مذہب میں فلاں غلطیاں اور تمھارے عقائد میں فلاں فلاں خرابیاں ہیں۔ اس سے اُن میں Resistance پیدا ہوتی ہے۔ یوں غیر مسلم ایسے مبلغین سے دُور بھاگنے لگتے ہیں۔

اگرچہ اس نشست میں فروعی و سیاسی باتوں کو Discuss کرنے سے گریز کیا جاتا ہے لیکن چونکہ آپ نے سوال کر دیا ہے تو گزارش کرتا ہوں کہ مسلمان معاملات کا جذباتی تجزیہ نہیں کرتا۔ بلکہ مسلمان بہت ٹھنڈے دل سے معاملات کو بہت گہرائی سے دیکھتا ہے کیوں کہ مومن معاملات کو رب تعالیٰ کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے۔ رب تعالیٰ میں سطحیت نہیں بلکہ بہت گہرائی ہے۔ لہٰذا ہمارا کوئی قومی یا بین الاقوامی معاملہ ہو ہم سطحی نظر سے نہیں بلکہ نہایت گہرائی سے اس کا جائزہ لیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُمت مسلمہ کے دشمن دراصل دوست کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔

ایک حقیقی واقعہ میرے علم میں آیا تھا جب میں گورنمنٹ کے لیے کام کر رہا تھا۔ بریفنگ کے دوران ایک صاحب نے تحقیق پر مبنی ایک واقعہ بیان کیا کہ مصر میں Mid 60s میں ایک فیصل نامی صاحب پبلک (Public) میں بطور سوداگر متعارف ہوئے اور ہر محفل میں اسرائیل اور یہودیوں کے خلاف بہت شدت سے جذباتی باتیں کرنے لگے۔ وہ کہا کرتے کہ میری زندگی کا ایک ہی Mission ہے کہ میں اسرائیلیوں اور یہودیوں کو تباہ و برباد ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ رفتہ رفتہ اُن صاحب کا ذکر مصر کے مختلف حلقوں میں ہونے لگا۔ وہ صاحب بہت Frequently دعوتیں کرتے اور اُن میں پیسہ پانی کی طرح بہاتے۔ مؤقف یہ ہوتا کہ میں اپنی دولت اُمت مسلمہ کے لیے خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ Gradually وہ فوج کی سینئر کمانڈ تک جا پہنچے اور وہاں بھی یہودیوں اور اسرائیلیوں کے خلاف کھل کر باتیں کیا کرتے۔ وہ فوج کو دل کھول کر Donation (عطیات) بھی دیتے۔ حتیٰ کہ وہ وقت بھی آ گیا جب Syrian اور Egyptian جنرلوں کے ساتھ اُن کے تعلقات اُستوار ہو گئے اور وہ ایک جذباتی قسم کے محبِ وطن کے طور پر جانے لگے۔ وہ اُن جنرلوں سے کہا کرتے کہ اگر اسرائیل ہم پر حملہ کرے گا تو منہ کی کھائے گا۔ ایک روز General اُن صاحب کو Golan Heights پر لے گئے اور وہاں کھڑے ہو کر دکھایا کہ یہ اسرائیل کے خلاف ہمارے فلاں فلاں Defences ہیں۔ فیصل نے وہ تمام معلومات اور Defences اسرائیل کو Pass on کر دیئے۔ 1967ء میں جب اسرائیل نے حملہ کیا تو انھوں نے ان معلومات سے فائدہ اُٹھایا اور چند گھنٹوں میں انھوں نے Golan Heights شام سے چھین لیں۔ حالانکہ مصری اور شام کی افواج کو یقین تھا کہ اسرائیل کئی ماہ بھی ٹکریں مارتا رہے تو یہاں پہنچ نہیں سکے گا۔ بعد میں تحقیق سے پتا چلا کہ وہ صاحب بنیادی طور پر اسرائیلی تھے اور اسرائیلی انٹیلی جنس فورس (Israelian Intelligence Force) نے انھیں جاسوس کے طور پر مصر میں Induct کیا تھا۔

یہ واقعہ سنانے کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم سطحی طور پر معاملات کو لیتے ہیں تو دھوکا کھا جاتے ہیں۔ دشمن بہت سے روپ دھار کر آتا ہے۔ مسلمان کبھی کسی چیز کا سطحی جائزہ نہیں لے گا بلکہ گہرائی سے معاملات کو دیکھے گا۔

عرب میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ ایک واقعہ شاید ہمیں کچھ احساس دلا سکے۔ ہمارے اردگرد بہت سے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کے حوالے سے جذباتی ہونے کی بجائے اگر ہم غور سے حالات کا تجزیہ کر لیا کریں تو حقائق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

گزشتہ جمعہ کے روز میرے پاس کچھ صحافی آئے ہوئے تھے۔ یہ وہ Leading لوگ ہوتے ہیں جو لوگوں کی Vision کو Form کرتے ہیں۔ ریمنڈ ڈیوس کا قصہ چھڑا تو میں نے عرض کیا:۔

''جس طرح ہم نے اسے جذباتی رنگ میں لیا ہے اُس سے بہت سے حقائق چھپ گئے ہیں۔ اگر ہم اسے تحمل مزاجی اور ٹھنڈے دماغ سے دیکھتے تو شاید بہت سے حقائق سامنے آتے جس سے قوم کا بھلا ہو جاتا۔ لیکن ہم اپنے جذباتی رویوں کی وجہ سے اصل حقائق تک جا ہی نہیں سکے۔ میری تو دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے اصل حقائق کو ہمارے سامنے جلد لے آیا کرے۔ ہم پر یہ مہربانی فرما دے کہ ہم جذبات میں بہنے کی بجائے حقائق پر نظر رکھیں اور ملک و قوم کے لیے ایسا بہتر ردِعمل ظاہر کر پائیں جس سے ہمارا بھلا ہو جائے۔''

ہم نے ایسے ہی جذباتی رویے کا مظاہرہ مشرقی پاکستان کے سانحہ کے وقت کیا تھا۔ اگر ہم جذباتی نہ ہوتے تو شاید یہ سانحہ نہ ہوتا۔

اسی طرح جب گنگا جہاز یہاں اغوا ہو کر آیا تو ہم نے جذباتی ہو کر Indian Intelligence کے لوگوں کو ہیرو بنا دیا۔ کندھوں پر اُٹھایا اور بعد میں کہا کہ وہ انڈین ایجنٹ تھے۔ اور پھر انھیں سزائیں دیں۔

یہ ہمارے جذباتی رویے ہیں جن کی وجہ سے ہمیں بار بار شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امکان یہی ہے کہ ریمنڈ ڈیوس کیس میں بھی ایسے ہی نتائج سامنے آئیں گے۔ جب معاملات کھلیں گے تو قوم پریشان ہوگی کہ ہم نے کیا سمجھا تھا اور نکلا کیا۔

سوال: بسم اللہ کی ''ب'' کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: اگر ہم ذرا سا غور کریں تو قرآن پاک میں ایک چیز دکھائی دیتی ہے۔ قرآن پاک 30 پاروں پر مشتمل ہے۔ پہلے پارے کا آغاز ''الم'' سے ہوتا ہے اور اختتام ''الناس'' پر ہوتا ہے۔ الم سے الناس تک 30 پاروں کا آغاز و اختتام ہے۔ قرآن پاک کے پہلے صفحے پر سورۂ فاتحہ ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنے جسم کو دیکھیں تو پاؤں کی Toe سے کندھوں تک ہمارا جسم Integrated ہے۔ یہ ایک ٹکڑا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے پاؤں، ٹانگیں، ہاتھ، پسلیاں اور دیگر اعضا گھڑ دیے ہیں لیکن سر علیحدہ ہے اور اس جسم کے اوپر ہے۔ سر اور باقی جسم کو گردن کے ذریعے Connect کیا گیا ہے۔ گردن بھی اس لیے ہے کہ سر جسم پر قائم رہے اور کاسہ سر کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو چیز Brain کی صورت میں محفوظ رکھی ہے اس کا تعلق جسم کے ساتھ قائم رہے اور وہ اسے کنٹرول

کرتا ہے۔گویا سر ہمارے جسم کا حصہ ہونے کے باوجود اس کا حصہ نہیں ہے۔اسی طرح سورۂ فاتحہ قرآن پاک کا حصہ ہونے کے باوجود اس کا حصہ نہیں ہے۔جس طرح ہمارے کاسۂ سر میں جو کچھ موجود و محفوظ ہے اگر وہ Damage ہو جائے تو ہمارا جسم مفلوج ہو جاتا ہے۔ ہماری Movement، ہماری Intakes، ہمارے Actions سب کچھ Disturb ہو جاتا ہے۔جس طرح سورۂ یٰسین کے بارے میں آپ ﷺ فرمایا تھا کہ یہ قرآن پاک کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔

''ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل (سورۂ) یٰسین ہے۔'' (جامع ترمذی، حدیث نمبر 2887)

اسی طرح سورۂ فاتحہ کو اگر ہم Examine کریں تو یہ آدھی سورۂ حمد ثنا ہے اور رب تعالیٰ کی تعریف ہے یا رب کا مقام ہے اور بقایا آدھا حصہ اس سورہ کا دُعا پر مشتمل ہے۔ مثلاً ''الحمد للہ رب العالمین'' تو تعریف ہے رب کی۔''مالک یوم الدین'' میں رب تعالیٰ نے اپنے آپ کو Define کر رہا ہے کہ میں کیا ہوں۔تمھارا خالق و مالک ہوں۔تمھارا رب ہوں۔یوں اُس نے اپنے آپ کو انسان کے ساتھ متعارف کرایا۔اس کے بعد اُس نے بتایا کہ میرے اندر کیا صفات ہیں۔

وہ جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی۔ جیسے آپ کا بیٹا اگر سرکش ہو رہا ہو تو آپ اُسے بلا کر کہتے ہیں کہ دیکھو میں تمھارا باپ ہوں۔تم میرے خون سے پیدا ہوئے ہو۔ میں تمھارا Loving father ضرور ہوں لیکن اگر تم راہ راست پر نہیں آئے تو جان لو کہ میں سخت بھی ہوں۔یوں رب تعالیٰ نے پہلے تو یہ بتایا کہ میں تمھارا آقا و مالک ہوں اور رب ہوں اور جس روز تمھارا حساب کتاب لیا جائے گا اُس روز کا بھی شہنشاہ میں ہی ہوں۔ میں ''مالک یوم الدین'' ہوں۔پھر رب تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ میں رحمٰن و رحیم اور کریم ہوں۔میں مہربان ہوں لیکن میں قہار اور جبار بھی ہوں۔پورے قرآن پاک میں اللہ یہی فرماتا ہے کہ میرے بتائے ہوئے راستے پر چلو گے تو انعام پاؤ گے، سرکشی کرو گے تو مجھے قہار و جبار پاؤ گے۔ پورے قرآن پاک میں اُس نے کہیں ترغیب دی ہے تو کہیں تنبیہہ کی ہے۔کہیں انعام کا وعدہ کیا ہے تو کہیں سزا کا خوف دلایا ہے۔سورۂ فاتحہ میں بھی رب تعالیٰ نے اپنے آپ کو Introduce کروا کر اپنی صفات بیان کیں۔پھر اس کے بعد دُعا ہے۔سورۂ فاتحہ کی اصل ہمیں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' سے مل جاتی ہے۔اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی۔سورۂ فاتحہ کے پہلے حصے کا جست ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' میں آ گیا اور ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کا جست ''بسم اللہ'' میں ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے نام سے شروع تو گویا رب کے نام کے ساتھ کام شروع کر کے ہم نے یقین کر لیا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ ٹھیک ہے۔''بسم اللہ'' کا جست لفظ ''ب'' میں اس لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ ''ب'' عربی میں ''ساتھ'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص صرف ''ب'' یعنی ''ساتھ'' کہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ''رب کے ساتھ۔''

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علیؓ نے یہ فرمایا تھا کہ ''میں گھوڑے کے رکاب میں پاؤں رکھنے سے لے کر

گھوڑے پر سوار ہونے تک ایک قرآن پڑھ لیتا ہوں۔'' اس سے مراد یہی تھا کہ وہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔

حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ پورا قرآن پاک سورۂ فاتحہ میں سمایا ہے۔ پوری سورۂ فاتحہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" میں سمائی ہے۔ پوری "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لفظ "ب" میں سمائی ہے۔ اور "ب" نقطے میں سمائی ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ "ب" نقطے میں سمائی ہے تو اس سے مراد "نقطہ" نہیں بلکہ "نکتہ" ہے یعنی عقل کی بات۔ گویا "ب" عقل و فراست میں سمائی ہے۔ اس کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس پر مہربان اور راضی ہوتا ہے اُسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے اور جسے وہ دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے اُسے علم عطا کر دیتا ہے۔ جسے علم عطا ہوتا ہے اُسے عقل مل جاتی ہے اور Essence of Wisdom خود "رب" ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ "ب" نکتے میں سمائی ہے۔

قرآن پاک کی تمام سورتوں کے اثرات انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ ہر سورہ کے اثرات انسانی جسم پر مختلف انداز میں مرتب ہوتے ہیں۔ ایک سورۂ کی فضیلت کا ذکر شاید ہی کسی کتاب میں اس طرح کیا گیا ہو کہ "سورۂ تغابن" کی یہ فضیلت بھی ہے۔

گناہ گار اور دُنیا دار لوگوں سے اللہ کی نافرمانی ہوتی رہتی ہے۔ دانستہ و نادانستہ صغیرہ و کبیرہ گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ Planned mistakes ہم کرتے ہیں تو کبھی Innocent mistakes ہم سے ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں اگر ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرنا چاہتے ہیں یا پھر ہمیں یہ خدشہ لاحق ہو کہ اللہ تعالیٰ میرے اعمال کی وجہ سے مجھے جھٹکا دے رہا ہے ایسی تمام صورتوں میں اگر ہم ہر روز عشاء کی نماز کے بعد سورۂ تغابن پڑھنا شروع کر دیں تو الحمدللہ ہمارے اُوپر سے گناہوں کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔

ہر سورہ کے اثرات ہر انسانی جسم و ذہن پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہر انسان کے جسم اور رُوح کی Chemistry مختلف ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ چیز بھی اہم ہے کہ چوبیس گھنٹے کی کون سی ساعتوں میں کون سی سورہ پڑھی گئی۔ مختلف وقت میں پڑھائی کے اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

کچھ لوگوں کی یادداشت خراب ہو جاتی ہے۔ میں حیران ہوا کہ اس سلسلے میں دُعا میں اکثر جو Suggestion آتی ہے وہ سورۂ آل عمران، سورۂ یوسف اور سورۂ انعام کے حفظ کرنے کی آتی ہے۔ یہ سورتیں یادداشت پر بہت اچھے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ان سے Memory بہت تیز ہو جاتی ہے۔

کچھ لوگ کمزور ہوتے ہیں۔ ذرا کوئی اُونچی آواز میں بات کرے تو اُن کی ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگتی ہیں۔ اُن میں Confidence نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ اگر سورۂ طٰہٰ پڑھیں تو اُن کے دل سے انسانوں کا خوف نکل جاتا ہے۔

سورۂ فاتحہ کے اثرات Multiple ہیں کیوں کہ یہ قرآن پاک کا جسٹ ہے۔ یہ سورہ دشمنوں کے بچاؤ

کے لیے بھی ہے۔ اگر انسان توبہ کر رہا ہے اللہ کے حضور تو سورۂ فاتحہ پڑھ کر توبہ کرنے سے توبہ جلدی قبول ہو جاتی ہے اور انسان گناہوں کی طرف جلدی مائل بھی نہیں ہوتا۔ سورۂ فاتحہ کی اس کے علاوہ بھی بہت زیادہ فضیلت ہے۔

- اگر انسان کسی قسم کے نشے میں مبتلا ہے تو سورۂ فاتحہ پڑھنے سے اُس کی جان نشہ سے چھوٹ جائے گی۔
- سورۂ فاتحہ بیماریوں میں شفا ہے۔
- بہت سی خواتین اپنے شوہر کو قابو میں کرنے کے لیے یہ سورہ پڑھ سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ایک ولی سے میرا خاصا قربت کا تعلق رہا۔ اب وہ انتقال کر چکے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے۔) مجھے کسی زمانے میں موکل دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ میں نے اُن ولی اللہ سے ایک روز یہ سوچ کر Liberty لے لی کہ یہ مجھے اپنا بیٹا کہتے ہیں۔ بس یہی سوچ کر اُن سے درخواست کی کہ آپ مجھے کوئی مؤکل تو عطا کر دیجیے۔ تب اُنھوں نے مجھے ایک لفظ پڑھنے کو دیا۔ بعد میں مجھ پر یہ کھلا کہ وہ لفظ اُس مؤکل کا نام بھی تھا جو غوثِ اعظم کے پاس ہوا کرتا تھا اور یہی لفظ جناب غوثِ اعظم بھی پڑھا کرتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میں سخت بچھے کر زمین پر سویا کرتا تھا۔ عشاء کے بعد جب ابھی میں نے چار پانچ بار ہی وہ لفظ پڑھا تھا کہ مجھے اچانک کچھ جلنے کی Smell آئی اور مؤکل میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اب مجھے کام تو کوئی اُس سے لینا نہ تھا لہٰذا وہ حکم کے انتظار میں کچھ دیر مجھے اور میں اُسے دیکھتا رہا۔ جب اُسے سمجھ آ گئی کہ مجھے اُس سے کوئی کام نہیں تو وہ چل دیا۔ اگلی شب پھر میں نے یہی کیا۔ مؤکل آ گیا اور کافی دیر کسی حکم کے انتظار میں رہنے کے بعد واپس چلا گیا۔ تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ چوتھے دن جب میں نے عشاء کی نماز کے بعد وہ مخصوص لفظ پڑھا تو مؤکل نہیں آیا۔

دو تین ماہ بعد جب میں پاکپتن گیا تو وہاں سے واپسی پر فیصل آباد جاتے ہوئے میں راستے میں اُن ولی اللہ کے گاؤں چلا گیا اور اُنھیں سارا قصہ سنا کر عرض کی کہ مؤکل تین دن کے بعد دوبارہ نہیں آیا۔ اس پر وہ حیران ہوئے اور پھر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھتے رہے۔ تب دریافت کیا کہ کیا آج کل آپ کوئی اور وظیفہ بھی پڑھ رہے ہیں۔

میں نے کہا "جی بسم اللہ الرحمن الرحیم والا وظیفہ شروع کیا ہے۔" کہنے لگے "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہاتھ میں دو دھاری تلوار لیے بیٹھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مؤکل آپ کے قریب آئے۔ اُس کی کیا مجال ہے کہ آپ کے قریب بھی پھٹک جائے۔"

یہ سارا قصہ سنانے کا مقصد یہ بتانا تھا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم میں اتنا جلال ہے کہ کوئی مؤکل اس کے پڑھنے سے قریب نہیں آتا۔

حق کی حضوری

سوال:۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ اپنے سے غائب ہونا گویا حق کی حضوری ہے۔ اس کی وضاحت فرمادیجیے۔

جواب: داتا صاحب رُوحانیت کے کس مقام پر ہیں۔ میں آج تک اس کا اندازہ نہیں کر پایا۔ شاید وہ میرے خیال کی بلندی سے کہیں بلند ہیں۔ جس طرح سائنس کہتی ہے کہ آسمان صرف آپ کی اپنی حدنظر ہے ورنہ اس کا کوئی فزیکل وجود نہیں ہے۔ انسان جب اُوپر آسمان کی طرف جاتا ہے تو آسمان بلندتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ سائنس کی اس تھیوری پر داتا صاحب پورے اُترتے دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی خود جتنی بھی رُوحانی ترقی کرلے جناب داتا گنج بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ رُوحانیت کے مقام پر اُسی قدر اُسے بلند دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا داتا صاحب کے کسی فرمان کو Explain کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ البتہ اتنا ضرور عرض کرسکتا ہوں کہ جب انسان اپنی ذات کو مٹادیتا ہے، اپنے آپ کو ختم کردیتا ہے تو اُسے رب تعالیٰ کی ربوبیت کا ادراک ہونے لگتا ہے اور جب انسانی دوئی کے مقام سے نکل کر یک جائی کے مقام پر آتا ہے جہاں انسان کہتا ہے تو کون اور میں کون۔ دونوں ایک ہی تو ہیں۔ وہاں انسان کو رب کی حضوری ہوتی ہے جسے داتا صاحب نے حق کی حضوری قرار دیا ہے۔

جب انسان دوئی کو مٹادیتا ہے تو یک جائی کے مقام پر آجاتا ہے۔ جہاں اُسے رب تعالیٰ کی ربوبیت دکھائی دیتی ہے۔ انسان جب تک خود کو مٹاتا اور ختم نہیں کرتا وہ رب کی حضوری میں نہیں جاتا۔ وہ اپنی "میں" ہی میں بھٹکتا رہتا ہے اور "میں" کو ختم کرنے کے لیے نفس کو مٹانا بہت ضروری ہے۔ جس کے لیے نفس کی مخالفت کرنا پڑتی ہے۔ ہر وہ چیز جس کے لیے نفس خواہش کرے انسان اُس کے برعکس عمل کرے۔ اس سے "میں" ختم ہوجاتی ہے۔

ہمارے یہاں سننے میں آتا ہے کہ فلاں شخص نے میری بہت توہین کی۔ میں کسی سے ملنے گیا اُس نے کوئی توجہ نہیں دی مجھے۔ یہ درحقیقت نفس کی بدترین خواہش ہے۔

ہم قرآن پاک میں پڑھتے ہیں کہ بے شک تمام عزت اللہ ہی کے لیے ہے۔

ان العزۃ للہ جمیعا (سورۂ یونس:65)

پھر ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ وہ جسے چاہتا ہے عزت عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔

"اے اللہ تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔" (سورۂ آل عمران:36)

جب تمام عزتیں اللہ ہی کے لیے ہیں تو پھر ہماری کہاں کی عزت اور کہاں کی توہین۔ ہاں رب تعالیٰ جسے چاہتا ہے عزت عطا فرما دیتا ہے۔ پھر اس کی کوئی توہین نہیں کر سکتا۔ اُس فقیر کو اگر کوئی جوتوں میں بٹھا دے یا جوتوں میں کھانا دے دے تو اُسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ نہیں کہ فقیر بے حس ہوتا ہے بلکہ وہ تو بہت حساس ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سب عزتیں اللہ کے لیے ہیں اس لیے وہ بے نیاز ہو جاتا ہے کہ کسی نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ بے نیاز ہو جاتا ہے کہ کون اُسے جوتے لگا رہا ہے اور کون اُسے محفل میں بُرا بھلا کہہ رہا ہے۔

داتا صاحب ایک بار ترکی میں ایک مزار پر تشریف لے گئے۔ حاضری کے بعد اُن کا کشف جاری ہو گیا۔ اگلے سال پھر وہیں تشریف لے گئے لیکن تب کشف جاری نہ ہوا۔ اُنھوں نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور ایک سرائے میں جگہ تو نہ تھی لیکن سرائے کے مالک نے کہا کہ آپ جیسے چند اور فقیر ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں اُن سے درخواست کر دیکھیں۔ وہ وہاں گئے تو دیکھا کہ وہ سب نقلی فقیر ہیں۔ داتا صاحب کی درخواست پر اُنھوں نے اُنھیں وہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ داتا صاحب کے سر پر اُسترا پھرا تھا اور دیے کی روشنی میں اُن کا سر چمک رہا تھا۔ اُن فقیروں نے ازراہ شرارت خربوزے کے چھلکے داتا صاحب کے سر پر مارنا شروع کر دیے۔ داتا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ لوگ تو میری تضحیک کر رہے تھے لیکن مجھے اس کا فائدہ ہوا اور میرا رکا ہوا کشف جاری ہو گیا۔

جب کوئی اپنی ذات کو اس طرح مٹا دیتا ہے کہ ہر شے سے اور ہر رویے سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو اُس کا کشف جاری ہو جاتا ہے اور اُسے رب یا حق کی حضوری حاصل ہو جاتی ہے۔

سوال:۔ آج کل مختلف پیغمبروں پر جو فلمیں بن رہی ہیں، یہ فلمیں دیکھنا گناہ تو نہیں؟

جواب: یہ فلمیں تعلیم کا ایک ذریعہ ہیں اور ماس میڈیا کا ایک میڈیم (Medium) ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں بے ادبی کا پہلو تو ہے لیکن یہ گناہ نہیں۔ پیغمبروں کو Impersonate کرنا گستاخی ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ فلم کے ذریعے پیغمبروں کے پیغامات کی ترویج ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر ہم ان فلموں کو خالصتاً فلمی نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ حضرت دانیال علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور دیگر انبیاء جو پیغام لے کر آئے وہ کیا تھا۔ اُن پر نازل ہونے والے صحائف میں کیا پیغام تھا؟ اُن کے بعد آنے والے پیغمبروں نے کس طرح ان پیغامات کو آگے پھیلایا۔ رسول صاحب شریعت و کتاب ہوتا ہے جب کہ نبی پہلے سے موجود پیغام کی ترویج کرتا ہے۔ لہٰذا اگر فلموں کے ذریعے ان پیغامات کو پھیلایا جا رہا ہے تو غلط نہیں۔ البتہ اس میں وہاں گستاخی کا پہلو ہے جہاں مختلف اداکار مختلف پیغمبروں کو

Impersonate کر رہے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر ہم بہت احتیاط کرنا چاہیں تو ہم فلم کے Picture Mode میں نہ جائیں بلکہ محض اُس کی آواز سن لیں۔

گستاخی اور بے ادبی کا سارا بوجھ تو اُن لوگوں پر ہے جنھوں نے پیغمبروں کے کردار ادا کیے یا ادا کروائے۔ لیکن علم کہیں سے بھی حاصل ہو رہا ہے اور کسی طریقے سے بھی حاصل ہو رہا ہو اُسے سیکھنا چاہیے۔

سوال:۔ علم باطنی کی 19 منزلیں ہیں۔ 16 ویں اور 17 ویں منزل امام کی ہے۔ کیا رُوحانیت کے ائمہ اور دوسرے بارہ ائمہ میں کوئی فرق ہے؟

جواب: اہل تشیع صرف اُن لوگوں کو امام مانتے ہیں جو اہل بیت میں سے ہیں اور آپ ﷺ کی نسل میں سے ہیں۔ آپ ﷺ کی نسل سے مراد وہ اولاد جو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی اور اہل بیت کہلاتی ہے۔ اور ان میں سے ہر نسل میں جو بڑے صاحبزادے رہے ہیں امامت انھیں ملتی رہی۔ یہ اہل تشیع کا فرمان ہے۔

اہل تشیع میں آگے دو فرقے پیدا ہوئے۔ ان میں اختلافات آئے۔ وہ دو فرقے اہل تشیع اور اسماعیلی ہیں۔ پہلے بڑے صاحبزادے اسماعیل کو امامت ملی۔ بعد ازاں دوسرے نمبر کے صاحبزادے کو امامت دے دی گئی۔ اس فیصلے کو اہل تشیع نے تو تسلیم کیا لیکن اسماعیلیوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ ہم حضرت اسماعیلؒ کو امام مانیں گے۔

جہاں تک اہل سنت کا تعلق ہے تو وہ ان افراد کو بھی امام مانتے ہیں جو اہل بیت کے علاوہ رُوحانیت کے اس خاص مقام پر فائز ہیں۔ اہل سنت کے ہاں موروثیت کو نہیں دیکھا جاتا۔ خواہ کوئی شخص سید ہے یا غیر سید اگر وہ تقویٰ اور نیکی کے بلند مقام پر ہے تو اُسے پورا حق ہے کہ وہ اپنی محنت اور اللہ کی رحمت کے صدقے کسی بھی مقام پر پہنچ جائے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت پر بہت محنت کی اور قرآن پاک، حدیث، سنت اور فقہ کی ایسی تشریح کی کہ اپنے علم کے باعث امام مانے گئے۔

جب ہم اہل بیت کے آئمہ کی بات کرتے ہیں تو وہ سلسلہ اور ہے۔ حضرت امام حسنؓ و حسینؓ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت امام موسیٰ کاظمؒ اور دیگر ائمہ کرام سب مسلمانوں کے سردار ہیں۔ وہ قوم کے بادشاہ اور سلطان کے معنوں میں "امام" کہلاتے ہیں۔

اہل سنت بھی ان تمام ائمہ کو مانتے ہیں۔ ہماری جانیں اور ہماری اولاد بھی ان ائمہ پر قربان۔ اُن کا مقام بہت بلند ہے۔ لیکن ولایت کی منزلوں میں جب امام کی منزل کی بات ہوتی ہے تو اُس کا تعلق اہل بیت سے نہیں بلکہ رُوحانیت سے جوڑا جاتا ہے جیسے سیالکوٹ میں امام ولی الحق ہیں۔ اُن کے بھائی امام علی ناصر بھی رُوحانیت کے اُسی بلند مقام پر فائز ہیں لیکن اس بلند مرتبہ و مقام کے باوجود وہ اہل بیت کے ائمہ کی خاک پا بھی

نہیں۔ رُوحانیت کے تمام امام تو اہل بیت کے ائمہ کے تلووں کی خاک چاٹنے اور ان کے در پر اپنی پلکوں سے جھاڑو دینے کو سعادت سمجھتے ہیں۔

یہاں ایک بار پھر واضح کر دوں کہ رُوحانیت کی سولھویں منزل پر فائز ائمہ طریقت کے سلسلوں کے والی اور نگران ہوتے ہیں جب کہ اہل بیت کے بارہ ائمہ کرام رُوحانیت کی سترھویں منزل پر فائز ہوتے ہیں اور وہ قوم کے سردار ہیں۔

سوال بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کی فضیلت، اس کا اُسلوب اور اس کے اثرات کیا ہیں؟

جواب بسم اللہ الرحمن الرحیم کی فضیلت یہ بھی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے اور ہم تنہائی میں بیٹھ کر سر جھکا کر اپنے سینے میں دل کے مقام پر نظر مرکوز کریں اور بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھیں اور پڑھتے ہوئے یہ تصور کریں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہمارے دل پر اتر رہی ہے تو چند ہی دنوں میں آپ کو ایسا لگے گا کہ جیسے واقعتاً دل پر ایک نور کا سمندر ہے۔ اور ایک شعاع سی دکھائی دے گی جس میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا نظر آئے گا۔ ایسے لگے گا کہ جیسے دل میں ایک چمک آ رہی ہے۔ جس طرح ماربل کے فرش پر پانی سے چمک پیدا ہوتی ہے۔ دل پر بھی ایسی ہی گلابی چمک پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ چمک بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ یوں لگنے لگتا ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم دل میں جذب ہو گئی ہے اور اس میں نور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ میرا Personal experience ہے۔ اسی دل کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا

> "جسم کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ سدھر جاتا ہے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ یاد رکھنا وہ (لوتھڑا) دل ہے۔" (صحیح بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرأ لدینہ حدیث نمبر 52، صحیح مسلم کتاب المساقاۃ باب اخذ الحلال وترک الشبہات، حدیث نمبر 4178)

اس دل میں وحشت بھی ہے اور حقیقت بھی۔ نور بھی اور ظلمت بھی۔ دل میں موجود خون سرخ نہیں ہوتا بلکہ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ البتہ جو خون دل میں Pump out کرتا ہے وہ سرخ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی رُوح دل کے درمیانی حصہ، جو بہت چھوٹا سا ہے اس میں ڈالی جاتی ہے۔ دل میں جلال بھی ہے اور جمال بھی۔ وہاں نفس بھی ہے اور عقل بھی۔

ایک چیز یاد رکھیں کہ جہاں نور کی مسلسل برسات ہو گی وہاں چمک دار سیاہی ہو گی۔ اس سے ایک اور بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس زمین پر جنت سے آئی ہوئی جو واحد چیز ہے حجرِ اسود وہ سیاہ ہے۔ خانہ کعبہ کا غلاف سیاہ ہے۔ خانہ کعبہ کی دیواریں تعمیر کے وقت سیاہی مائل نہ تھیں مگر اب ہیں۔ مکہ کے اردگرد کی تمام پہاڑیاں سیاہی مائل ہیں۔ جہاں نور مسلسل برسے گا وہاں چمک دار سیاہی آ جائے گی۔ اسی وجہ سے مکہ کے پہاڑ اور خانہ کعبہ کی دیواریں سیاہی مائل ہیں۔ جب کہ خانہ کعبہ کا غلاف سیاہ ہے۔ اب آپ کو یہ نکتہ بھی سمجھ آ جائے گا کہ غلاف

سیاہ کیوں بنایا جاتا ہے اور حجرہ اسود سیاہ کیوں ہے۔

اس کے برعکس مدینہ شریف میں ہر چیز پر نور برستا دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ آپ ﷺ تو مجسم نور ہیں۔ آپ ﷺ کی ذات مبارکہ سے جو روشنی نکلتی ہے وہ وہاں چاروں طرف پھیل جاتی ہے جس کی وجہ سے مدینہ شریف بہت روشن نظر آتا ہے۔ مدینہ شریف اور مکہ شریف میں یہ فرق بہت Noticeable ہے۔ مدینہ منورہ میں ایک ٹھنڈک بھی ہے اور عجیب Brightness اور چمک بھی۔ جب کہ مکہ مکرمہ میں ایک جلال ہے اس لیے وہاں Brightness نہیں ہے۔

خود عرش معلیٰ پر نور کا سمندر جو بحر مروارید کہلاتا ہے اس کی لہریں جب اٹھتی ہیں تو وہ سیاہی مائل ہوتی ہیں۔ اور عرش معلیٰ کا وہ حصہ جہاں رب تعالیٰ کی Virtual نشست گنی جاتی ہے وہاں بھی چمکدار سیاہی ہے کیوں کہ وہاں رب تعالیٰ کا مسلسل نور ہے جب کہ اللہ کی تجلی کا رنگ دودھیا سفید ہے۔ جس طرح ٹیوب لائٹ کی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن اس نور کا اثر یہ ہے کہ اس شدت سے سیاہی دکھائی دیتی ہے جس شدت کا نور برستا ہے۔ جس طرح جتنا گہرا سمندر ہو گا وہ نیلا نہیں بلکہ اتنا ہی سیاہی مائل دکھائی دے گا۔

ذکر ہو رہا تھا بسم اللہ الرحمن الرحیم کا۔ اگر کوئی شخص بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بطور وظیفہ پڑھنا چاہے تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ دل میں دُنیاوی مقاصد نہ ہوں۔ یہ سوچ کر پڑھا جائے کہ اس میں پورا قرآن سمایا ہے اور میں اس قرآن کو دل میں سمولوں۔ قرآن پاک کو دل میں سمونے سے یہ نیت نہ ہو کہ مجھے جنت مل جائے گی اور جہنم سے نجات ہو جائے گی۔ بلکہ نیت یہ ہو کہ یہ میرے رب کا کلام ہے اور میں اسے محبت اور عقیدت سے اپنے دل میں سمونا چاہتا ہوں۔ اس نیت کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر بسم اللہ الرحمن الرحیم کا یہ وظیفہ کریں۔ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ کوشش کیا کریں کہ عبادات تنہائی میں چھپ کر کریں اور لوگوں کو پتا نہ چلنے دیں کہ آپ عبادات کر رہے ہیں۔ ایک جگہ مخصوص کرلیں اور دروازے اندر سے Bolt کر کے عبادت کریں۔

فرض نماز تو باجماعت ہی ادا کریں لیکن نوافل عبادات تنہائی میں چھپ کر کی جائیں تو بہتر ہے۔ کمرہ بند کر کے کوئی خوشبو سلگا لیں۔ اگر خوشبو سے الرجی ہو تو اپنے لباس پر کوئی اچھی سی خوشبو لگا لیجیے۔

جب عبادات سے فارغ ہو جائیں تو فرصت کے لمحات میں آنکھیں بند کر کے دل پر توجہ ڈالیے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ورد کریں۔ پھر محسوس کریں کہ یہ دل پر اُتر رہی ہے۔ یہ محسوس کرنا شروع کریں گے تو اس کے ساتھ ہی اللہ کے انعامات کی بارش ہونا شروع ہو جائے گی۔ لیکن یہاں Warn کردوں کہ انعامات کی یہ بارش بعض اوقات انسان کو Distract بھی کر دیتی ہے۔ انسان اس میں کھو جاتا ہے۔ اسی لیے تو فقیر کشف و کرامات سے بہت دُور بھاگتا ہے۔ ضروری ہے کہ انسان اس مقام پر جا چکا ہو جہاں کشف و کرامات اسے Distract نہ کر پائیں اور وہ اُنھیں ایک طرف ہٹا کر کہے کہ میری منزل کشف و کرامات نہیں بلکہ میرا رب ہے۔

میرے مرشد صاحب (اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے) نے ایک بار جلالی کیفیت میں مجھے

مخاطب کر کے فرمایا۔

"میاں! میں نے تو ایک روز رب سے کہا اُٹھا اپنا سب کچھ لے جا۔ مجھے تیرا کچھ نہیں چاہیے۔ بس تو اپنا ذکر چھوڑ جا۔"

مغربی تعلیم کے زیرِ اثر میرے دل میں آیا کہ یہ تو تکبر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسا کہا جائے۔ میں دن بھر اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ حتیٰ کہ رات کو عبادت کے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد بھی ذہن میں یہی بات گونجتی رہی۔ غور و فکر کے بعد اچانک یہ بات کھلی کہ یہ تو تکبر نہیں بلکہ خود سپردگی کی انتہا ہے۔ یہ تو وہ مقام ہے جہاں بھوک، پیاس، لباس، رہائش غرض کہ انسان ہر شے اور حاجت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ تو وہ کیفیت ہے کہ آپ اپنا سب کچھ رب کو بخش بیٹھتے ہیں اور خود کو رب تعالیٰ کو سونپ دیا ہے۔

یہ میری روٹین رہی کہ جب تک مرشد صاحب حیات تھے میں صبح سویرے اُن کے پاس چلا جاتا۔ اُن کا ناشتا ایک کپ چائے ہوتا تھا۔ میں بھی اُن کے پاس بیٹھ کر یہی ناشتا کرتا۔ لہٰذا اس ساری بات کی سمجھ آ جانے کے بعد اگلی صبح ناشتے پر میں نے اُن سے عرض کیا "حضور! کل تو آپ کی بات سمجھ نہ آئی تھی لیکن اب آ گئی۔" وہ بولے۔ "کون سی بات؟" تب مجھے اندازہ ہوا کہ کل عالم جذب میں اُنھوں نے وہ بات کہی تھی جو اب اُنھیں یاد نہیں۔ بات یہ ہے کہ کون سا مقام ہے جہاں رب تعالیٰ سے کہا جاتا ہے کہ اُٹھا اپنا سب کچھ لے جا۔ مجھے تیرا کچھ نہیں چاہیے۔ بس تو اپنا ذکر چھوڑ جا۔

یہ سارا قصہ بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ورد کریں تو اُس مقام سے کریں جہاں انسان اپنی تمام دُنیاوی ضروریات سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اُسے ایک ہی لگن ہوتی ہے کہ بس میرا رب مجھے مل جائے۔ ایسے میں جب انسان کو کشف و کرامات حاصل ہوں تو وہ اُنھیں اس طرح Treat کرے کہ وہ اُسے Distract نہ کر پائیں۔ پھر وہ مقام آ جاتا ہے جہاں وہ اللہ کی نعمتوں کو خلقِ خدا کے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جب فقیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ کشف و کرامات کو اس طرح استعمال کرتا ہے اور مستجاب الدعوات ہونے کی صورت میں لوگوں کے لیے دُعا کرتا ہے تو ان نعمتوں کے استعمال کے پیشِ نظر دو مقاصد ہوتے ہیں۔

- ایک تو یہ کہ اس طرح وہ اللہ کے قریب ہو جائے گا کیوں کہ اللہ کو یہ بہت پسند ہے کہ اُس کے بندوں کی خدمت کی جائے۔

میرے ایک دوست خاصے سینئر فوجی افسر تھے۔ اُنھیں جب پتا چلا کہ لوگ میرے پاس دُعا کے لیے آتے ہیں تو اُنھوں نے دل ہی دل میں مجھے خاصی لعن طعن کی کہ یہ بندہ کیسی بدعتیں پھیلا رہا ہے۔ لیکن اُنھوں نے زبان سے کبھی مجھے کچھ نہ کہا۔ کوئی دو سال بعد اُنھوں نے ایک روز میرے پاس آ کر معذرت کی۔ "شاہ صاحب! میں کافی عرصہ آپ کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا رہا لیکن مجھے اب سمجھ آ گئی ہے کہ آپ تو درحقیقت بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔" میں نے پوچھا "وہ کیسے؟" کہنے لگے "میں اس تمام عرصہ میں

آپ کو Examine کرتا رہا اور جانا کہ لوگ آپ کے پاس روتے چہرے کے ساتھ آتے ہیں اور ہنستے چہرے کے ساتھ واپس جاتے ہیں۔ یہ تو بہت بڑی نیکی ہے۔''

یوں فقیر رب تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو خدمت خلق کے لیے استعمال کرتا ہے تا کہ رب راضی ہو جائے۔

- دوسری بات یا چیز یہ ہے کہ جس طرح مداری ڈگڈگی سے لوگوں کو قریب بلاتا ہے اسی طرح فقیر کی ڈگڈگی یہ دُعا ہے جس کے ذریعے وہ لوگوں کو اپنے پاس اکٹھا کر لیتا ہے۔ لوگ دُعا کے لیے اس کے پاس آتے ہیں اور تب فقیر اپنی Personal example کے ذریعے لوگوں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ اپنے شب و روز کو Exemplary (مثالی) کر لیتا ہے۔

فقیر دُعا اور کشف و کرامات کو استعمال تو کرتا ہے لیکن اُس مقام پر جہاں یہ سب چیزیں اُسے Distract نہ کر پائیں۔

ایک اور Distraction فقیر کی راہ میں اُس وقت آتی ہے جب لوگ اُسے جھک کر سلام کرنے لگتے ہیں۔ جس سے اُس کا نفس پھول کر موٹا ہو جاتا ہے۔ اس خطرے سے انسان کو آگاہ اور محتاط رہنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس اتنا زور آور ہو جائے کہ قابو میں ہی نہ آئے۔

جن دنوں میں گورنمنٹ جاب میں تھا تو ایک سپیشل ڈیوٹی کے سلسلے میں مجھے مختلف مقامات پر چند دنوں کے لیے جانا پڑتا۔ بعض مقامات ایسے بھی ہوتے جہاں Civilians کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ دُور دراز گاؤں آباد ہوتے۔ ایک بار ایک ایسے ہی علاقے میں میری ڈیوٹی تھی جہاں وسائل دستیاب نہ ہونے کے باعث صفائی کے Levels بہت Low تھے۔ ایک ہی جوہڑ سے جانور اور انسان پانی پیتے اور وہیں نہاتے اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہوتے۔ وہاں ڈیوٹی کے دَوران میں سارا دن بھوکا پیاسا رہتا۔ جب ان ضرورتوں سے بے حال ہونے لگتا تو واپس شہر کی طرف بھاگتا اور فریش ہو کر اُس علاقے کی طرف لوٹ جاتا۔ تیمم کرنے کو میرا دل نہ مانتا تھا۔ لہٰذا میرے عبادت کے معمولات میں ناغہ آ گیا۔ دس بارہ دن کے بعد جب میں واپس آیا تو رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک خوب صورت نایاب کتا ہے جرمن شیفرڈ جیٹ بلیک۔ میں بڑا خوش ہوا اتنا خوب صورت کتا دیکھ کر۔ صبح مرشد صاحب سے ملاقات ہوئی تو یہ خواب بیان کیا۔ سن کر فوراً کہنے لگے ''تم نے اپنی عبادات کتنے عرصے سے چھوڑ رکھی ہیں؟'' اب میں حیران ہوا کہ میں کتے کی بات کر رہا ہوں اور یہ مجھ سے عبادات کا پوچھ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا ''کام کے سلسلے میں مصروفیت ایسی تھی کہ چار پانچ دن سے عبادات نہیں کر پایا۔'' وہ بولے ''یہ تمھارا نفس تھا جو بہت پھل پھول گیا ہے۔ رب تعالیٰ نے تمھیں بھی چیز دکھائی ہے۔ عبادات شروع کر دو۔''

یہ خوابوں کا قصہ بھی عجیب ہے۔ ہم خواب دیکھتے ہیں اور سڑکوں پر دوڑتے پھرتے ہیں کہ ہے کوئی جو میرے خواب کو سن کر تعبیر بتا دے۔ خوابوں کی تعبیر بعض اوقات توقع کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔

جب میں 22 سال کا تھا تو ایک بہت خوب صورت خواب دیکھا کہ آپ ﷺ ایک گھر میں تشریف فرما

ہیں۔ مجھے کسی نے اس بارے میں اطلاع دی۔ میں اُس گھر میں داخل ہونے لگا تو وہاں دروازے پر موجود فرشتے نے کہا کہ تم اندر نہیں جا سکتے کیوں کہ تمھاری داڑھی نہیں ہے۔ تب میں نے جھوٹ بولا کہ آپ ﷺ نے تو مجھے داڑھی سے معاف فرما دیا ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو چلو اندر۔ ابھی کنفرم کرا دیتا ہوں۔ میں دربان کے ساتھ جیسے ہی اندر داخل ہوا۔ وہاں آپ ﷺ کو تشریف فرما پایا۔ اُن ﷺ پر نظر پڑتے ہی میں نے عرض کیا ''حضور ﷺ! یہ یقین نہیں کر رہے کہ آپ ﷺ نے مجھے داڑھی سے معاف فرما دیا ہے۔'' اس پر آپ ﷺ نے بہت خوب صورت اور Broad smile دیا۔ جس سے فرشتہ یہ سمجھا کہ گویا آپ ﷺ نے کنفرم (Confirm) کیا ہے کہ مجھے داڑھی معاف ہے۔ اس خواب کے چند روز بعد ایک بار ایک بزرگ میرے پاس کسی کام کے سلسلے میں آئے۔ میں نے اُنھیں اپنا یہ خواب سنایا۔ سن کر پوچھنے لگے ''کیا آپ درود پاک کثرت سے پڑھتے ہیں۔'' میں نے کہا ''جی۔'' بولے ''آج کل چھوڑا ہوا ہے۔'' میں نے کہا ''جی۔'' کہنے لگے ''وہ ناغے تو آپ ﷺ کی طرف سے معاف ہو گئے ہیں اب ایسا نہ کیجیے گا۔''

یوں خواب بعض اوقات انسان کو اُلجھا دیتے ہیں۔ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور ہم کچھ اور سمجھتے رہتے ہیں۔

یکسوئی اور روزہ

سوال:۔ جب کوئی انسان اپنی آنکھیں بند کرتا ہے تو کیا تب وہ رب تعالیٰ کے سیاہ نور کو دیکھ رہا ہوتا ہے؟

جواب: اصل میں جو اندھیرا ہے وہ ظلمت کی سیاہی کی نشاندہی کرتا ہے اور رب تعالیٰ کے نور کے بالکل برعکس اور اُلٹ ظلمت ہے۔

جہاں رب تعالیٰ کے نور کی بارش مسلسل ہوتی ہے وہاں چمک دار سیاہی پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ سیاہی جیٹ بلیک نہیں ہوتی۔ اس میں سفیدی کی آمیزش ہونے کے بعد چمک آ جاتی ہے۔ جب کہ ظلمت کا اندھیرا جیٹ بلیک ہوتا ہے۔ جب ہم آنکھیں بند کرتے ہیں تو وہ اندھیرا جو ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ اللہ کے نور کی سیاہی نہیں ہے۔

البتہ آنکھیں بند کرنے کا ایک فائدہ ضرور ہے اور وہ یہ کہ ہمارے ذہن کا رابطہ باہر کی دُنیا سے منقطع ہو جاتا ہے اور ذہن تھکتا نہیں۔ جو چیز ہم سوچنا چاہتے ہیں اور جہاں توجہ مرکوز کرنا چاہتے ہیں اُس میں آسانی مل جاتی ہے۔ اُس وقت صرف انسان کے کان کام کر رہے ہوتے ہیں۔ آنکھیں بند ہونے کے باعث باہر کی دُنیا سے ہمارا رابطہ نصف حد تک کم رہ جاتا ہے۔ Concentration انسانی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اس یکسوئی کے حصول کے لیے مختلف مذاہب میں مختلف طریقے رائج ہیں۔ جیسے بدھ مت میں بھکشو ایسی مختلف مشقیں کرتے ہیں جن سے اُن کے ذہن کا رابطہ دُنیا کے شور شرابے سے کٹ جاتا ہے۔ ان مشقوں سے بھی پہلے وہ یوگا کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشتے ہیں اور پھر یکسوئی کے حصول پر کام کرتے ہیں۔

ہندوازم میں بھی یکسوئی کی بہت اہمیت ہے۔ سادھو خود کو مختلف مشقوں کے دوران خاصی اذیت دیتے ہیں اور اس کو برداشت کرنا سیکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ جسمانی اذیتیں اُن کی روزمرہ زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں اور پھر وہ وقت آتا ہے کہ تکالیف اُن کو Distract نہیں کر پاتیں۔ ایسے ہی ایک سادھو کا ذکر برٹرینڈ رسل نے اپنی کتاب "The Happiness" میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "مجھے سچی خوشی کی تلاش تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا دُنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو درحقیقت خوش ہو؟ میں نے مختلف ممالک کے سربراہوں، مذہبی راہنماؤں،

سکالرز، غرض کہ ہر Walk of life سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ملاقات کی۔ دُنیا بھر کا دورہ کیا لیکن مجھے کوئی شخص بھی سچی خوشی سے ہم کنار نظر نہ آیا۔ جب میں اپنا Study tour terminate کر رہا تھا اور وہ Terminating point تبت کے نزدیک جنگلات کا سلسلہ تھا۔ (تب تک میں اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ کسی شخص کو بھی سچی خوشی حاصل نہیں۔ ہر خوشی کی تہ میں دُکھ موجود ہیں۔) وہاں جنگلات میں مجھے ایک سادھو ملا جو واحد آدمی تھا جس کے اندر میں نے سچی خوشی محسوس کی۔ لیکن جس انداز میں وہ سچی خوشی حاصل کر رہا تھا اُسے دیکھ کر میں نے سچی خوشی کے حصول سے توبہ کر لی۔ وہ سادھو جسم پر مٹی ملنے کے بعد ایک ایسے تختہ پر لیٹا تھا جس پر سیدھی طرف سے کیل گڑے تھے۔ ان نوکیلے کیلوں پر لیٹنے کی وجہ سے سادھو کے جسم سے جگہ جگہ سے خون رِس رہا تھا۔ لیکن اس اذیت کے باوجود سادھو خوش تھا۔ میں نے یہ سب دیکھ کر سچی خوشی پانے سے توبہ کر لی کیوں کہ میں ایسی اذیت سے نہ گزر سکتا تھا۔"

سادھوؤں کی طرح بھکشو بھی مختلف مشقیں کرتے ہیں۔ اُن میں سے ایک مشق حبس دم کی ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں عرض کر دوں کہ ہر انسان کے دو Nostrils ہیں۔ ہمارے ہاتھ کے اُلٹے حصہ کی جلد اتنی حساس ہوتی ہے کہ اُن چیزوں کو بھی محسوس کر لیتی ہے جسے ہمارے ہاتھ کی اندرونی جلد یعنی ہتھیلی محسوس نہیں کر پاتی۔ آپ بھی یہ مشق کریں کہ سیدھی Nostril کو بند کر کے اُلٹی Nostril سے سانس Inhale اور Exhale کریں اور پھر اُلٹی Nostril کو بند کر کے سیدھی Nostril سے سانس Inhale اور Exhale کریں اور ہاتھ کی اُلٹی سائیڈ پر اس سانس کو محسوس کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ دونوں اطراف کے خارج ہونے والے سانس میں واضح فرق ہے۔ ایک طرف سے Exhale ہونے والے سانس کا درجۂ حرارت دوسری Nostril سے خارج ہونے والے سانس کے درجۂ حرارت سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان کو درجۂ حرارت ہو جائے تو جس Nostril سے Temperature زیادہ Exhale ہو رہا ہے اُس طرف سے ناک بند کر کے کم ٹمپریچر والی سائیڈ سے سانس لینا اور خارج کرنا شروع کر دیں۔ اس مشق سے ٹمپریچر کم ہو جائے گا۔

بھکشو سانس کی آمد و رفت Control کرنے کے لیے بہت محنت کرتے ہیں۔ اُن میں سے ایک مشق حبس دم کی ہے جس میں سانس کو گھنٹوں تک روکے رکھنے کی پریکٹس کی جاتی ہے۔ جو عام انسان کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن حبس دم کی مشق سے پہلے ضروری ہے کہ Concentration (یک سوئی) سیکھی جائے اور یوگا کے مختلف (Postures) آسنوں سے واقفیت ہو۔ مثلاً یہ معلوم ہو کہ Cross legs میں دونوں بازو سیدھے کر کے گھٹنوں پر رکھ کر انگلی اور انگوٹھا ملا کر کیسے بیٹھا جاتا ہے۔ یوگا کے مختلف آسنوں کی مشق میں طاق ہو جانے کے بعد وہ Concentration (یک سوئی) کے اگلے Level "حبس دم" کی طرف بڑھتے ہیں۔ جس کی آخری حد یہ ہے کہ وہ ایک قبر کھود کر اس میں لیٹ جاتے ہیں۔ قبر اُوپر سے بند کر دی جاتی ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد قبر کھول کر اس سادھو یا بھکشو کو اندر سے نکالا جاتا ہے۔ وہ زندہ ہوتا ہے۔ حبس دم کے Level

سے پہلے وہ Head stand بناتے ہیں۔ اس مشق میں اُن کے سر اور گردن کو کندھوں تک دفن کر دیا جاتا ہے
اور باقی جسم (دھڑ) سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ اس انداز میں وہ 12 یا 24 گھنٹے گزارتے ہیں۔ یہ سارا ذہن کا کھیل
ہے کہ جب انھوں نے اپنا ذہن اس جسمانی اذیت سے ہٹا لیا تو انھیں Control حاصل ہو گیا۔ ہمیں جسم کی
تکلیف کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب ہمارا ذہن اُس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ اگر ہم اپنا ذہن جسم میں
ہونے والی اُس تکلیف سے ہٹا لیں تو اذیت کا احساس نہیں ہوگا۔ ایسا ہی ایک واقعہ کچھ عرصہ قبل مولانا محمد حسن
صاحب کے ساتھ پیش آیا کہ ٹانگ کاٹنے کے لیے جب اُن کا آپریشن ہوا تو انھوں نے بے ہوش ہونے کی دوا
(Anaesthesia) لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ نشہ آور ہے۔ یوں بغیر بے ہوش ہوئے انھوں نے اپنی
ٹانگ کا آپریشن کروایا۔ اس دوران اللہ کے ذکر میں وہ اس حد تک مشغول ہو گئے اور یک سوئی کا یہ عالم تھا کہ
انھیں ذرہ بھر بھی تکلیف کا احساس نہ ہوا اور یہ تک خبر نہ ہوئی کہ کس لمحے اُن کی ٹانگ کاٹ دی گئی۔ یہ سارا
کمال اللہ کی یاد میں یک سوئی اور بھرپور توجہ کا تھا۔

اسلام میں اپنے جسم کو اذیت دینا منع ہے۔ اسلام میں لوگ یادِ الٰہی میں ڈوب کر Concentration
کے اعلیٰ مقام پر جا پہنچتے ہیں۔ وہ اللہ کی یاد میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ گردوپیش سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔
حضرت علیؓ کا واقعہ آپ کو یاد ہوگا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ میرے جسم میں پیوست تیر کو اس وقت کھینچا جب میں
حالتِ نماز میں ہوں۔ جب ایسا کیا گیا تو انھیں پتا تک نہ چلا کہ کب اُن کے جسم سے تیر کھینچ لیا گیا۔

ہمارا ذہنی رابطہ دُنیا سے صرف ایک ہی صورت میں کٹتا ہے کہ یادِ الٰہی میں یوں کھو جائیں کہ دُنیا کی خبر
ہی نہ رہے۔ رُوحانیت کے مختلف سلاسل میں ابتدا میں کچھ لوگ بند کمرہ کے سناٹے میں عبادت کرتے
ہیں۔ پھر وہ جان بوجھ کر لوگوں میں بیٹھ کر عبادت کرنے لگتے ہیں اور پھر وہ وقت آتا ہے کہ وہ لوگوں سے
کہتے ہیں کہ جب میں ذکرِ الٰہی اور تسبیح میں مصروف ہوں تو میرے اردگرد خوب شور مچانا۔ اس مرحلہ کے بعد
وہ لوگوں کو پیسے دے کر کہتے ہیں کہ جب میں ذکرِ الٰہی میں مصروف ہوں تو میرے اردگرد خوب ڈھول
بجانا۔ ڈھول کی اس تھاپ پر وہ ذکرِ الٰہی نہیں کر رہے ہوتے بلکہ دراصل اپنا انہماک Check کر رہے
ہوتے ہیں کہ کہیں لوگوں کا شور یا ڈھول کی تھاپ ہمیں ذکرِ الٰہی سے دُور تو نہیں کر دیتی۔ لیکن یاد رکھیں کہ
محویت وہی اچھی ہے جو خود بخود پیدا ہو جائے۔ اس کے حصول کا ایک بہت آسان طریقہ یہ ہے کہ اگر ہم
قرآن پاک پڑھتے ہیں تو اس کو قدرے بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیں۔ آپ نے قرآن پاک پڑھتے
ہوئے ایک چیز Experience کی ہوگی کہ ذہن بھٹکنے لگتا ہے اور مختلف قسم کے خیالات آنے لگتے ہیں۔
اس سے یک سوئی میں کمی آ جاتی ہے۔ اس کا آسان سا علاج یہ ہے کہ ہم قرآن پاک اتنی آواز میں پڑھیں
جو ہم خود سن سکیں۔ جب ہم اتنی آواز میں قرآن پاک پڑھیں گے کہ الفاظ کو خود غور سے سن سکیں تو دو چار بار
پڑھنے کے بعد انہماک پیدا ہو جائے گا اور خیالات کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ ایسے میں جب آدمی قرآن
پاک پڑھتا ہے تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن پاک پڑھتے پڑھتے کھلی آنکھوں سے وہ کبھی روضہ مبارک کی

زیارت کرلیتا ہے تو کبھی مختلف مزارات اُسے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری یک سوئی میں اضافہ کی وجہ سے ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی برکات اور اثرات ہم پر طاری ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے بجائے یوگا اور حبسِ دم کی مشقوں کے پیچھے بھاگنے کے یہ سیدھا سادہ طریقہ اختیار کر کے یک سوئی حاصل کر لیجیے۔

عبادت وہی افضل ہے جس میں انسان اپنے دُنیاوی فرائض ترک نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کمانے کی مصروفیات سے جان چھڑا کر Right on dot نماز اور قرآن پاک پڑھنا شروع کر دے اور بیوی بچوں کے فرائض دوسروں پر ڈال دے۔

افضل عبادت وہ ہے کہ جب ہم دُنیاوی مصروفیات نبھا رہے ہوں تو تمام دُنیاداروں سے بڑھ کر دُنیادار نظر آئیں۔ اور جب ہم عبادت کریں تو تمام دین داروں سے زیادہ دین دار دکھائی دیں۔

جب میں نے دُعا کا سلسلہ شروع کیا تھا تو کچھ لوگ میرے آفس بھی آجایا کرتے اور میں یہ سوچ کر انھیں Attend کرتا کہ بندہ خود چل کر میرے پاس آیا ہے۔ اسے نظر انداز کرنے کی صورت میں کہیں اللہ سے سامنے ہی نہ پڑ جائیں۔ لیکن بعد ازاں جب آفس کا کام ڈسٹرب ہونے لگا تو مجھے شدت سے احساس ہونے لگا کہ میں بددیانتی کا مرتکب ہو رہا ہوں کیوں کہ میرا یہ وقت میرے دفتر نے خریدا ہوا ہے اور میرا کوئی حق نہیں کہ میں اس دوران اپنا ذاتی فون بھی سنوں۔

اُن دنوں مجھے کراچی بہت Frequently جانا ہوتا تھا۔ جمعہ کے روز میں مرشد صاحب کے حکم کے مطابق بارہ بجے مسجد میں جا کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ Tour کے دوران ایک بار میں جمعہ کے روز کراچی میں تھا۔ میں مسجد میں جا بیٹھا لیکن ذہن میں یہی چل رہا تھا کہ آفس کے سلسلے میں مجھ سے بددیانتی ہو رہی ہے۔ میں اگلی صف میں بیٹھا تھا کہ اچانک محراب پر میری نظر پڑی اور مجھے اپنے مسئلہ کا حل نظر آ گیا۔ محراب پر میں نے لکھا دیکھا کہ آپ ﷺ نے اپنے دن کے 24 گھنٹوں کو تین 3 برابر حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ پہلا حصہ مخصوص تھا صحابہ کرام سے ملاقات کرنے، اُمورِ مملکت چلانے اور باہر سے آنے والے وفود سے ملاقات کے لیے۔ دوسرا آٹھ گھنٹے کا حصہ مخصوص تھا آپ ﷺ کی Family life کے لیے اور تیسرا حصہ آپ ﷺ نے مخصوص کیا تھا اپنی عبادات اور آرام کے لیے۔

جب میں نے وقت کی یہ تقسیم پڑھی تو میرے ذہن میں میرے مسئلہ کا حل آ گیا کہ میں بھی اگر اپنے وقت کو مختلف حصوں میں بانٹ لوں اس طرح نہ تو میں اپنے Employer کے حق پر ڈاکا ڈالوں گا نہ Family life ڈسٹرب ہوگی اور نہ ہی لوگوں کی خدمت سے دُور رہوں گا۔

یہ قصہ سنانے کا مقصد یہ ہے کہ اسلام میں ترکِ دُنیا ممنوع ہے۔ میرے عقیدے اور ایمان کے مطابق آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ عملی قرآن اور عملی اسلام ہے۔

اگر ہم ذرا گہرائی سے دیکھیں تو دُنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے اُن میں سے کوئی ایک بھی پڑھا لکھا نہ تھا۔ سبھی اُمّی مطلق تھے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کے تمام پیغمبر، رسول اور نبی تو قطعی اُمّی

مطلق تھے جب کہ رب تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے کہ علم والا اور بے علم بھی ایک نہیں ہو سکتے۔

''تم فرماؤ! کیا برابر ہیں جاننے والے اور اَن جان۔'' (سورۃ الزمر: 9)

دراصل پیغمبروں کے اُمی مطلق ہونے کے پیچھے ایک بہت بڑی وجہ تھی۔ چونکہ وہ پیغمبر تھے اور انھیں اپنی اُمت کو Lead کرنا تھا اور جاتے ہوئے اپنی اُمت کے درمیان اپنی لائی ہوئی کتاب اور اپنی حیات طیبہ کو بطور نمونہ چھوڑ کر جانا تھا۔ لہٰذا اگر کوئی پیغمبر کسی دُنیاوی مکتب یا انسان سے تعلیم حاصل کرتا تو انسان چونکہ عقل و علم میں ناقص ہے۔ اسی طرح نظامِ تعلیم میں بھی کوتاہیاں اور خامیاں موجود ہوتی ہیں۔ اگر پیغمبر ایسے انسان یا نظام سے علم حاصل کرتا تو اُس کا علم بھی ناقص کہلاتا۔ یوں لوگوں کے لیے ایک مثال بن جاتی کہ ہمارے تو پیغمبر نے بھی یہ کام کیا لہٰذا ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ اس حجت اور ناقص علم سے بچانے کے لیے رب تعالیٰ نے پیغمبروں کو اُمی مطلق رکھا اور اُن کو وحی کے ذریعے تعلیم دی۔ کیوں کہ رب کی دی ہوئی تعلیم اور علم Flawless ہے۔ کوئی پیغمبر یا رسول کوئی بات نہیں کہتا جب تک اُسے رب کی طرف سے حکم نہ ہو۔ جو حکم آئے گا وہ اپنی زبان سے ادا کر دے گا۔ اس لیے آپ ﷺ کی کوئی بھی بات اپنی طرف سے نہیں ہے۔

ایک اور عجیب بات بھی غور کرنے سے پتا چلتی ہے کہ دُنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ پیدائش سے پہلے ہی یا پیدائش کے کچھ ہی عرصہ بعد یتیم ہو گئے اور جوں ہی ہوش سنبھالا والدہ کی گود سے بھی محروم ہو گئے۔ تمام انبیاء نے غربت اور عسرت کی زندگی گزاری۔ جو یتیم نہیں بھی ہوئے تھے اُنھیں By force یتیم کر دیا گیا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا اور وہ اپنے والد سے دُور ہو گئے۔

تمام انبیا نے غربت اور تنگ دستی کی زندگی گزاری لیکن اس کے پیچھے یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ اُنھیں اپنی اُمت کے لیے مثال قائم کرنا تھی۔ دوسرا یہ کہ جب انسان فاقے کاٹتا ہے۔ لوگوں کے لگائے ہوئے طعنے اور کچوکے سہتا ہے۔ جتنیں برداشت کرتا ہے تو اُس کے اندر کا دُکھ بڑھتا ہے۔ یتیم ہونے کی وجہ سے کوئی سہارا دینے والا نہیں ہوتا سوائے رب تعالیٰ کے۔ اس لیے جب دل پر کچوکے لگتے ہیں تو وہ رب تعالیٰ کے حضور جھکتا اور گڑگڑاتا ہے۔ اس پکار میں ایسا خلوص ہوتا ہے جو اُسے رب تعالیٰ کے بہت قریب لے جاتا ہے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دل میں جتنا گداز ہو گا اُتنا ہی زیادہ علم اُس پر اُترے گا۔ زمین جتنی گہری پھاڑی جائیں گی اُتنا ہی پھل لائے گی۔ انسان کے دل پر بھی جتنا گہرا زخم لگے گا اُتنا ہی زیادہ وہ رب کے قریب ہو گا اور علم کے حصول کے لیے تیار ہو گا۔ امیر لوگ تو اس میں سے نہیں گزرتے۔ بے سہارا، لاچار، مسکین، یتیم غریب ہی اس مرحلے سے گزرتے ہیں۔

انبیا کے دلوں کو تو Sensitive receiver ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ فاقہ کی تکلیف بہت ہوتی

ہے اور انبیا تو ایسے فاقوں سے گزرتے ہیں کہ کئی کئی روز کے فاقوں کے بعد اُنھوں نے پیٹ بھرا۔

رُوحانیت میں کہا جاتا ہے کہ رُوحانیت کی ترقی کے لیے روزہ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ روزہ رُوحانیت کا بہت اچھا Carrier ہے۔ ایک تو بھوکا پیٹ انسان کو اذیت دیتا ہے۔ دوسرے روزہ رکھنے سے انسان تقویٰ کی طرف چل پڑتا ہے اور گناہوں سے دُور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص رُوحانیت میں تیزی سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو وہ کثرت سے روزے رکھے۔

تمام انبیا روزے کثرت سے رکھا کرتے تھے۔ تمام اولیاء اللہ کا بھی یہی معمول رہا۔ حضرت نظام الدین اولیا سوائے عیدین کے تمام روزے رکھا کرتے۔ پھر اچانک اُنھوں نے محسوس کیا کہ روزہ تو اُنھیں بار محسوس نہیں ہوتا۔ لہٰذا روزہ کی شدت کو محسوس کرنے کے لیے اُنھوں نے Alternative days پر روزے رکھنا شروع کر دیے۔

رُوحانیت میں تیزی سے آگے بڑھنے کے لیے روزہ رکھتے وقت یہ دھیان ضرور رکھیں کہ روزہ اپنے مکمل Protocols کے ساتھ نبھایا جائے۔ اِس میں چغلی، غیبت، جھوٹ اور دیگر ممنوع چیزوں کا خیال رکھنا اور اُن سے اجتناب کرنا بہت ضروری ہے۔

روحانیت اور دل کی آواز

سوال: کیا حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے بھی دُنیا میں کسی انسان کا وجود تھا؟

جواب: حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جو تخلیق کیے گئے تھے۔اُن سے پہلے کوئی انسان دُنیا میں نہیں تھا البتہ جنات اور فرشتوں کا وجود ضرور تھا۔

سوال: جسم مثالی کیا ہے اور اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے؟

جواب: رُوحانیت میں مختلف اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔رُوحانیت میں تصور یہ ہے کہ جس طرح ہمارا جسمانی وجود ہے اسی طرح آسمانوں پر اس کے ساتھ کا ایک اور جسم موجود ہے جو جسم مثالی کہلاتا ہے۔جس طرح ہم اپنے جسم خاکی کو تندرست رکھنے کے لیے صحت مند غذائیں کھاتے ہیں اور ہمارا جسم خاکی توانا رہتا ہے اسی طرح ہمارے جسم مثالی کی غذا عبادات اور نیک اعمال ہیں۔

جب ہم ایسے ذکر اذکار کرتے ہیں جو ہماری رُوح سے مماثلت و مطابقت رکھتے ہیں اور اُسے Suit کرتے ہیں تو ان سے ہمارا مثالی جسم صحت مند ہوتا ہے اور ہماری رُوح میں لطافت آتی ہے۔اگر ہم ایسے ذکر اذکار کرنا شروع کر دیں جو ہماری رُوح سے مطابقت نہیں رکھتے تو ہمارا مثالی جسم زخمی اور کمزور ہونے لگتا ہے۔اُس کی پرواز میں کمی آنے لگتی ہے۔اسی طرح کچھ ذکر اذکار ہمارے مثالی جسم سے مطابقت نہیں رکھتے اور مخالفت بھی نہیں۔ان سے ہماری رُوح کی پرواز کم و بیش نہیں ہوتی اور ایسے ذکر اذکار سے ثواب کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

جس طرح یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے ایک لفظ ''کُن'' سے وجود میں آئی تھی۔اسی طرح ہر رُوح کا ایک Controlling word ہوتا ہے اُس کی اپنی Characteristics ہیں۔جب ہم ایسے الفاظ کا ذکر کرتے ہیں جو رُوح کے اس Controlling word سے مطابقت رکھتے ہیں تو ہماری رُوح اور مثالی جسم طاقت ور ہوتا ہے۔رُوح کی پرواز بڑھتی ہے۔اگر ہم ایسے الفاظ پڑھتے ہیں جو ہماری رُوح کے Controlling word سے مطابقت یا مخالفت نہیں رکھتے تو ہمیں ثواب ضرور ملتا ہے لیکن رُوح کو اس کا فائدہ نہیں پہنچتا۔اسی طرح جو الفاظ ہماری رُوح کے اس Controlling word سے مطابقت نہیں رکھتے اُن کو پڑھنے سے فائدہ

کی بجائے اُلٹا نقصان ہوتا ہے۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ ذکر کرنے سے کسی کا ذہن اُلٹ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان ایسا لفظ پڑھ رہا ہوتا ہے جس کے اثرات اُس کی روح سے مطابقت نہیں رکھتے اور اس سے اُس کا مثالی جسم Damage ہو جاتا ہے۔

سوال: ذکر یا وظیفہ پڑھتے ہوئے نیند آجاتی ہے۔ اس کا کوئی حل بتا دیجیے۔

جواب: کوئی بھی اچھی اور اعلیٰ چیز آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے مشقتیں کاٹنا پڑتی ہیں۔ نیند کا آسان علاج یہ ہے کہ دوپہر کے کھانے کے بعد ایک Catnap لے لی جائے۔ اس سے رات کو نیند نہیں آئے گی۔ دوسرا یہ کہ تمام رات نہ جاگا جائے۔ شب بھر جاگنا اس لیے بھی غلط ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو اعتدال پسند ہے حتیٰ کہ عبادات میں بھی۔ اگر ہم رات کو چار گھنٹے گہری نیند سو جائیں اور پھر دوپہر کو بھی Catnap لے لی جائے تو میرے خیال میں نیند نہیں آنی چاہیے۔

ایک بزرگ کے بارے میں میں نے پڑھا تھا کہ وہ ساری رات عبادت میں مصروف رہا کرتے اور اونگھ سے بچنے کے لیے بال چھت سے لٹکتے رسے سے باندھ لیتے تاکہ اونگھ آنے سے جب جھٹکا لگے تو اُس جھٹکے سے بالوں میں کھنچ کی وجہ سے تکلیف کا احساس انھیں بیدار کر دے۔

لیکن میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ عبادت میں بھی اعتدال رکھا جائے تاکہ ساری زندگی یہ معمول جاری رہ سکے۔ تھوڑی عبادت جو پابندی و باقاعدگی سے کی جائے، اُس عبادت سے بہتر ہے جو کچھ عرصہ تو کثرت سے کی جائے اور پھر ترک کر دی جائے۔

سوال: (الف) زندگی کے روزمرہ معاملات کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے دل کچھ کہہ رہا ہوتا ہے اور دماغ کچھ۔ ایسے میں دل کی بات سنی جائے یا دماغ کی یا پھر معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں راہ نمائی فرمائیے۔

(ب) فیصلہ کے معاملہ میں بے صبری کی عادت پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے؟

جواب: (الف) ایک حدیث ہے کہ جس کام کے کرنے سے دل میں شبہ آجائے اُسے چھوڑ دو۔ (سنن نسائی، حدیث 5711۔ جامع ترمذی، حدیث 2518)

آپ ﷺ کی Guidance موجود ہوتے ہوئے کسی اور راہ نمائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ہمیں اس لیے عقل عطا فرمائی تاکہ ہم اچھے اور بُرے میں تمیز کر سکیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے عقل کی تعریف پوچھی تو انھوں نے فرمایا۔

''عقل وہ نہیں جو اچھے اور بُرے میں تمیز سکھادے بلکہ عقل وہ ہے جو اچھے میں بہت اچھے کی تمیز سکھادے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل عطا ہی اس لیے فرمائی ہے کہ ہم اچھے اور بُرے میں تمیز کر سکیں اور جب سب اعمال اچھے ہو رہے ہوں تو بہت اچھے اعمال کی پہچان کر سکیں۔

دل اکثر دھوکا دے جاتا ہے۔ روحانیت میں اکثر دل سے اُٹھنے والی آواز درست ہوتی ہے۔ عقل غلط Guide کر جاتی ہے۔ شروع شروع میں جب میں دل کی نہیں سنتا تھا اور مغربی تعلیم کے زیرِ اثر دماغ کی مانتا تھا تو بہت نقصان اُٹھاتا تھا۔ بظاہر Logic کے تحت میں ٹھیک کر رہا ہوتا تھا لیکن اندر سے آواز اُٹھتی تھی کہ "ایسا نہ کرو" لیکن میں پھر بھی دماغ کی بات مانتا اور نقصان اُٹھاتا۔

انسان ابتدا میں دماغ کی بات ہی سنتا ہے۔ جب تک آپ اُس مقام پر نہیں پہنچ جاتے جہاں آپ دل کی آواز سمجھنا شروع کر دیں تب تک عقل اور دماغ ہی کی مانے۔

(ب) فیصلوں کے معاملہ میں بے صبری سے نجات پانے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے رب پر بھروسا اعلیٰ درجہ کا پال لیجیے اور اس بھروسا سے بھی پہلے ایک بات ذہن میں Clear کر لیں کہ ہماری Duties کیا ہیں اور وہ کہاں آ کر ختم ہوتی ہیں۔ ہمارے جتنے بھی معاملات ہیں رُوحانی، دینی یا دُنیاوی...... ہمارے ذمہ صرف ایک چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جتنی بھی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں ہم ان سے بہترین کام لیں۔

To the best of our abilities — physical as well as intellectual.

جب ہم نے حتی المقدور ذہن، علم اور جسم سے کام لے لیا تو پھر ہم مطمئن ہو جائیں کہ میں نے اپنا فرض پورا کر لیا۔ اب اس کا نتیجہ میرے رب تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جتنا اور جیسے چاہے گا مجھے اُس کا پھل عطا فرمائے گا۔

اس رویے کا فائدہ یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ ہماری کوششوں کے نتیجے میں خواہ کچھ بھی عطا فرمائے...... کامیابی، جزوی کامیابی یا ناکامی...... اُسے ہم انتہائی خوش دلی سے یہ سوچ کر تسلیم کر لیں گے کہ میرا رب بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔ میرے رب نے مجھے جو کچھ بھی عطا فرمایا ہے وہ یقیناً میرے حق میں بہتر ہے۔

اس رویے سے میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو جائے گا کہ میرے رب کا فیصلہ ہی بہتر ہے۔ لیکن اگر میں اپنی کوششوں کا ایک مخصوص اور من پسند نتیجہ چاہتا ہوں اور ہوتا اس کے برعکس ہے تو پھر میں عجیب وغریب باتیں کہتا ہوں کہ اللہ تو سنتا ہی نہیں۔ وہ میری دُعائیں قبول ہی نہیں کرتا، وغیرہ، وغیرہ۔ لیکن جب انسان اللہ پر بھروسا رکھتا ہے تو مرضی کے برعکس نتیجہ آنے پر بھی اُس کے ماتھے پر شکن نہیں آتی کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ میرا کام کوشش کرنا ہے اور رب تعالیٰ کا کام پھل دینا ہے۔ یہ رب کی مرضی ہے کہ وہ کب، کہاں اور کیسا پھل مجھے میری محنتوں کے عوض عطا کرتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آ جانے کے بعد طبیعت میں سے بے صبری خود بخود ختم ہو جائے گی۔

سوال: محمد یٰسین چشتی مرحوم سے آپ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟ اُن کا کیا مقام ہے؟

جواب: یہ تو شاید میں نہ بتا پاؤں کہ چشتی صاحب رُوحانیت کے کس مقام پر تھے البتہ اُن سے ملاقات کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک زمانے میں Monday کو دُعا ہوتی تھی اور خواتین و حضرات ایک ہی روز تشریف لایا کرتے تھے کیوں کہ زیادہ ہجوم نہ ہوتا تھا۔ انہی دنوں ایک صاحب تشریف لائے اور یوں تعارف کروایا کہ میں

محمد یسین ہوں اور سلسلۂ چشتیہ سے بیعت ہوں۔ پھر کہنے لگے کہ آپ مجھے اپنی شاگردی میں لے لیں۔ میں نے کہا "آپ کو کسی نے Misguide کیا ہے۔ آپ کو یہاں کیا ملے گا؟" کہنے لگے "آرا ے بازار میں ایک شخص کے پاس میں 35 سال سے روزانہ حاضری دیتا رہا لیکن پھر بھی خالی ہاتھ رہا ہوں۔" اب ایک بزرگ نے مجھے خواب میں گائیڈ کیا ہے کہ میں آپ کے پاس چلا جاؤں تو مجھے سب کچھ مل جائے گا۔" میں نے کہا "اچھا یہ بات ہے تو تشریف رکھیے جو کچھ میرے پاس ہے وہ لے لیجیے۔"

دو سال بعد ایک خاتون ادیب سے اُنھوں نے فرمایا کہ زندگی میں بڑے بڑے ٹھنڈے بزرگوں سے میری ملاقات ہوئی لیکن سید سرفراز شاہ صاحب سے زیادہ ٹھنڈا اور دھیما شخص میں نے نہیں دیکھا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ بندے کا بھرم رکھتا ہے اور اُس نے میرا بھرم بھی یوں رکھا کہ ڈھائی سال بعد یسین صاحب صاحبِ کشف ہو گئے۔

سوال: مسلمانوں اور سکھوں میں اکثر اختلافات رہتے ہیں۔ سکھ قوم کا کہنا ہے کہ مسلمان جانوروں کو ذبح کر کے اُن کا خون بہاتے ہیں۔ جانوروں کو تکلیف دیتے ہیں۔ جب کہ سکھوں کا خیال ہے کہ ذبح کیے بغیر جانوروں کو مارا جائے۔ سکھ اپنے بال بھی نہیں کٹواتے اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: نہ جانے آپ کو مسلمانوں اور سکھوں میں اختلافات کیوں نظر آ گئے حالانکہ ان دونوں میں تو بہت مماثلت ہے۔ ہم بھی کام کرنے سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں سوچتے ہیں اور جذباتی ہم بھی کافی زیادہ ہیں۔ (یہ جملے شاہ صاحب نے ازراہِ تفنن کہے۔)

جہاں تک جانوروں کو ذبح کرنے کی بات ہے تو یہ بہت پرانا اختلاف ہے۔ صرف یہودی جانوروں کو مسلمانوں کے طریقے پر ذبح کرتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک فرق ہے کہ مسلمان کا ذبح کیا ہوا گوشت حلال ہوتا ہے جب کہ یہودی کا ذبح کردہ گوشت حلال نہیں بلکہ کوشر (Kosher) کہلاتا ہے۔

سکھ اور عیسائی جس طریقے سے جانور ذبح کرتے ہیں وہ ذبح نہیں بلکہ "جھٹکا" کہلاتا ہے۔

ذبح اور حلال میں فرق یہ ہے کہ اگر جانور کو کاٹنے کا طریقہ اسلامی ہے تو وہ ذبح ہے اور اگر اسی طریقے سے ذبح کرتے ہوئے تکبیر پڑھ لی جائے تو گوشت "حلال" کہلائے گا۔

ذبح یعنی Kosher میں جانور کی شہ رگ کاٹی جاتی ہے اور پھر اسے As it is چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے جانور کی رگوں میں موجود تمام خون بہہ جاتا ہے۔ اس کے بعد سر باقی جسم سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

اگر ہم جھٹکے سے سر علیحدہ کریں تو خون بہے گا نہیں بلکہ جسم میں جہاں جہاں خون موجود ہے وہیں رُک جائے گا اور فوری طور پر جم جائے گا۔ حالیہ ریسرچ کے مطابق خون بیکٹیریا کا بہترین Carrier ہے۔ چونکہ خون سارے کا سارا رگوں کے اندر ہی رہ گیا یوں بیکٹیریا بھی اندر ہی موجود رہا۔ ایسا گوشت جب انسان

کھائے گا تو بیکٹیریا بھی جسم میں داخل ہو جائے گا اور بہت سی بیماریاں لگنے کا خدشہ بڑھ جائے گا۔ جب کہ ذبح میں سارا خون بہہ جاتا ہے اور سارے نقصان دہ بیکٹیریا جانور کے جسم سے نکل جاتے ہیں۔ اس لیے صرف حلال اور ذبح کے طریقے سے ہی اُن نقصان دہ بیکٹیریا سے بچا جاسکتا ہے۔ یہاں ایک اور چیز بھی عرض کردوں جو اگرچہ سوال میں تو نہیں ہے لیکن ضروری ہے کہ بکرے یا دُنبے کی عمر قربانی کے وقت کم از کم ایک سال ہو یا پھر ایک سال کا دکھائی دے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک سال کی عمر تک ان جانوروں کے خون میں ایک ایسا بیکٹیریا موجود رہتا ہے جو انسانی صحت کے لیے نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے ہمیں منع کیا ہے کہ ایک سال سے کم عمر بکرے، بھیڑ یا دُنبے کی قربانی کی جائے۔ حضرت براءؓ بیان کرتے ہیں۔ حضرت ابو بردہؓ نے نماز (عید) سے پہلے قربانی کرلی تو آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا ''تم اس کی جگہ (دوسری قربانی) کرو۔'' انھوں نے عرض کی ''میرے پاس بکری کا بچہ ہے (جس کی عمر ایک برس سے کم ہے)۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''تم اسے اس کی جگہ قربان کردو۔ لیکن تمھارے بعد کسی کے لیے بھی ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر 5237)

یورپ میں مجھے ایک مشاہدہ ہوا کہ وہاں مسلمان Families دُکانوں پر جا کر Lamb مانگتے ہیں جو عموماً تین یا چار ماہ کا ہوتا ہے لیکن اپنی اصل عمر سے تین چار گنا Heavy دکھائی دیتا ہے۔

موقف ان Families کا یہ ہوتا ہے کہ یہ Lamb جلدی پک جاتا ہے۔ زیادہ Effort نہیں کرنا پڑتی۔ وہ اس لیے جلدی پک جاتا ہے کیوں کہ وہ کم عمر ہوتا ہے اور زیادہ Mature نہیں ہوتا۔

میری اُنھیں یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ ایسا دُنبہ، بھیڑ یا بکری کھائیں جو ایک سال سے زائد عمر کا ہو۔

ہمارے ہاں بھی ایک زمانے میں مہم چلی تھی کہ بکریاں نہ پالی جائیں بلکہ بھیڑیں اور دُنبے پالے جائیں۔ کیوں کہ بکری جب گھاس یا جڑی بوٹی کھاتی ہے تو اُس کو دانتوں میں پکڑ کر کھینچتی ہے۔ دانتوں سے کترتی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پودا جڑ سے نکل آتا ہے اس کے برعکس بھیڑ یا دُنبہ پودے کو دانتوں سے کترتا ہے۔

چونکہ آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ تین سال قبل ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں کی تعداد 1.2 بلین سے بڑھ کر 1.6 بلین ہوگئی تھی۔ موجودہ وقت میں یہ دو بلین ہو چکی ہے۔ جس رفتار سے آبادی بڑھ رہی ہے اُس لحاظ سے وسائل ناکافی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دُنیا High breed crops کی سمت چل پڑی ہے اور یوں پیداوار کم عرصہ میں پہلے کی نسبت دو تین گنا زیادہ لی جانے لگی ہے۔ اسی طرح زمین میں ایک Fodder جسے انگریزی میں الفا الفا کہا جاتا ہے اگایا جاتا ہے۔ یہ کئی بار فصل دیتا ہے۔ اسی لحاظ سے یہ مہم چلی تھی کہ ہم بکریاں نہ پالیں بلکہ دُنبے اور بھیڑیں پالیں۔

بہر حال بھیڑ، بکریاں یا دُنبے اگر ہم اپنی خوراک کا حصہ بنانا چاہتے ہیں تو یہ دھیان رکھنا ہوگا کہ وہ ایک

سال سے کم عمر نہ ہوتا کہ ہم بیماریوں سے بچے رہیں۔

Conscious Mind اور Conscious Level میں فرق

گزشتہ نشست میں ذہن کے تین حصوں کی بات ہو رہی تھی:۔

1. Conscious Mind
2. Subconscious Mind
3. Unconscious Mind

آج مجھے دورانِ گفتگو خدشہ ہوا کہ کہیں لوگ میری گفتگو سے یہ Impression نہ لے لیں کہ Conscious mind اور Conscious Level ایک ہی چیز ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ جس طرح رب کے کئی نام ہیں۔ اُسے ہم Power بھی کہتے ہیں، Infinity بھی کہتے ہیں۔ اُسے ہم Ultimate بھی کہتے ہیں۔ God اور Allah بھی کہتے ہیں اور مجھ جیسے لوگ اُسے رب بھی کہتے ہیں۔ میرے اندر رب کا شکر ادا کرنے کی اور تو کوئی توفیق ہے نہیں لہٰذا میں نے ایک Short cut یہ ڈھونڈا کہ میں اللہ تعالیٰ کو "رب" کہہ دوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جب میں اُسے رب کہتا ہوں اور وہ آواز میرے دل سے اُٹھتی ہے تو اس کے پیچھے شکر گزاری اور احسان مندی کا جذبہ ہوتا ہے۔ احساس تشکر ہوتا ہے کہ یہ وہ ہستی ہے جو مجھے پالتی ہے۔ یہ لفظ "پالنا" اپنے وسیع ترین معنوں میں آئے گا۔

روزمرہ کی زبان میں "پالنا" سے مراد یہ ہے کہ رب ہمیں روٹی دیتا ہے لیکن وسیع معنوں میں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ میری حفاظت کرتا ہے۔ وہ میری تمام تر ضروریات کا خیال رکھتا ہے اور ان کو پورا کرتا ہے۔ وہ مجھے اس دُنیا میں رہنے کے قابل بناتا ہے۔ علم و عقل عطا فرماتا ہے۔ غرض کہ زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جہاں وہ مجھے Look after نہ کرتا ہو۔ یوں اللہ کو میں "رب" کہتا ہوں کہ اسی بہانے میں رب کا شکر ادا کر دوں اور جو احسانات وہ مجھ پر کر رہا ہے اُن کا اعتراف کر لوں۔

احسان مندی کی بات ہو رہی ہے تو آپ ﷺ پر جو ہم درود بھیجتے ہیں وہ بھی تو یہی قصہ ہے۔

بلاشبہ اس دُنیا میں آپ ﷺ کا کوئی ثانی نہیں۔ اللہ کے بعد سب سے بڑی ہستی آپ ﷺ ہیں۔

؎ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آپ ﷺ کو ہمارے درود کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو خود شافع محشر ہیں ان ﷺ کو اُمت کے درود کی ضرورت کیوں کر ہو سکتی ہے؟

آپ ﷺ پر ہم جو درود بھیجتے ہیں وہ در اصل شکر گزاری کا ہی ایک انداز ہے کہ آپ ﷺ نے ہم پر اتنا بڑا احسان کیا کہ رب تعالیٰ کا پیغام خود تکلیفیں اُٹھا کر ہم تک پہنچا دیا۔ شکر گزاری کے طور پر ہم کچھ اور تو نہیں کر سکتے

ہیں لہٰذا درود وسلام بھیجتے ہیں۔

اسی طرح رب تعالیٰ کی شکر گزاری اگر کسی اور طریقے سے ممکن نہیں تو کم از کم میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ احسان مندی کے گہرے جذبے اور احساس کے تحت میں اُسے رب کہہ دوں۔ اس طرح وہ احسان جو اُس نے مجھ پر کیا ہے میں اُس کو Acknowledge کرلوں گا۔

یہاں درود پاک کے بارے میں ایک بات عرض کردوں کہ جس طرح کسی چیز کے گم ہوجانے پر انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھا جاتا ہے اور گمشدہ چیز مل جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم کوئی بات بھول جائیں تو درود شریف پڑھنا شروع کردیں۔ اللہ کے فضل وکرم سے وہ بات یاد آجائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ اگر تم کوئی چیز بھول جاؤ تو درود شریف پڑھ لیا کرو۔ وہ چیز یاد آجائے گی۔

اکثر لوگ کمزور یادداشت کا گلہ کرتے ہیں۔ دُعا کے دوران Suggestion میں مختلف سورتیں آتی ہیں زیادہ تر سورۂ یوسف، سورۂ انعام اور سورۂ آل عمران ہوتی ہیں۔ بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ جس آدمی کو قرآن پاک حفظ نہ ہوتا ہو اُسے چاہیے کہ وہ سب سے پہلے سورۂ جمعہ حفظ کرے۔ سارا قرآن پاک بآسانی حفظ ہوجائے گا۔

میں نے یہ بات مختلف لوگوں کے گوش گزار کی۔ تجربہ ومشاہدہ یہی ہے کہ اس سے قرآن پاک جلدی حفظ ہوجاتا ہے۔

رَب تک رسائی کے طریقے

سوال: جب انسان رات کو بستر پر سونے کے لیے لیٹتا ہے تو اس کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں لیکن یوں لگتا ہے کہ رُوح کہیں اور گئی ہوئی ہے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جسم ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جواب: اس کی سائنسی توجیہہ تو یہ ہے کہ جب ہم بستر پر لیٹ کر سونے جا رہے ہوتے ہیں تو ہمارا ذہن ہمارے جسم کو Signal دیتا ہے اور ہمارے تمام اعضا آرام کے Mode میں چلے جاتے ہیں اور بالکل Relax کر جاتے ہیں۔

اسی طرح خود ہمارا ذہن بھی Sleeping mode میں چلا جاتا ہے۔ جس طرح ہم کمپیوٹر کو Sleeping mode میں کر دیتے ہیں جس سے اُس کی صرف اتنی مشینری کام کر رہی ہوتی ہے جو کمپیوٹر کو آن رکھے ہوتی ہے یا پھر پیغام وصول کرنے والے کل پرزے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ یہی کام انسانی ذہن کر رہا ہوتا ہے

انسانی ذہن کے تین حصے ہیں۔

1. Conscious Mind
2. Subconscious Mind
3. Unconscious Mind

جب ہمارا ذہن Sleeping mode میں جاتا ہے تو یہ دراصل Conscious mind ہوتا ہے جو کام کرنا بند کر کے ہمارے Subconscious Mind کے حوالے کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم شعور سے نکل کر لاشعور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جس سے یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم غائب اور کہیں گم ہو گئے ہیں۔ یہ دراصل Transition ہے۔ From Conscious mind to Subconscious mind اور اس کا دورانیہ 10 منٹ نہیں بلکہ خاصا کم ہوتا ہے۔ جسم کے ہلکا پھلکا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا

Conscious mind تمام جسم کو Signal دیتا ہے کہ وہ آرام کے Mode میں چلا جائے اور سگنل کے ساتھ ہی تمام Nerves آرام میں چلی جاتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے جسم کی تمام حرکات حتیٰ کہ سانس کی آمد و رفت تک کا تعلق بھی ہمارے Mind سے ہے۔ ہمارا ذہن Signal دیتا ہے اور اس کے مطابق ہمارے سانس کی رفتار کم زیادہ ہوتی رہتی ہے اور ہمارے تمام اعضا کام کرتے ہیں۔ جب ہم کوئی ایسا کام کرنے لگتے ہیں جس میں ہمارے جسم کے تمام اعضا حرکت میں ہوں تو آپ نوٹ کیجیے گا کہ ان اعضا کی Movement میں بہت ترتیب ہوتی ہے۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں کی Movements بہت Organised ہوتی ہیں۔ ہم ڈانس کرتے ہیں چاہے انڈین یا انگلش، اس میں بھی ہمارے تمام اعضا کی حرکات بہت ہی Organised ہوتی ہیں۔ یہ سب Mind کے مرہونِ منت ہے۔

جب دماغ Nerves کو آرام کا Signal دیتا ہے تو وہ Relax ہو جاتی ہیں اور ہمیں اپنا جسم ہلکا پھلکا محسوس ہوتا ہے۔ یہ تو اس کی سائنسی توجیہہ ہے۔

اس کی رُوحانی توجیہہ یہ ہے کہ اگر ہم ایسے ذکر اذکار کرتے ہیں جو ہماری رُوح کے Controlling word سے مطابقت رکھتے ہیں تو ہماری رُوح پھلتی پھولتی ہے اور اس کی لطافت بڑھتی ہے۔ جوں جوں رُوح کی لطافت بڑھے گی توں توں اُس کی پرواز بلند اور وسیع ہوتی چلی جائے گی۔

جب ہم سو جاتے ہیں اگر ہماری رُوح لطیف ہے تو وہ سیر کو نکل جاتی ہے۔ اس لیے اسلام میں حکم یہ ہے کہ سونے سے پہلے سونے کی دُعا پڑھ لیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں۔ بیدار ہونے پر کلمہ پڑھیں اور اللہ کا شکر ادا کریں۔ کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ سویا اور مرا ایک برابر ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت انسان کی رُوح سیر کو نکل جاتی ہے اور اس دوران ہم خالی الذہن ہو جاتے ہیں کیوں کہ انسانی جسم میں زندگی کا اصل جوہر رُوح ہے۔ جب رُوح سیر کو نکل گئی تو پیچھے صرف Residual بچیں گے۔ جیسے ہم گنے کو بیلنے میں سے گزاریں تو اس کے رس کو برتن میں جمع کر لیتے ہیں۔ باقی بچ جانے والا بیگاس ہوتا ہے۔ ہمارا جسم بھی اُس وقت بیگاس ہوتا ہے۔ رُوح کے سیر پر نکل جانے پر جسم ہلکا پھلکا محسوس ہوتا ہے۔

سوال: حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ کسی ولی میں معرفت کے ہونے کے قائل ہیں، اُن کا قول معتبر نہیں۔

جواب: حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ علم کے ایسے مقام پر ہیں جس کا کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میرے مشاہدے کے مطابق وہ انسان کے مشاہدے کی حدِ نگاہ ہیں۔ جو شخص رُوحانیت کے اس بلند مقام پر فائز ہو اُس کی کہی ہوئی باتیں ذرا مشکل ہی سے سمجھ آتی ہیں۔

جنابِ داتا صاحب کا یہ قول کہ اگر کسی شخص نے کسی ولی میں معرفت کے ہونے کا گمان کیا تو اُس کے قول کی کوئی Authenticity نہیں ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ولی اللہ دو طرح کے جھوٹ ''میں بہت کچھ ہوں'' اور ''میں کچھ نہیں ہوں'' کے درمیان پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر ولی اللہ کو تلاش کرنا ہو تو وہ دو جھوٹ تلاش کر لیجیے۔ ان کے درمیان ولی اللہ مل جائے گا۔

کوئی بھی صاحب علم کبھی بھی اپنے صاحب علم اور کوئی ولی اللہ کبھی بھی اپنے ولی اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اور جو کوئی دعویٰ کرتا ہے وہ رب کی طرف سے جھوٹا کر دیا جاتا ہے۔ جب کوئی ولی اللہ اپنے پاس آنے والوں کے سامنے اپنے صاحب معرفت ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا تو وہ لوگ کیسے کہیں گے کہ فلاں شخص صاحب معرفت ہے۔

مختصر لفظوں میں جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ صاحب علم، صاحب معرفت اور ولی اللہ ہے سمجھ لیجیے کہ وہ خالی ہے۔ اگر انسان کو یہ ہی علم نہ ہو کہ فلاں شخص صاحب علم ہے تو کوئی اُس کی معرفت کی گواہی کیسے دے گا۔ پراپیگنڈا وہی کرتے ہیں جو شخص دُکان داری کرتے ہیں۔ صاحب علم ایسا نہیں کرتے۔ یہ اور بات ہے کہ رب تعالیٰ اُس ولی اللہ کی خوشبو چھپنے نہیں دیتا اور اُسے دُور دُور تک پھیلا دیتا ہے۔ صاحب علم جب علم کی بات زبان سے نکالتا ہے تو اس میں اثر ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں میں اُترتی چلی جاتی ہے اور لوگوں کے رویے بدلتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے اُنھیں خود بخود پتا چل جاتا ہے کہ وہ انسان صاحب علم ہے۔ ولی اللہ کبھی کرامات کا اظہار نہیں کرے گا۔ لیکن کرامات اُس سے ظاہر کروا دی جاتی ہیں۔ جو شخص کرامات کا اظہار کرتا ہے وہ دراصل Public کو اپنے پیچھے لگانا چاہتا ہے۔ وہ صاحب علم نہیں ہوتا۔ صاحب علم میں تو عاجزی ہوتی ہے۔ وہ یہی رٹ لگاتا ہے کہ میں کچھ نہیں۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے ولی اللہ ہیں جن کے بارے میں حضرت جنید بغدادی نے فرمایا تھا ''بایزید کی اولیا میں وہی حیثیت ہے جو فرشتوں میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی۔'' اتنے بلند مقام پر فائز یہ ولی اللہ ایک بار کشتی میں سفر کر رہے تھے کہ وہ بھنور میں پھنس گئی اور لوگوں نے کہا کہ کشتی میں کوئی گناہ گار شخص موجود ہے اُسے نکال دیا جائے تو کشتی بھنور سے نکل آئے گی۔ یہ سنتے ہی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا اور یہ کہتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگا دی ''بھائیو! اس کشتی میں میں ہی سب سے زیادہ گناہ گار شخص ہوں۔ میں جاتا ہوں۔''

جن کے پاس واقعی علم ہے اُن کا رویہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو دُنیا کا سب سے گناہ گار شخص نہ صرف ظاہر کرتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو گردانتے بھی سب سے زیادہ گناہ گار ہیں۔

سوال: ایک خاتون کو مغربی معاشرہ میں کیسے باہر نکلنا چاہیے؟ کیا اُسے اپنا چہرہ بھی Cover کرنا چاہیے؟ اور کیا اُس کا ایک بال بھی نظر نہیں آنا چاہیے؟

جواب: قرآن پاک میں دو طرح کی سورتیں ہیں:

1۔ متشابہات

2۔ بینات

متشابہات تمثیلاً بیان کی گئی ہیں۔Symbolically یا Indirect پیغام Convey کر رہی ہیں جب کہ وہ سورتیں جو بہت واضح ہیں اور Definite پیغام Convey کر رہی ہیں وہ بینات کہلاتی ہیں۔ اسی طرح اسلام میں کچھ احکامات ایسے ہیں جو معین یا متعین حکم نہیں دیتے۔ جب کہ کچھ احکامات متعین ہیں۔

اسلامی شریعت کے چار ستون ہیں:۔

1۔ کتاب الٰہی یعنی قرآن مجید

2۔ حدیث

3۔ سنت

4۔ اجماع یا اجتہاد

اگر کسی معاملہ پر قرآن پاک میں احکامات نہیں ملتے تو ہم حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اگر وہ احکامات حدیث میں Available نہیں ہیں تو پھر ہم آپ ﷺ کی حیات طیبہ دیکھتے ہیں۔ اگر وہاں کوئی ایسا عمل موجود ہے تو اس کے مطابق عمل کر لیا جاتا ہے۔ اگر سنت میں بھی جواب نہیں ملتا تو پھر متقی اور پرہیزگار لوگوں کا ایک پینل بیٹھ کر اس مسئلہ پر غور کرے گا اور فتویٰ جاری کرے گا۔

نماز، رشوت اور سود کے بارے میں احکامات بہت Clear ہیں۔ اسی طرح پردے کے بارے میں احکامات بھی بہت واضح ہیں۔ اسلام نے عورت کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے Cover کرے کہ اُس کی جسمانی ساخت پر کسی کی نظر نہ جائے اور وہ دوسروں کو باعث کشش دکھائی نہ دے۔ یہ پردے کے احکامات کا خلاصہ ہے۔

چہرہ ڈھانپنے کا حکم ہے لیکن وہ تھوڑا Light way میں جاتا ہے۔ کچھ علماء کے مطابق کسی مقام پر جہاں چہرہ ڈھانپنا مشکل ہے وہاں اُسے کھلا رکھا جا سکتا ہے۔ جب کہ دوسرے مکتبہ فکر کے علماء کے مطابق چہرہ کھلا نہیں ہونا چاہیے۔

اس حد تک پردہ کہ ایک بال بھی نظر نہ آئے۔ اس بارے میں یہ کہوں گا کہ اسلام میں کہیں بھی ایسی سختی نہیں کہ جسے انسان سہہ نہ پائے۔ البتہ ہر خاتون کو کوشش کرنی چاہیے خود کو Cover کرنے کی۔ لیکن باوجود کوشش کے اگر کوئی بال نظر آ گیا تو پردہ کی کوشش اور نیت کے بعد اگر سہواً ایسا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔

سوال: رب تعالیٰ تک کیسے پہنچا جائے؟

جواب: اگر علمی انداز میں اسے دیکھیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ رب تعالیٰ تک رسائی کے تین طریقے ہیں:۔

1۔ Will (ارادہ یا نیت)

2۔ Knowledge (علم)

3- Love (محبت)

رب تعالیٰ تک پہنچنے کے یہ تین ذرائع ہیں۔ ان میں دو طریقے انسانی فطرت کے پیش نظر ذرا سے غیر یقینی ہو جاتے ہیں۔ ایک Will اور دوسرا Knowledge۔ ان دونوں میں سے بھی Will میں پچاس فی صد (50%) اور Knowledge میں نوے فی صد (90%) Chances ہیں انسان کے بھٹکنے کے۔ انسان کا ارادہ ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے اور خارجی اثرات اس پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔

اگر رب تعالیٰ تک پہنچنے کی خواہش تو ہے لیکن کبھی ارادہ نہیں کیا تو ہوتا یہ ہے کہ دوست کہیں کہ فلاں پکچر دیکھنے چلتے ہیں تو میں نماز چھوڑ دوں گا اور فلم دیکھنے چل پڑوں گا۔ کیوں کہ میں انسان ہوں اور میری فطرت میں ہے کہ میں بھٹک سکتا ہوں۔

اب ہوتا یہ ہے کہ جہاں میں نے یہ سوچا کہ پہلے تفریح کرلوں پھر عبادت کرلوں گا تو میں بھٹک گیا۔ دوست ملنے آئے تو سوچا کہ پہلے اُنھیں Attend کرلوں نماز بعد میں پڑھ لوں گا۔ دوستوں کے جانے کے بعد میں اتنا تھک جاؤں گا کہ یہ سوچوں گا کہ اچھا کل قضا پڑھ لوں گا۔ یوں میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہو گیا۔ پچاس فی صد لوگ اس لیے کہا کیوں کہ دُنیا میں ابھی بھی کچھ لوگ ارادے کے بہت پکے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ارادے پر قائم رہتے ہیں اور اس ارادے کے ذریعے آگے چلتے اور بڑھتے جائیں گے۔ لیکن اُن کے راستے میں بھی بہت سے سخت مقامات آئیں گے۔ سب سے مشکل مرحلہ یہ آئے گا کہ دُنیاوی محبت انھیں رب تعالیٰ تک پہنچنے کے ارادے سے روکے گی۔ جہاں دُنیا کی محبت نے انسان کو روکا وہیں اُس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عبادات سے رب نہیں ملتا۔ صرف پارسائی حاصل ہوتی ہے۔ انسان عبادت سے پارسائی تو حاصل کرلے گا لیکن رب تعالیٰ تک رسائی کے دوسرے لوازمات پورے نہیں کر پائے گا۔

رب تعالیٰ تک جانے کا دوسرا طریقہ اور زینہ Knowledge کا ہے جو بہت پُر خطر ہے۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ تحقیق کرنے والے سائنس دان جو شروع میں دہریے ہوتے ہیں۔ تحقیق میں آگے بڑھنے کے بعد جب اُن کے علم میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ شدت سے رب کے قائل ہو جاتے ہیں دیکھا گیا ہے کہ جب انسان کے پاس علم کم ہوتا ہے تو وہ بھٹک جاتا ہے اگرچہ وہ سمجھتا یہی ہے کہ میں سو فی صد درست ہوں۔ مثلاً میں کسی صاحب کے پاس بار بار جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اذان ہونے کے باوجود وہ نماز نہیں پڑھ رہا۔ اگر میرے پاس علم کم ہے تو میں فوراً فتویٰ جاری کردوں گا کہ یہ کیسا نیک شخص ہے جو نماز ہی نہیں پڑھتا۔ میں یہ بھول جاؤں گا کہ جب میری اُس سے ملاقات ختم ہوئی تو ظہر کا وقت ابھی باقی تھا۔ ہوسکتا ہے میرے اُٹھ آنے کے بعد اُس نے نماز ادا کرلی ہو۔ یا پھر قضا نماز پڑھ لی ہو۔ میں یہ تمام باتیں سوچنے اور سمجھنے کی بجائے کم علمی کے باعث فتویٰ جاری کردوں گا۔ یہ اور بات ہے کہ جب کوئی صاحب علم مجھے Correct کرے کہ تم بدگمانی میں مبتلا کیوں ہوتے ہو۔ ہوسکتا ہے اُس نے بعد میں نماز ادا کرلی ہو۔

اسی طرح ہم فروعی باتوں میں بعض اوقات اس قدر اُلجھ جاتے ہیں کہ یہاں تک کہنے لگتے ہیں کہ

فلاں شخص تو مسلمان ہی نہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں وہ واقعہ جسے حضرت اُسامہ بن زیدؓ یوں بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں "حرقہ" (قبیلے) کی طرف بھیجا۔ ہم نے اُن پر حملہ کر کے انھیں ہزیمت سے دوچار کر دیا۔ میں اور ایک انصاری، اُن کے ایک فرد کے مقابلے میں آئے۔ جب ہم نے اُس پر قابو پا لیا تو اُس نے لاالہ الا اللہ پڑھ لیا۔ تو انصاری شخص رُک گیا۔ لیکن میں نے اُسے تیر مار کر قتل کر دیا۔ جب ہم واپس آئے اور نبی اکرم ﷺ کو اس بات کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے دریافت کیا "اے اُسامہ تم نے اُسے اُس کے لاالہ الا اللہ پڑھ لینے کے بعد بھی قتل کر دیا۔" میں نے عرض کی" اس نے جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا۔" آپ ﷺ نے اپنے جملے کو مسلسل دہرایا۔ یہاں تک کہ میں نے آرزو کی کاش میں اس دن سے پہلے مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی باب بعث النبی ﷺ اُسامۃ الحرقات، حدیث نمبر 4021)

اس حدیث مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص بظاہر جان بچانے کے لیے بھی مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہے تو اس کی زبان کا یقین کرنا ضروری ہے کیوں کہ دلوں کا حال صرف اللہ بہتر جانتا ہے۔ حکم ہمیں یہاں تک ہے۔ لیکن ہم اپنی کم علمی کی وجہ سے فوری طور پر یہ فتویٰ دینے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ وہ شخص تو مسلمان ہی نہیں۔ لہٰذا اگر ہم Knowledge کی بنیاد پر رب تعالیٰ تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں تو اس میں اُلجھ جائیں گے۔ اپنی محدود عقل کے باعث ہم رب تعالیٰ تک پہنچ نہیں پائیں گے اور پاؤں لڑکھڑا جائیں گے۔

تیسرا راستہ ہے "محبت کا راستہ"۔ یہ بہت Safe ہے کیوں کہ اس میں ہماری Effort نہیں بلکہ انسانی فطرت کام کرتی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان جس سے پیار کرتا ہے اُس کی ہر بات پر بغیر ہچکچائے بخوشی عمل کرتا ہے خواہ اس میں اُسے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔ اس رشتے میں یہ خوف بھی ہوتا ہے کہ جس سے میں پیار کرتا ہوں وہ کہیں مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ محبوب کی ناراضگی کا خوف سزا سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ جب ہم رب تعالیٰ سے سچے دل سے پیار کرتے ہیں تو اُس کی کہی ہوئی ایک ایک بات پر عمل کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کہیں کوئی چھوٹی سی بھی بات ہم سے نظر انداز نہ ہو جائے اور کہیں محبوب ہم سے رُوٹھ نہ جائے۔

محبت کے اس راستے میں کوئی Effort نہیں۔ اس میں خواہش اور چاہت ہے۔ خواہش یہ کہ میں اپنے محبوب کو راضی کر لوں اور اس راضی کرنے کے پیچھے چاہت ہے اور وہ چاہت یہ کہ مجھے اُس سے پیار ہے۔ یوں انسان اس پیار میں رب تعالیٰ کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے اندر یہ خواہش شدت سے پیدا ہو جاتی ہے کہ میں اپنے محبوب کو دیکھ لوں کہ وہ ہے کیسا۔ یہ خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ یہ سن کر یا گمان کر کے کہ اُس کی موت کا وقت آن پہنچا ہے وہ رنجیدہ ہونے کی بجائے خوش ہوتا ہے۔ یہ خوشی موت کی نہیں ہوتی بلکہ اپنے دوست اور محبوب سے ملاقات کی ہوتی ہیں۔ اس لیے جتنے بھی اولیائے کرام ہیں اُن کو موت کا خوف بھی نہیں رہا۔ اُن سب کے لیے سب سے آسان ترین کام یہ تھا کہ وہ اس دُنیا سے چلے جائیں تا کہ ان کی ملاقات

اُن کے رب سے ہو سکے۔

اگر انسان اپنی زندگی جیسی عزیز چیز اللہ تعالیٰ کی محبت میں قربان کرنے پر تیار رہتا ہے تو اللہ کے احکامات کو ماننا تو کوئی بڑی یا دشوار بات نہیں۔ وہ دل و جان سے اپنے محبوب کے احکامات کی پیروی کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص سیاہ دل، شقی القلب اور گناہ گار ہے تو اُس کے دل میں رب کی محبت کیسے پیدا ہو۔

اس کا ایک آزمودہ نسخہ موجود ہے۔ جس طرح انگریز یہ کہتا ہے کہ بستر پر سونے کے لیے لیٹیں تو اپنے دن بھر کا محاسبہ کرلیں کہ آج کتنا Productive کام کیا اور کیا غلطی کی۔ یہ محاسبہ انسان کی اصلاح میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔

بعینہٖ انسان یہ سوچے کہ میں زندگی میں کتنی بار مایوس ہوا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ میرا یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اللہ نے مجھے مایوسی سے بچالیا اور اس انداز میں میری غیبی مدد کی کہ جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ جب میں رزق کی کمی کی وجہ سے نا اُمید تھا تو نادیدہ ذرائع سے اُس نے مجھے رزق عطا فرما دیا۔ یہ میرا رب ہی تو تھا جس نے مجھے فاقوں سے بچالیا۔ میں نے کب کب یہ سمجھا تھا کہ میں اس مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور اس سے نکل نہ پاؤں گا۔ تو عین پریشانی کے عالم میں غیب سے مدد آئی اور رب تعالیٰ نے مجھے اُس مصیبت سے نجات دے دی۔

یوں جب ہم رب تعالیٰ کو یاد کرنا شروع کریں گے تو اُس کے احسانات یاد آئیں گے۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جائے گا۔ پھر یہاں تک ہوگا کہ ہمیں رب تعالیٰ کا یہ احساس بھی یاد آنے لگے گا کہ اُس نے ہمیں یہ اجازت دی ہے کہ اُس کی ہوا میں سانس لے سکیں۔ اُس کی پیدا کی ہوئی آکسیجن بغیر کسی معاوضے کے Inhale کر کے خود کو زندہ رکھ سکیں۔ جب یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ رب تعالیٰ کیسے ہماری چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی Care کرتا ہے تو ہمیں رب تعالیٰ سے پیار ہونے لگتا ہے۔

یہ پیار ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا۔ پیار کی ابتدا دو طرح سے ہوا کرتی ہے۔ احسان مندی سے یا Liking سے۔

اللہ کی نعمتوں کو یاد کر کے اور اُن کا ادراک کرنے کے بعد ہمارے اندر رب تعالیٰ کے لیے احسان مندی کا احساس پیدا ہو گیا۔ احسان مندی کے اس احساس کے ساتھ ہی اللہ کے لیے ہمارے اندر Liking پیدا ہو گئی۔

اگر ہم اپنی زندگی اور رب تعالیٰ کے احسانات پر گہری نظر رکھیں تو پسندیدگی (Liking) رفتہ رفتہ Infatuation (لگاؤ) میں بدل جاتی ہے۔ یہ Infatuation بعد میں محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ محبت بعد ازاں پیار میں Convert ہو جاتی ہے۔ پیار انسان کو عشق کے مقام تک لے جاتا ہے اور عشق وہ مقام ہے جہاں انسان دوئی سے نکل کر یک جائی کے مقام تک چلا جاتا ہے۔ وہی مقام جہاں کسی فقیر نے کہا تھا "تو کون اور میں کون، دونوں ایک ہی تو ہیں"۔ یہ وہ مقام ہے جسے یوں بیان فرمایا گیا کہ جب کوئی میرا ہو جاتا ہے تو میں

اُس کا ہو جاتا ہوں۔ اُس کے ہاتھ، پاؤں اور کان بن جاتا ہوں۔

حدیث قدسی ہے:۔

''میرا بندہ جن چیزوں کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے اُن میں سب سے زیادہ میرے نزدیک محبوب وہ چیز ہے جو میں نے اُس شخص پر فرض کی ہے۔ اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اُس سے خاص محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اُسے محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اُس کی سماعت ہو جاتا ہے جس کے ذریعے وہ سنتا ہے۔ اُس کی بصارت ہو جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ دیکھتا ہے۔ اُس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ کوئی چیز پکڑتا ہے۔ اُس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اُس کو ضرور عطا کرتا ہوں اور اگر وہ کسی چیز سے میری پناہ مانگے تو میں اُس کو اُس چیز سے پناہ دیتا ہوں۔'' صحیح بخاری، حدیث نمبر 6137، کتاب الرقاق کا بیان، باب التواضع۔ مسند احمد، حدیث نمبر 2636، کتاب باقی مسند انصار، (باب سیدہ عائشہ کی احادیث)

اسی مقام پر انسان کو مومن جیسی فراست عطا ہوتی ہے وہ فراست جس سے آپ ﷺ نے ڈرایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیوں کہ وہ اللہ کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے۔

اتقو افراسة المومن فانه ینظر بنور الله (جامع ترمذی۔ حدیث نمبر 3052، ابواب التفسیر باب ومن سورة الحجر)

رب تعالیٰ تک رسائی کا سب سے Safe اور آسان طریقہ اُس سے پیار پالنا ہے۔

اولیائے کرام کی ایک بہت بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے جنھیں رب تعالیٰ نے ابتدا میں عشق مجازی میں مبتلا کیا وہاں اُنھیں ناکام و دل گرفتہ کیا۔ پھر دل گرفتگی کے اس عالم میں اُنھیں ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کر لیا۔ عشق مجازی سے حقیقی کی طرف لے آیا۔ عشق مجازی میں ناکامی کی چوٹ اتنی سخت ہوتی ہے کہ جب انسان یہ چوٹ کھاتا ہے تو اُسے سوائے رب تعالیٰ کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یوں وہ رب کے قریب ہو جاتا ہے۔ تب سالوں کی مسافتیں دنوں میں طے ہوتی ہیں اس لیے کہ وہ دل گرفتہ ہے۔ اُس کا دل تو پہلے ہی غم سے پھٹا ہے۔ وہاں دُکھوں کے ذریعے ہل چلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہاں Straightway علم کا بیج بویا جاتا ہے جو تھوڑے ہی عرصے میں لہلہاتی فصل کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور انسان رب تعالیٰ کے قریب جا پہنچتا ہے۔

حوالہ جات

1- ''میرا بندہ مجھ سے جیسا گمان رکھتا ہے میں اُسی طرح اس کے ساتھ پیش آتا ہوں۔'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر 7066)

2- سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی ''اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ، مسکینی کی حالت میں وفات دے اور قیامت کے دن مسکینوں کی جماعت میں اُٹھا۔'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی ''یہ دُعا کیوں؟'' فرمایا ''بے شک وہ اغنیاء سے چالیس سال قبل جنت میں داخل ہوں گے۔'' (جامع ترمذی، حدیث نمبر 2352)

3- ''مجھے انسان ایذا دیتا ہے کہ زمانہ کو گالیاں دیتا ہے حالانکہ زمانہ (بدلنے والا) تو میں ہوں۔'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر 4539)

CD کیسے سنیں

نشست نمبر		لیکچر نمبر
1	رب پر مان	65 (18.05.08)
2	فقیرانہ طریقہ تبلیغ	66 (25.05.08)
3	رحم ہی کیوں	67 (17.08.08)
4	حروف مقطعات کے اسرار اور قلندرانہ طرز حیات	110 (13.12.09)
5	جس کا رب	122 (09.05.10)
6	مجاہدہ کی اہمیت	123 (16.05.10)
7	عبادت میں ذوق وشوق کے ثمرات	124 (23.05.10)
8	اخلاص، جنوں، ادب	125 (30.05.10)
9	دعا کس طرح مانگی جائے!	127 (06.06.10)
10	پیر مرید اور قلب کا رشتہ	128 (13.06.10)
11	علم سے عقل تک	129 (20.06.10)
12	قرب الٰہی	130 (27.06.10)
13	تقدیر اور تدبیر	131 (14.07.10)
14	بعد از خدا بزرگ توئی	132 (11.07.10)
15	منزلیں علم باطنی کی	133 (18.07.10)
16	نور محبت توجہ	134 (25.07.10)
17	رب سے وابستگی	135 (01.08.10)

تعارف

جناب سرفراز اے شاہ صاحب 12 جون 1944ء کو جالندھر کے ایک نجیب الطرفین سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیشنل ہیں اور مختلف سرکاری اداروں میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ آپ نے کچھ عرصہ برمنگھم یونیورسٹی میں Management کے موضوع پر بطور Visiting Faculty لیکچرز بھی دیے۔ آپ مینجمنٹ اور ایڈمنسٹریشن میں وسیع تجربہ رکھتے ہیں اور ان دنوں پاکستان کے ایک معروف صنعتی وتجارتی گروپ کے لیے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے سلسلے میں 65 سے زائد ممالک کا دورہ کرچکے ہیں اس کے علاوہ قدیم اور جدید علوم پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔

دُنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ مصنف کی اسلامی و روحانی تعلیمات سے دیرینہ دلچسپی ہے۔ پروفیشنل ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ آپ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان کی محبت سے لاکھوں لوگ مستفیض ہو چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو توکل، اطمینان اور یقین کی دولت سے بے حساب نوازا ہے جسے آپ اپنے دوستوں میں کھلے دل سے بانٹتے رہتے ہیں۔ اُس ذاتِ اقدس کے بارے میں بات کرتے ہوئے آپ کے لہجے میں ایسی محبت، جذبہ اور ایمان ہوتا ہے جو سامعین کے دلوں میں رب تعالیٰ کی محبت، قرب اور دوستی کے حصول کی تڑپ پیدا کردیتا ہے۔ خوش کلام اتنے کہ دھیمے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جب گفتگو کرتے ہیں تو گویا وقت کی گردش تھم جاتی ہے۔

Published by:
Jahangir Books
Buy online: www.jbdpress.com, www.jworldtimes.com